محدّب شیشہ
اقرا
مسعود مفتی

اقراء

مسعود مفتی

طبعِ دوم ۔۔۔ دسمبر ۱۹۷۹ء
تعداد ۔۔۔ ایک ہزار

ناشر ۔۔۔ اقرأ
خوش نویس ۔۔۔ محمد ریاض خاں
سرورق ۔۔۔ سعید مفتی
طباعت ۔۔۔ نقوش پریس، لاہور
ملنے کا پتہ : ۔۔۔ اقرأ
پوسٹ بکس ۱۲۹۳، اسلام آباد
قیمت ۔۔۔ ۱۵ روپے

والدۂ محترمہ کے نام

فہرست

سرِ آغاز

لیجیے مسعود مفتی اپنا محدّب شیشہ لیے حاضر ہیں۔ محدّب شیشے کی خاصیت ہے کہ اس کی امداد سے چھوٹی چیزیں بڑی اور دُور کی چیزیں نزدیک دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اور اُن کی جزئیات اور ان کے خد و خال واضح اور روشن تر نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ بھی ہے کہ اگر کسی منبعِ نور و حرارت سے نکلی ہوئی شعاعیں، ایسے شیشے میں سے گزر کر نقطۂ ماسکہ پر مرکوز ہو جائیں، تو اُن میں جلا دینے کی استعداد بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مسعود مفتی کا ادبی محدّب شیشہ اِن صفات سے عاری نہیں معلوم ہوتا۔

اِس مجموعہ کی کہانیاں زندگی کی بکھری ہوئی تصویریں ہیں اور مصنّف کے گہرے مشاہدہ اور اُن کے فنّی خلوص پر دال ہیں۔ نقیض فن طربیہ انجام کی سعی ان میں نہیں ملے گی۔ ان میں جنسی لذتیت یا ذہنی عیّاشی کا بھی کہیں شائبہ تک نہیں۔ مصنّف ہمیں کسی رُومانی جنّت کی سیر نہیں کراتے۔ وہ کبھی تو معاشرہ کے رِستے ہوئے ناسوروں کو چھیڑتے ہیں اور کبھی خالصتاً زندگی کے المیہ پہلوؤں کی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔ علّامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی

اِس مقولہ میں صداقت ہے۔ لیکن مصنّف نے مناظرِ حیات سے صرف اُن واقعات و کیفیّات کو چُن لیا ہے جو اُن کے مرکزی خیال کو اُجاگر کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ہر فنّی تخلیق ایک تجریدی عمل ہے۔ فن محض زندگی کی ہُو بہو عکّاسی نہیں۔ فن کار کی نگاہ، حقیقت کے اُن عناصر کو اِنتخاب کر لیتی ہے جو اُس کے قلب کے مجموعی تاثر کی ترجمانی کر سکیں۔ فطرت کے مُرقّع کے بعض رنگوں کو وُہ زیادہ شوخ کر کے دکھاتا ہے تاکہ وُہ ناظر کے لیے جاذبِ توجّہ ہو سکیں۔ ہر فن پارہ زندگی کا ایک تماشہ ہوتا ہے۔ تاہم اُس کا رشتہ زندگی کے حقائق سے کبھی نہیں ٹوٹتا، کیونکہ اس کی تاثیری اہلیّت اِسی رشتے پر مبنی ہوتی ہے۔ اس معیار سے جانچا جائے تو یہ افسانے ہر حیثیت سے فن پارے ہیں۔

مسعود مُفتی کہانی لِکھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ مُختصر افسانہ تاثیر کی ایک اکائی سے عبارت ہے۔ اِن افسانوں میں مصنّف آغاز سے لے کر انجام تک ایک ایسے تاثر کی فضا قائم کرتے ہیں، جو قاری کی دِلچسپی کو برابر برقرار رکھتی ہے۔ نُقطۂ عروج پر پہنچنے کے بعد کہانی کے آخری الفاظ سے قاری کے ذہن کو ایک دھچکا سا لگتا ہے اور اُس لمحے گویا اُس کے قلب کی آنکھ روشن ہو جاتی ہے اور افسانہ کی تمام کڑیاں انجام سے مربُوط ہو جاتی ہیں۔ اندازِ تحریر شگفتہ اور رواں ہے۔ مُصنّف کا قلم چلتے چلتے کبھی ایک جملۂ مُعترضہ کی وساطت سے قاری کے چُٹکی لیتا ہے یا گدُگدی کرتا ہے اور کبھی بھرپُور طنز کے چھینٹے اُڑاتا ہے۔ یہ طنز کہیں بغض، کینہ، ریاکاری یا مکر وزن دیر کا پول کھولتی ہے۔ کہیں انفرادی اور سماجی نفسیات کی کشمکش کو جلا دیتی ہے۔ کہیں کسی سادہ لوح کے حقیقت فراموش جھُوٹے وقار کی ہنسی اُڑاتی ہے، کہیں دِلوں کے چور ڈھونڈ نکالتی ہے۔ لیکن اکثر خُود زندگی کی ستم ظریفیوں اور تلخیوں کو ہدفِ تنقید بناتی ہے۔ اِن کہانیوں میں زندگی کا شعُور رچا ہُوا ہے۔ بعض ترقی پسندوں کے شعار کے برعکس ان میں مروّجہ اخلاقی اقدار کے خلاف محض باغیانہ سرکشی کے مظہر، چونکا دینے والے فقروں کا حربہ اِستعمال نہیں کیا گیا۔ یہاں جذبے کے اظہار میں توازن ہے۔ مشاہدہ، احساس

اور فکر کی ہم آہنگی نے اِن افسانوں کو اِنفرادیت بخشی ہے۔ مسعود مفتی اپنے مزاحیہ اِنشائیوں کے ذریعے سے ادبی دُنیا میں معروف ہو چکے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ سنجیدہ افسانے انھیں حقیقت نگار ادیبوں کی صف میں ایک ممتاز مقام دلانے میں کامیاب ہوں گے۔

۶۵ گلبرگ
لاہور

ایس۔ اے۔ رحمٰن
مرکزی مجلس ترقی اُردو

پیش لفظ

کچھ لوگ خوش قسمت پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ اپنی ہمت اور عزم سے قسمت کا رُخ اپنے حق میں موڑ لیتے ہیں۔ مگر اِن کی تعداد بہت کم ہے۔

انسانیت کا زیادہ حِصّہ وُہ لوگ ہیں۔ جو زندگی کے طُوفان میں ڈُبکیاں کھاتے رہتے ہیں۔ کبھی آرام سے سطح پر تیر لیے۔ کبھی بھنور میں چکرانے لگے۔ اور کبھی گہرے غوطوں میں دھنس گئے ——— نہ زندگی انھیں پیار کرتی ہے۔ نہ ان کو زندگی سے پیار ہوتا ہے ——— دونوں ایک دُوسرے کو برداشت کرتے ہیں۔ ایسے دُشمنوں کی طرح جو دوستی کا معاہدہ کرنے پر مجبُور ہوں ——— یہ لوگ زندگی کا مقابلہ ضرُور کرتے ہیں۔ مگر اس پر فتح نہیں پا سکتے۔ کیونکہ اپنی ذات کو منوانے کی اِن کے بال و پر میں ہمت نہیں ہوتی۔ ہر زمانے میں دُنیا کی ہر سوسائٹی کے ہر طبقے کا زیادہ حِصّہ انہی لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

کہتے ہیں اِنسان کو خُدا نے اپنے عکس میں بنایا ہے لیکن اگر انسان یہی ہے۔

جسے کچھ صلاحیتیں بخش کر دُنیا میں ایک ہی دفعہ بھیجا جاتا ہے۔ اور وُہ آزادانہ رہ کر
اپنی ہستی کی تکمیل کرنے کی بجائے زندگی کے مضبوط جبڑوں میں تڑپ تڑپ کر
دم توڑ دیتا ہے۔ تو یہ خدا کا عکس نہیں بلکہ المیہ ہے بقولِ شاعر ؎

نہ خود ہیں، نے خدا ہیں، نے جہاں ہیں
یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا؟

یہ کہانیاں ایسے ہی لوگوں کی ہیں ۔!

مسعود مفتی

لاہور۔ ۱۷ فروری ۱۹۶۴ء

محدّب شیشہ

زکوٰۃ کا مہینہ تھا قصبے کی مسجد میں مولوی صاحب جُمعہ کا وعظ کر رہے تھے۔
"یتیم، مسکین اور بیوائیں عرش کا سہارا ہیں۔ اُن کے آنسو پُونچھو۔ اُن کے سر پر ہاتھ دھرو۔ اپنی کمائی میں سے اُن کو حِصّہ دو۔۔۔۔۔۔"

سامنے نمازیوں کی قطاریں خاموشی میں غرق تھیں۔ کچھ دیوار یا کھمبے کے سہارے اُونگھتے ہُوئے، کچھ پنکھے کی ڈنڈی یا کھڑے گھٹنے پر نیند بھرا سر ٹکاتے ہُوئے۔ کچھ کھُلی آنکھوں سے سوتے ہُوئے۔ حافظ عُمر دراز کی آنکھیں بند تھیں۔ دماغ سویا ہُوا تھا۔ ہونٹ باہم چپکے ہُوئے تھے۔ لیکن ہاتھ جاگ رہے تھے۔ جو بڑی تیزی سے تسبیح کے دانے پھیر رہے تھے۔ مکمّل جاگنے والوں میں بشیر سبزی فروش کے دماغ میں منڈی کے بھاؤ کھُدبُد مچا رہے تھے۔ ڈاک خانے کے بابُو کے ذہن میں تنخواہ اور

اخراجات باہم کشتی لڑ رہے تھے۔ اور لاریوں کے اڈے والے منشی کے دماغ میں صبح آٹھ بجے کی لاری میں گزرنے والی عورت کا خوبصورت چہرہ گھوم رہا تھا۔ مگر ماسٹر برکت علی گردن اٹھائے وعظ کا ایک ایک حرف غور سے سن رہا تھا۔ اور جب مولوی صاحب نے منبر سے کچھ آگے جھک کر کہا۔

"بیوہ کی ایک آہ سات آسمانوں میں سوراخ کر دیتی ہے۔ ایسی بیوہ کی ایک دفعہ مدد کرنے والے کو ستر ہزار نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ اور وہ سیدھا جنت میں جاتا ہے۔" تو ماسٹر برکت علی کا سارا جسم ایک دم کانپ اٹھا اور پگڑی سر پر جماتے ہوئے وہ بلند آواز میں پکارا "بخشنا مجھے میرے مولا۔"

ماسٹر برکت علی قصبے کے اُن چند لوگوں میں سے تھا۔ جو خواہش سے نہیں بلکہ محض اتفاق سے میٹرک پاس کر لیتے ہیں۔ اِس قصبے میں سرکاری تعلیمی سرگرمیاں چار جماعتوں کے بعد ختم ہو جاتی تھیں۔ اور چیچک زدہ چہرے کی طرح اُپلے تھپا پرائمری سکول اپنی بوسیدہ چھتوں کے نیچے سے دن بھر پہاڑوں کے الاپ براڈکاسٹ کیا کرتا۔ اس سکول میں چند سال زبردستی گزارنے کے بعد گاؤں کے بچے یا تو ڈھیلی دھوتیاں اور گومڑسی پگڑیاں باندھ کر لٹھ لیے مویشی ہنکارتے رہتے۔ یا گھر کے دروازے کی چوکھٹ پر تھالی میں چھوٹی سی دوکان سجا کر قسمت آزمائی کرنے کے بعد کھیتوں میں دھکیل دیے جاتے اور یا کوئی بھولا بھٹکا انگریزی کا قاعدہ اُٹھا کر فالتو وقت میں ماسٹر برکت علی کے پاس آن بیٹھا۔ پہلے قاعدے کے کونے مڑتے۔ پھر اُوپر والا صفحہ رنگ بدلتے بدلتے حروف چھپا لیتا۔ اور جب ایک روز وہ غائب ہو جاتا تو اگلا صفحہ ارتقائی منازل طے کرنے لگتا۔ جس دن سارا قاعدہ غائب ہو جاتا تو طالب علم کو اگلی جماعت میں چڑھا دیا جاتا تھا۔ جہاں پھر ایک موٹا قاعدہ خریدا جاتا۔ چار پانچ قاعدوں پر طبع آزمائی کرنے کے بعد طالب علم چونگی کا محرر۔ یا ڈپو کا ملازم۔ یا عرضی نویس بننے کے قابل ہو جاتا۔ ماسٹر برکت علی کے مکان کے باہر والے کمرے کے

دروازے پر پہلے چاک سے اور پھر کوئلے سے "انگریزی کالج" لکھا ہوا تھا۔ حالانکہ یہاں الف اے، بی۔ ٹی بھی اتنی ہی شدّت سے پڑھایا جاتا تھا۔ جتنا سی اے ٹی۔ کیٹ۔ درجن بھر کے قریب طالبِ علم یہاں ہمیشہ رہتے تھے۔ اور جب چھٹیوں میں شہر جاکر پڑھنے والے طالب علم گاؤں آتے تو والدین اُن کو بھی عارضی طور پر ماسٹر برکت علی کا شاگرد بنا دیتے تھے۔ تاکہ اُن کی کمزور انگلش درست ہو سکے۔ فیس اور شاگردانہ خدمات سے اُس کا گُزارہ اچھا چل جاتا تھا۔

ماسٹر برکت علی چھریرے جسم کا لمبا آدمی تھا۔ عمر چھتیس ۳۶ سال۔ لمبوترا اسا دُبلا چہرہ جس کے رُخساروں کی جگہ دو نمایاں گڑھے قبل از وقت آنے والی جھریوں کو ہضم کر رہے تھے۔ اُونچی شفاف پیشانی کے نیچے دو ذہین آنکھیں شفقت بھری مُسکراہٹ سے لبریز رہتی تھی۔ آنکھوں کے باہر کونوں میں سُورج کی شعاعوں کی مانند باریک سلوٹیں تھیں۔ جو ہنستے وقت بڑی نمایاں ہو جاتی تھیں۔ سیدھی ستواں ناک، پتلے ہونٹ۔ اور بشاش چہرہ، سر پہ خاکی کلاہ کے گرد سفید ململ کی پگڑی۔ جس کا شملہ کلف کی مقدار کے مطابق رکوع و سجود کرتا رہتا۔ دھاری دار قمیص اور ڈھیلی سی شلوار کے نیچے دھول سے اَٹے ہُوئے بُوٹ۔ جن کے کھُلے ہُوئے جبڑوں کو تہوار کے موقع پہ تسمے سمیٹ لیتے۔ جو چند دنوں کے بعد اپنی موت آپ مر جاتے۔ اور پھر برساتی مینڈکوں کی طرح اگلے تہوار کو دوبارہ جنم لے لیتے۔

ماسٹر برکت علی لائق تو اتنا ہی تھا۔ جتنا الماری میں گردجمی کتابوں کے ڈھیر والا آدمی ہو سکتا ہے لیکن اُس کی شرافت اور نیکی کا قصبہ بھر مدّاح تھا۔ وُہ زندگی کی سیدھی سڑک پر چلتا آیا تھا۔ جس میں نہ کبھی موڑ آیا تھا۔ نہ کھڈ۔ جس کے قریب نہ کبھی رُومان کے چشمے پھُوٹے، نہ جذبات کی دُھوپ چھاؤں نے آنکھ مچولی کھیلی۔ نہ کبھی حالات کی کنکریاں چُبھیں۔ نہ قسمت نے روڑے اٹکائے۔ ایک دفعہ شادی ہُوئی تھی۔ تو سات سال تک جیسے سفر بھُول سا گیا تھا۔ بیوی بے اولاد مر گئی۔ تو چند روز کا ستانا سمجھ کر پھر

سے زندگی کی ڈگر پر چل پڑا تھا۔ جب سے اُس نے قصص الانبیاء میں پڑھا تھا کہ قیامت کے روز بخشش کا سب سے آسان طریقہ خُدا کے بندوں کی خدمت کرنا ہے۔ اُس روز سے اُس نے عہد کر لیا تھا کہ اپنی زندگی سکول کے لیے خصوصاً اور خدمت خلق کے لیے عموماً وقف کر دے گا۔ تاکہ لوگوں کو سدھار سکے۔ اسی لیے بیوی کی وفات کے سات سال بعد بھی اپنے آپ کو دوبارہ شادی پر آمادہ نہ کر سکا تھا۔ کیونکہ بیوی اُس کے اس عہد میں حائل ہوتی۔ اس کے بعد تو وُہ گھڑی کا پُرزہ بن گیا تھا۔ زندگی ایک معمول کے مُطابق گُزر رہی تھی۔ جیسے گاڑی اپنی پٹڑی سے بال برابر بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹتی۔ روزانہ صُبح نمازی مسجد میں جاتے تو وُہ پہلی صف میں منبر کے قریب بیٹھا گنگناتے ہُوئے درُود شریف پڑھ رہا ہوتا۔ کوشش سے مولوی صاحب کے پیچھے نماز میں جگہ لیتا۔ تاکہ تکبیر پڑھنے کا موقعہ مِل سکے۔ دُعا میں سب سے بلند آواز میں "آمین" پکارتا۔ نمازی چلے جاتے تو وُہ ایک سو مرتبہ آیت کریمہ کا وِرد کرتا۔ محراب کی خاک ماتھے پر لگاتا۔ اور باہر نکلنے کے لیے جُوتا جھاڑتے ہُوئے پُکار اُٹھتا "بخشنا مجھے میرے مولا"۔ بعد ازاں اِدھر اُدھر تھوکتا ہُوا دُرود تاج پڑھتے ہُوئے گھر لوٹتا۔ اور کھڑکی میں بیٹھ کر کشمیری لکڑی کے رحل اور ساٹن کے نیلے جُزدان کو چُوم کر ماتھے پر لگاتا۔ اور کلام پاک کھول کر سُورۃ یٰسین اور ایک رکُوع کی قراءت نہایت اِنہماک سے کرتا۔ اس کے بعد کیکر کی تازہ مِسواک لے کر دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھ جاتا۔ اور آخ تھو کا شور کرتے ہُوئے ہر آنے جانے والے کو جُھکی نظروں سے یا آنکھوں کے کونوں سے جھانکا کرتا۔

"کِدھر چلی ہو ماسی سویرے سویرے۔" وُہ ہر گُزرنے والی بُوڑھی سے سوال کرتا۔ بوڑھیاں بھرے سرسوں کے کھیت کی مانند کِھل اُٹھتیں۔ دُعاؤں کی قطار بکھیر دیتیں۔ اور فوری مقصد کے ساتھ ساتھ اس کے متعلقہ سب حالات کا کچا چٹھا بیان کرتے کرتے گلی کا موڑ مڑ جاتیں۔

کوئی جوان لڑکا اِدھر سے آنکھیں ملتا گزرتا تو ماسٹر برکت علی پیار سے فہمائش

کرتا "میاں اور نہیں تو کم از کم صبح نماز ہی پڑھ لیا کرو۔ دن تو نیکی سے شروع ہو۔" اور لڑکے عجیب عجیب بہانے تراشتے گلیوں کی بغلوں میں گھسنے کی کوشش کرتے غائب ہو جاتے۔

مسواک کرتے کرتے سورج کی سنہری دھوپ روشن دان تک اتر آتی۔ تو وہ تولیہ سر پر ڈال کر پیپل کے پتے میں صابن کی ٹکیہ اٹھائے کنوئیں کی طرف چلتا۔ راستے میں لوگ اسے نہایت تپاک سے ملتے۔ بعض تعظیماً کھڑے ہو جاتے۔ کنوئیں پر عورتیں احترام سے صرف چند لمحوں کے لیے دوپٹے چہرے پر کھینچ لیتیں۔ اور ماسٹر برکت علی منڈیر پر بیٹھ کر سب کا خیر صلا پوچھتا۔ بغیر تسموں کے بوٹ اتار کر شلوار گھٹنوں تک اٹھا لیتا اور خدمتِ خلق کے جذبے سے مجبور ہو کر کنوئیں کی چرخی پکڑ کر گھڑے بھرنے لگتا۔ گاؤں کی عورتوں کو ماسٹر کی شرافت پر پورا بھروسہ تھا۔ اسی لیے وہ بغیر کسی تکلف کے پانی بھروا لیتیں۔ وہ ڈول انڈیلتے وقت سوال جواب بھی کرتا جاتا۔

"کیوں جیناں۔ اب تو تمھارا گھر والا اس کلموہی کے گھر نہیں جاتا" میں نے سمجھایا تو بہت تھا۔"

"نہیں بھائی اللہ تیرا بھلا کرے۔ میرا تو تو نے گھر بچا لیا۔" جیناں گھڑا جماتے مجسّم انکسار بن جاتی۔

"اب خرچہ نہ دے تو مجھے بتانا۔ لے اٹھا اپنا گھڑا۔" اور وہ ڈول کا باقی پانی اپنے پاؤں جوڑ کر ان پر ڈال دیتا۔

"ماسی! شیر دے نے شہر سے کوئی خط لکھا یا نہیں" وہ ایک پاؤں سے دوسرے کی میل رگڑتا ہوا پوچھتا۔ اور ماسی گھڑا جھولتا چھوڑ کر ہاتھ ملنے لگتی۔

"نہ بچّہ کوئی نہیں۔"

"فکر نہ کر۔ میں اگلے مہینے شہر جاؤں گا۔ تو اچھی طرح خبر لوں گا اس کی۔"

"اے بھلا ہو تیرا میرے لال۔ ضرور جانا۔ اور اس سے کہنا . . . . ." اور گھڑا

بھر جاتا لیکن ماسی کے پیغامات جاری رہتے۔ حتیٰ کہ شادو اس کا گھڑا ہٹا کر اپنی گاگر جما دیتی۔ ماسٹر برکت علی خاموشی سے پانی بھر دیتا۔ وہ جوان لڑکیوں سے زیادہ بات چیت کا قائل نہ تھا۔ لیکن جب گاگر اٹھا کر اس کے سر پر رکھتا تو اجنبیت مٹانے کے لیے ایک آدھ بات کر لیتا۔

"شادو بہن اب تو شرفو کانا سیٹیاں نہیں بجاتا؟"

اور شادو گاگر کے گلے میں ہاتھ ڈالتی سوئی پلو منہ پر رکھ لیتی۔ "نہیں ویر جی تم نے تو اُسے بالکل سیدھا کر دیا ہے۔"

اور ماسٹر برکت علی اُن لوگوں کو بے نقط سنا ڈالتا جو گاؤں کی عورتوں کو ماں بہن نہیں سمجھتے۔ اور پھر آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر پکار اُٹھتا۔ "بخشنا مجھے میرے مولا۔ سب کی حیا قائم رکھ۔" عورتیں پانی لے جاتیں تو وہ لنگوٹ پہن کر نہانے لگتا۔ اور صابن ملتے ملتے گنگناتا "میرے مولا بلا لو مدینے مجھے۔" آٹے کی چکی پر بیٹھ کر سارا دن گپ لگانے والے چند مفت خورے بھی عین اُسی وقت نہانے آن ٹپکتے تاکہ ماسٹر برکت علی کے صابن اور تیل سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ نہانے کے بعد ماسٹر برکت علی گڑھے کو صاف کر کے پانی سے بھر دیتا ہے۔ تاکہ پرندے پانی پی سکیں اور خود واپس چلا جاتا۔

واپسی پر ماسٹر برکت علی راستے میں گھروں کو کبھی نہ بھولتا۔ بابا جلال سے اس کی بواسیر کے علاج کے بارے میں ضرور پوچھتا۔ تیسرے چوتھے روز جیواں دائی کو اس کے لڑکوں کے نام چٹھی لکھ کر دیتا۔ منگنی شدہ لڑکیوں کے والدین سے گاہے بگاہے پوچھتا کہ لڑکی کے جہیز کے سلسلے میں اگر مدد کی ضرورت ہو تو اسے بتائیں کنواری لڑکیوں کے والدین کو وہ تسلیاں دیتا کہ وہ اس کے ہوتے ہوئے رشتوں کا فکر نہ کریں سردیوں میں رنگو کے دادا کے لیے کبھی کبھار چاتے کا بنڈل ہی لے جاتا۔ تاکہ اس کی گرمی کا سامان رہے۔ کبھی کسی جگہ سر پھٹول ہو جاتا تو اپنا فرض سمجھ کر صلح کرا دیتا۔ چونکہ

گزشتہ سات برسوں میں اکثر گھروں کا ایک آدھ بچہ اُس کا شاگرد رہ چکا تھا اِس لیے اُستاد کا روایتی احترام اُس کی دخل اندازی کو ہمیشہ خوش آمدید میں تبدیل کر دیتا۔

اپنے سکول میں ماسٹر برکت علی شاگردوں کا بہت خیال رکھتا۔ ہر ماہ فیس دینے کا وقت آتا تو وہ ایک شاگردوں کو خاموشی سے روپے واپس لے دیتا۔ "جا بیٹا لے جا مجھ سے کیا پردہ۔ میں جانتا ہوں پچھلے مہینے تمھارا خرچ تنگ رہا ہے"۔ بچیوں سے البتہ فیس کبھی نہیں لی جاتی تھی۔ کیونکہ لڑکی کسی ایک کی نہیں سارے گاؤں کی لڑکی ہوتی ہے۔

جمعہ کے روز بیواؤں کے متعلق مولوی صاحب کا واعظ سن کر جب ماسٹر برکت علی باہر نکلا۔ تو وہ اپنی غفلت پر استغفار پڑھ رہا تھا کہ زندگی کے اتنے سال ہاتھ سے نکل گئے لیکن وہ کسی دُکھیا بیوہ کا مداوا نہ بن سکا۔ برخلاف اِس کے نامعلوم اس نے کتنی بیوہ عورتوں کا دِل دکھایا۔ اُس نے دِل کو تسلّی دینے کے لیے سوچا کہ پیشتر ازیں اُسے خُدا کے نزدیک بیوہ کے درجہ کا بھی تو علم نہ تھا۔ اور وہ سر جھٹک کر پکار اُٹھا "توبہ میرے اللہ توبہ۔ مجھے بخشنا۔" اور پھر تھکی چال سے آگے چلتا گیا۔

گلی کی موڑ پر چند آوارہ بچے ایک کُتّے کی دُم میں رسّی باندھے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ ماسٹر برکت علی نے انھیں ڈانٹا۔ کُتّے کو چھڑایا۔ اور جس لڑکے کے ہاتھ میں رسّی تھی۔ اُسے کان سے پکڑ کر ساتھ چلانے لگا۔ لڑکا ایک ہاتھ سے کان کو چھڑانے کی کوشش میں ساتھ ساتھ اُچکتا ہوا چلا آرہا تھا۔

"کیوں بے کس کا لڑکا ہے تُو؟"

"سی........ اُوئی........ جی نوراں کا۔" لڑکا کان کے درد میں مبالغہ کرتا بولا۔

"نوراں؟ — کون سی نوراں؟ ..... کہاں رہتے ہو تم؟"

"اُوئی مر گیا..... جی..... اُوئی........ وہ ٹیلے پر" اُس کی ایک آنکھ

بند ہوئی جا رہی تھی۔

اور ماسٹر برکت علی کو خیال آیا کہ یہ وُہی نوراں ہے۔ جس کا خاوند پچھلے سال ہیضہ سے مر گیا تھا۔ ماسٹر برکت علی اُس کے حالات سے بے خبر تھا۔ پھر بھی اُسے اِتنا معلوم تھا کہ موت کے وقت متوفی کے جاننے والے نوراں کی غربت کا ذکر بڑے ہمدردانہ انداز میں کیا کرتے تھے۔

"کیا نام ہے تیرا؟"

"جی! غفور" ماسٹر برکت علی نے اُس کا کان چھوڑ دیا۔ اور سوال کرنے لگا۔ اسے معلوم ہوا کہ غفور کوئی کام نہیں کرتا۔ بلکہ گلیوں میں آوارہ پھرتا رہتا ہے اور اُس کی ماں محنت مزدوری کر کے گزارہ چلاتی ہے۔ ماسٹر برکت علی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ گھنٹہ بھر پہلے کا سُنا ہوا وعظ اس کے کانوں میں گونجنے لگا۔ بیوہ کی مدد کرنے کا بہترین طریقہ اُس کے آوارہ بچّے کو سدھارنا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے بچّے کو ساتھ آنے کو کہا اور گھر کو چلا۔

"لے غفورے پڑھ تو بھلا کیا لکھا ہے میرے دروازے پر؟"

غفور نے شرما کر سر جھکا لیا "جی میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔"

"اچھا۔ اچھا کوئی بات نہیں۔" ماسٹر برکت علی خندہ پیشانی سے درگزر کرتا ہوا بولا۔

کمرے میں لا کر اُس نے بلیک بورڈ کی طرف اِشارہ کیا جس پر اُردو کے ا، ب، جد لکھے ہوتے تھے۔ لیکن غفور وہ بھی نہ پڑھ سکتا تھا۔ ماسٹر نے ہنس کر ایک ہلکی سی چپت اُس کے گال پر لگائی اور سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا "نالائق دس برس کی عمر میں اِتنا بھی نہیں پڑھ سکتا۔" پھر اُس نے چاولوں کی میٹھی پنّی اسے کھانے کو دی۔ اور جب لڑکا کچھ گھُل مِل گیا۔ تو ماسٹر برکت علی نے اپنے باورچی خانے میں جا کر مُونگ کی دال کا لفافہ خالی کیا اور پھاڑ کر ایک نئے قاعدے کا جزدان بنا ڈالا۔

"آ غفورے بچے تجھے تصویریں دکھاؤں۔" غفورا اب کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وُہ شوق سے ماسٹر کے قریب آن بیٹھا۔ اور ماسٹر برکت علی اُسے آم۔ بلّی۔ گدھے اور لنگور کی تصویریں دکھانے لگا۔

"یہ تصویریں لو گے؟" اُس نے پیار سے پوچھا۔ غفورے کی شرمائی ہنسی میں خواہش کروٹیں لے رہی تھی۔

"یہ لو ۔ ۔ ۔ ۔ شاباش۔" وُہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہُوا بولا۔ "یہ گھر لے جاؤ۔ کل پھر آنا۔ یہاں سکول میں تمہیں پڑھاؤں گا۔ جب یہ قاعدہ پڑھ چکو گے تو تمہیں اور قاعدہ دُوں گا۔ جس میں اس سے بھی اچھی تصویریں ہوں گی۔ شاباش اب سیدھے گھر جاؤ۔ کل پھر آنا۔"

غفورے نے شیشے کے آبگینے کی طرح قاعدہ دونوں ہاتھوں میں مضبُوطی سے پکڑ کر سینے سے چپکا لیا۔ اور باہر نکل کر بگٹٹ بھاگ اُٹھا۔ ماسٹر برکت علی دروازے میں کھڑا ہو کر مُسکرا کر دیکھتا رہا۔ اور جب وُہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو واپس مڑتے ہُوئے کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا "بخشنا مجھے میرے مولا۔ میری یہ خدمت قبول کر۔"

دُوسرے روز ماسٹر برکت علی لڑکوں کو پڑھا رہا تھا۔ تو غفورے نے گلی میں اِدھر اُدھر گھومتے ہُوئے تین چار مرتبہ خواہش مندانہ انداز میں اندر جھانکا لیکن جب ماسٹر برکت علی نے پیار سے بُلایا تو بھاگ گیا۔

اس کے بعد دو دن تک غفورا نظر نہ آیا۔ ماسٹر برکت علی کو ایسا معلوم ہُوا جیسے پُل صراط پر سے گزرتے گزرتے اس سے جنّت کا پاسپورٹ چھین کر ایک دم دوزخ میں دھکا دے دیا گیا ہو۔

"ارے بشیرے۔ جا ذرا غفورے ٹیلے والے کو بُلا لا۔" سکول بند ہونے پر اُس نے کہا۔ تھوڑی دیر بعد بشیرا غفورے کو ہاتھ سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہُوا

وہاں لایا۔ اور جب ماسٹر نے اُسے پُچکارا۔ تو وہ شرماتا۔ لجاتا۔ جھجکتا اندر آ گیا۔ ماسٹر برکت علی نے اسے اپنے داہنے بازو میں سمیٹ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ اور ٹھوڑی انگلی سے اُٹھاتے ہوئے بولا۔

"غفورے بچے تو آیا نہیں میرے پاس؟"

غفورا شرما کر اِدھر اُدھر مُنہ پھیرنے لگا۔ مگر جب ماسٹر نے بہت اصرار کیا تو کہنے لگا "بے بے کہتی تھی۔ مت جایا کر وہاں۔ ہمارے پاس فیسوں اور کتابوں کے لیے پیسے نہیں ہیں۔"

ماسٹر نے بڑے ترس سے لڑکے کو دیکھا اور پھر ایک دم گلے سے لگا کر پیار کرنے لگا۔

"توبہ اللہ توبہ!" پگڑی کے پلّو سے آنکھیں پونچھ کر وہ روندھے ہوئے گلے سے بولا۔ اور دروازے میں جا کر زور سے ناک صاف کرنے لگا۔

ایک رومال میں تھوڑے ستّو اور گُڑ لے کر ماسٹر برکت علی نے غفورے کو اُنگلی سے لگایا۔ اور نوراں کے گھر کی طرف چل دیا۔ ماسٹر کو گھر میں آتا دیکھ کر نوراں کا مُنہ ایک دم کھلا رہ گیا۔ جیسے چوہیٹی کے گھر ہاتھی آ جائے۔ ماسٹر برکت علی کہتا ہی رہا کہ کھڑے کھڑے بات کر لوں گا۔ لیکن نوراں نے جھپا جھپ چارپائی پر سے سرسوں کا ساگ جھاڑ دیا۔ اور دھوبی کا دُھلا ہوا کھیس بچھا کر خود ذرا فاصلے پر پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ دوپٹے کا پلّو مُنہ میں پکڑ کر آدھا چہرہ اور ایک آنکھ ڈھک لی۔

"دیکھو بہن جی۔" ماسٹر برکت علی نے گلا صاف کر کے کہنا شروع کیا۔ "میں یہ نہیں پوچھنے آیا کہ غفورے کو سکول کیوں نہیں بھیجا بلکہ یہ کہنے آیا ہوں کہ غفورا میرے سگے بھانجے کی طرح ہے۔ فیس، کتابوں اور ہر ضرورت کا میں خود ذمّہ دار ہوں۔ اس کا ابا ہوتا تو اور بات تھی لیکن ...."

ابا کا نام آتے ہی نوراں کے نتھنے پھڑک اُٹھے۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ آنسو

پوچھنے میں وہ پردہ ختم ہو گیا۔ اور وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی " ویرجی۔ میرا تو نصیبا ہی جل گیا۔ وہ خود تو چلا گیا۔ مجھے ان مصیبتوں کے لیے چھوڑ گیا۔" اس کی آنکھوں سے جھڑی بندھ گئی۔

" اللہ کی حکمت تو سمجھ میں نہیں آتی بی بی۔ لیکن تم کیوں فکر کرتی ہو۔ لڑکی کا تو سارا گاؤں ہی میکہ ہوتا ہے۔ ہم کس لیے بیٹھے ہیں غفورے کا ابا اللہ بخشے میرا بھی جاننے والا تھا۔"

اور پھر نوراں خاوند کی موت۔ موت کے بعد عزیزوں کا برتاؤ۔ اور موت سے چند روز پہلے کی باتیں آنسوؤں کے تار اور ہچکیوں کے گھونٹ لے لے کر سناتی رہی اور ماسٹر برکت علی خدا، رسول، حدیث، حکایتوں اور کہاوتوں سے اس کو تسلیاں دیتا رہا۔ بالآخر جب وہ اٹھا تو نوراں مسرور تھی، کہ خدا نے ایک فرشتہ اس کی مدد کو بھیج دیا ہے۔ اور ماسٹر برکت علی مسرور تھا کہ اس بیوہ کی مدد کرنے سے اس کی عاقبت سدھر جاتی تھی۔ غفورے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اسے ایک ٹکہ دیا۔ اور پھر سیدھا مسجد میں جا کر سجدہ میں گر پڑا اور رو رو کر خدا سے التجا کرتا رہا۔ کہ وہ اسے ان کی سرپرستی میں ثابت قدم رکھے اور اس کے عوض روزِ قیامت کو بخش دے۔

چند ماہ کے عرصہ میں غفورا ماسٹر برکت علی کا شاگرد خاص بن گیا۔ چاک کا ڈبہ اور جھاڑن اس کی تحویل میں رہتا۔ ٹاٹ بچھانے۔ گننے۔ لپیٹنے اور بورڈ صاف کرنے کا وہ ذمہ دار تھا۔ طالب علموں کے لیے پانی کا گھڑا بھرنا اس کا فرض تھا۔ ماسٹر برکت علی کو پیاس لگتی تو وہ غفورے کو آواز دیتا۔ کنوئیں کے ٹھنڈے پانی سے حقہ تازہ کرنے اور چلم بھرنے کا حق صرف غفورے کو حاصل تھا۔ وہ خود بھی بہت سمجھدار اور باتمیز بچہ بن گیا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ الف آم۔ بے بلی سے بڑھ کر " وہ روٹی لاتی ہے، کس نے کھائی ہے" تک پہنچ چکا تھا۔ سیاہی میں لتھڑی ہوئی انگلیوں سے

تختی پر سو تک گنتی بھی لکھ لیتا تھا۔ ٹین کی چیچک زدہ سلیٹ پر کتنی بار تھوک رگڑنے کے بعد بڑی بڑی رقوم جمع بھی کر لیتا تھا۔ ماسٹر کے گھر کے اندر والے آلے میں مٹی کے پیالے میں اس کے لیے چاولوں کی پچی ہمیشہ پڑی رہتی تھی۔ دوپہر کا کھانا وہ ماسٹر کے ساتھ کھاتا۔ اور جب ماسٹر بال کٹواتا تو غفورے کے سر پر بھی چٹیل میدان بن جاتا۔ جس پر وہ آم کی گٹھلی رگڑ کر خوب چمکا لیتا۔

اپنے گھر میں بھی غفورا کافی سُکھی تھا۔ کیونکہ ہر مہینے ماسٹر برکت علی فیس اکٹھے ہوتے ہی شام کو چپکے سے جا کر نوراں کو کچھ روپے دے آتا۔ فصل کے موقع پر جب شاگرد اُسے دانے وغیرہ لا کر دیتے تو کئی روز تک غفورا چھوٹے چھوٹے تھیلے بھر کر لے جاتا رہتا۔ تہوار کے موقعہ پر غفورے کو نئے کپڑے ملتے اور نوراں کے ہاں گڑ، شکر، چنے اور دالوں کی پوٹلیاں پہنچ جاتیں۔ ماسٹر برکت علی بھی گاہے گاہے نوراں کے گھر جا کر روزمرہ کے حالات سنوارتا رہتا۔ اور نوراں پُرنم آنکھوں سے دُعائیں دیتی دیتی بچھ جاتی۔ ماسٹر برکت علی اس کے گھر سے نکلتا تو اکثر پکار اُٹھتا۔ "بخشنا مجھے میرے مولا۔"

اب ماسٹر برکت علی کو نماز میں زیادہ مزہ آنے لگا تھا۔ صبح کھڑکی میں بیٹھ کر قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا تو جھوم جھوم جاتا۔ وعظ میں مولوی صاحب اگر روزِ حشر اور اگلے جہان کا ذکر کرتے یا سزا اور جزا کے متعلق خدا اور بندے کا خود ساختہ مکالمہ پیش کرتے تو ایک اطمینان بخش مسکراہٹ ماسٹر کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی۔ جیسے کوئی غریب بیوپاری مال کی قیمت پیشگی ادا کرنے کے بعد مطمئن سا نظر آئے۔ اس نے پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ شادی بالکل نہیں کرے گا۔ بلکہ اپنے اخراجات میں سے چار پانچ سال بچت کرنے کے بعد وہ حج کو جائے گا۔ اور اس عزم کو تازہ رکھنے کے لیے اُس نے اپنے کمرے میں رسولِ کریمؐ کے روضۂ مبارک کی خوبصورت سی رنگین تصویر لگا دی۔ جسے دیکھ کر وہ اپنے پروگرام کی کامیابی کے لیے دُعائیں مانگا کرتا۔ ساتھ ہی ساتھ بچت کرنے کے لیے وہ اپنے

رہن سہن میں بھی انتہائی کفایت شعار ہو گیا۔

ایک روز ماسٹر برکت علی شام کے وقت نوراں کے گھر سے نکلا تو گلی میں کوئی زور سے کھنکارا۔ ماسٹر نے مڑ کر دیکھا تو شرفو کانا سامنے بیری کے درخت کے نیچے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"سلاما لیکم ماسٹر جی" اُس کی آواز میں شرارت ہمک رہی تھی۔

"وعلیکم اسلام۔ سنا بھئی شرفو کیا ہو رہا ہے؟" ماسٹر صاحب نے فطری خوش خلقی سے کام لیا۔

"بس بادشاہو۔ مولا کی دُنیا کے رنگ دیکھ رہا ہوں۔" اُس نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔ اور ماسٹر برکت علی کچھ نہ سمجھتے ہوئے دِل ہی دِل میں اُس کی چلبلی طبیعت سے لطف اندوز ہوتا چلا آیا۔

چند روز بعد ماسٹر برکت علی شہر جانے کے لیے لاری کے اڈے پر پہنچا تو وہاں منشی کے پاس شرفو کانا اور بلّو جلاہا بیٹھے تھے۔ دُور سے ماسٹر کو آتے دیکھ کر انھوں نے ایک دُوسرے کو کہنیاں ماریں اور شرفو کانا تالی بجا کر گانے لگا۔

"یاریاں لایاں نیں۔ اسی توڑ نبھاواں گے۔" ماسٹر برکت کے پہنچتے پہنچتے بس آگئی اور وہ جلدی سے ٹکٹ خریدتے ہوئے اُس کی طرف لپکا۔ عجلت میں اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے منشی نے کوئی بات زیرِ لب کہی اور باقی سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ وہ مڑا لیکن کنڈکٹر بولا:

"شتابی شتابی آؤ ماسٹر جی دیر ہو رہی ہے!"

اور وہ لپک کر بس پر جا چڑھا۔

اگلے دن شہر سے واپس آتے ہوئے جب وہ بازار سے گزرا تو بشیر سبزی فروش کی دکان پر بلّو جلاہا کھڑا مولیاں کھا رہا تھا۔ اُس نے آہستہ آہستہ کوئی بات بشیر کے کان میں کہی اور وہ دونوں غور سے ماسٹر کی طرف دیکھنے لگے!

جمعہ کے روز ماسٹر برکت علی نہا دھو کر مسجد کی طرف چلا۔ راستے میں آٹے کی چکی پر شرفو کانا اپنے بے فکرے دوستوں کے چکر میں لہک لہک کر گا رہا تھا۔ اور باقی سب تالیاں بجا رہے تھے۔ ماسٹر کو دیکھ کر بالکل خاموشی چھا گئی۔ وہ اسے معمول کے مطابق احترام سمجھتا ہوا تمکنت سے آگے گزر گیا۔ لیکن ابھی دس قدم ہی گیا ہوگا کہ شرفو کانا سینے پر ہاتھ رکھ کر چلایا "ہائے ہائے میرا دل گیا" کسی نے منہ میں انگلی ڈال کر زور سے سیٹی بجائی، کوئی زبردستی مصنوعی کھانسی کھانسا اور کوئی پکارا "ہائے میرے رانجھے" اور پھر ایک طویل قہقہہ برس پڑا۔ ماسٹر برکت علی اسے لڑکوں کا باہمی مذاق اور بھکڑپن سمجھتے آگے نکل گیا۔

دو تین روز گزر گئے۔ ماسٹر برکت علی چارپائی پر لیٹا حقے کے کش لگا رہا تھا کہ اتنے میں غفورا روتا روتا سکول واپس آن پہنچا۔

"کیا ہوا بچے؟"

"مجھے شرفو نے مارا ہے" وہ ہچکیاں لیتا ہوا بولا۔

"ارے" ماسٹر برکت علی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کیوں مارا، میرے بچے کو اس نے۔" وہ اسے پاس بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"وہ کہتا تھا۔۔۔۔ اوں۔۔۔۔ اوں۔۔۔۔ تلاشی دو۔"

"تلاشی؟" ماسٹر حیران رہ گیا۔ "کیسی تلاشی؟"

"ہاں۔۔۔ کھوں کھوں۔۔۔۔ وہ کہتا تھا۔۔۔۔ تیرے ماسٹر نے۔۔۔

۔۔۔ اوں اوں۔۔۔۔ تیری ماں کے نام پیار کا رقعہ بھیجا ہوگا۔"

ماسٹر برکت علی ایسے تڑپا گویا اس کا ہاتھ بجلی پر جا پڑا ہے۔ اور پھر وہ ایک دم سن سا ہو کر رہ گیا۔ پتھر کے بت کی طرح وہ چارپائی پر سیدھا بیٹھ گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھیں ایسے پھیل گئیں۔ جیسے جنگل کا ایک وحشی شیش محل میں آن پہنچا ہو، اور ان آنکھوں سے اس نے شرفو کانے کی گزشتہ دنوں کی مسکراہٹ کو ایک نئے

انداز میں دیکھا۔ اور پھر اس مسکراہٹ کے پیچھے چھپا ہوا ذلت اور بدنامی کا ایک سیلاب پھنکارا۔ وہ غفورے کو گھسیٹتا ہوا بازار کی طرف لپکا۔ جہاں شرفو کانا دہی والے کی دوکان پر لسّی پی رہا تھا۔

"کیوں شرفو تو نے اِس بچّے سے کیا کہا ہے؟" بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

شرفو کی کانی آنکھ بھی پھڑک اٹھی۔ اُس نے معنی خیز نظروں سے دوکاندار کی طرف دیکھا اور پھر بے شرمی سے ہنس پڑا۔ "ہی ہی ہی ماسٹر جی کیوں فکر کرتے ہو تم۔ وہ تو ذرا شغل کیا تھا۔ تم اپنی کام جاری رکھو۔ مولا نے مال دیا ہے۔ . . خوب عیش کرو۔ ہاہاہا!!!"

وہ ہنسنے لگا لیکن قہقہہ ختم ہونے سے پہلے ہی ماسٹر برکت علی گھونسوں اور تھپڑوں سے اس پر ٹوٹ پڑا۔ "حرامزادے۔ جھوٹے۔ کذّاب۔ کمینے۔ لفنگے۔ بے ایمان۔" وہ بارود کی طرح پھٹ پڑا۔ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔

دہی والا دوکاندار شراپ سے نیچے کود آیا۔ دوسرے دوکاندار ترازو ہاتھوں میں لیے گردنیں کھینچ کر دیکھنے لگے۔ راہگیر اور گاہک اِدھر اُدھر سے بھاگ کر اکٹھے ہونے لگے۔ اور دونوں کو کھینچ کر علیحدہ کیا۔ شرفو کانا نہایت غلیظ گالیاں بکتا ہوا بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماسٹر برکت علی ہمک ہمک کر آگے بڑھنا چاہتا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا کہ "مجھے اِس فتنہ پرداز کو مزا چکھانے دو۔"

ماسٹر برکت علی کا احترام لوگوں کے دلوں میں کھبا ہوا تھا۔ لڑائی کی وجہ معلوم کیے بغیر انھوں نے شرفو کانے پر لعن طعن شروع کر دی، جس نے ماسٹر برکت علی جیسے شریف اور نیک آدمی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ کسی نے پوچھا "بات کیا ہوئی ہے؟" تو ماسٹر پھر آپے سے باہر ہو گیا۔ "یہ کمینہ مجھ پر بہتان تراشتا ہے۔ میں اسے ٹھیک کر دوں گا۔"

"منہ دھو کر آؤ ماسٹر۔" شرفو ڈھیلے لہجے میں بولا "آیا مجھے ٹھیک کرنے والا۔ میں بہتان باندھتا ہوں...... یا تیری قلعی کھولتا ہوں۔" اور پھر شرفو نے گندی گندی گالیاں دیتے ہوئے اپنی ایک آنکھ نچا نچا کر بلند آواز میں لوگوں کو بتایا کہ ماسٹر برکت علی نے چھپ کر نوراں سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ اور شرفو کو دبانا چاہتا ہے تاکہ بات باہر نہ نکلے۔

لوگ ایک دم خاموش ہو گئے۔ چند ایک نے فوراً یقین کر لیا۔ چند ایک ماسٹر برکت علی کے متعلق اس قسم کی چیز سوچنے تک کو گناہ سمجھتے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جو اس کی تائید یا تردید کیے بغیر اس الزام میں دلچسپی لینے لگے۔

"یہ سب بکواس ہے" ماسٹر برکت علی چلّایا۔ مجمع جیسے ایک دم ہوش میں آگیا۔ بھنبھناہٹ کی ایک لہر اُٹھنے لگی۔

"ماسٹر برکت علی ایسا آدمی نہیں شرفو۔" ڈاکخانے کے بابو نے کہا۔ "جیسا تمھارا اپنا دماغ ہے۔ ویسا ہی دوسروں کے متعلق سوچتے ہو۔"

"حد ہو گئی بابو جی۔" شرفو تڑپ کر بولا "میرے ساتھ ابھی چلو مسجد میں میں قرآن اُٹھانے کو تیار ہوں۔ کہ میں نے نوراں اور ماسٹر برکت علی کو بغل گیر ہوتے دیکھا ہے۔" وہ اپنی بات رکھنے کو جھوٹی قسم پر اُتر آیا۔

قسم کا دعویٰ سن کر کئی اور لوگ شرفو کی بات پر ایمان لے آئے۔ ماسٹر برکت علی گولی کی طرح لپکا۔ لیکن لوگوں نے اسے ہٹا لیا۔ اور پھر دو چار آدمی پکڑ کر اسے گھر کی طرف لے چلے۔ سارا راستہ ماسٹر برکت علی انھیں یقین دلاتا رہا کہ شرفو بالکل جھوٹ بولتا ہے۔ اور وہ بھی ماسٹر کے ساتھ متفق تھے۔ گھر جا کر ماسٹر چارپائی پر لیٹے ہوئے سوچ رہا تھا کہ شام تک شرفو کو ہر طرف سے لعن طعن ہو جائے گی۔ اور لوگ ماسٹر کی نیت جانتے ہوتے اس پر شبہ نہیں کریں گے۔ کیونکہ شرفو کانا تین سال جیل میں کاٹ آیا تھا۔ اور ایسے آدمی کی بات ماسٹر برکت علی

کے مقابلے میں کہاں مانی جائے گی ...... اُس نے کروٹ بدل کر بظاہر بڑے اطمینان سے سونے کی کوشش کی۔

ماسٹر برکت علی تو واپس آ گیا تھا۔ لیکن اِس انکشاف کی نوعیت نے ایک گوند کی طرح لوگوں کو بازار کے فرش پر چپکائے رکھا۔ اکثر لوگ ماسٹر کی نیت پر شُبہ نہیں کرتے تھے۔ چند ایک کہتے تھے۔ کہ شرفو کو جھُوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ شرفو نے محض ایک بات کی ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ کسی نے کہا۔ ماسٹر برکت علی فصل کے موقع پر نوراں کو دانے بھجواتا ہے۔ تو آخری گروہ کے چند لوگ شرفو کی بات پر ایمان لے آئے۔ کوئی بولا "سُنا ہے ماسٹر برکت علی نوراں کو ماہوار بھی کچھ دیتا ہے۔" تو چند اور لوگ بھی ماسٹر کو شرفو کے زاویے سے دیکھنے لگے۔

ہر گھڑی گزرنے پر ماسٹر کے حامیوں میں کمی ہوتی گئی۔ کیونکہ باہم تبادلۂ خیال سے یہ ثابت ہو گیا تھا۔ کہ ماسٹر برکت علی دانے۔ فیس اور دُوسری چیزیں نوراں کو بھجواتا ہے۔ ماہوار روپے دیتا ہے اور اس کے بچّے کو سکول میں لاڈ سے رکھتا ہے۔ رائے عامہ یا تو ملتی ہی نہیں لیکن جب ملتی ہے تو چھلانگیں مارتی چلی جاتی ہے۔ چُنانچہ یہ ثبوت مضبوط سیڑھیاں تھیں جن پر چڑھ کر کئی لوگوں کے تخیّل نے نوراں کے گھر میں سارے کمروں کو ماسٹر برکت علی کے دیے ہوئے دانوں سے بھرے دیکھا۔ کئی ایک کو الہامی انداز میں پتہ چل گیا کہ فلاں وقت ماسٹر برکت علی فلاں سمت کس مقصد کے لیے جا رہا تھا۔ اکثر لوگوں پر فوراً واضح ہو گیا۔ کہ برکت علی کی کفایت شعاری کی اصل وجہ کیا ہے۔ ماسٹر کے شادی نہ کرنے کا راز بھی سمجھ میں آ گیا۔ کیونکہ بشیر گھوسی کا خیال تھا کہ جس آدمی کو پینے کو دُودھ مل جائے اُسے بھینس پالنے کی کیا ضرورت ہے ہماری منفی جنسی اقدار کے محدّب شیشے میں سے جب لوگوں نے عادتاً جھانکا تو یہ ثبوت ہر لحظہ بڑے ہی بڑے ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ اصل ماسٹر برکت علی اُن کے نیچے چھپ گیا۔

شام تک بازار میں یہ موضوع زیرِ بحث رہا۔ لاریوں کے اڈّے پر۔ چکّی والے کے ترازو کے پاس۔ دہی والے کی دکان کے سامنے ٹوٹے ہوئے بنچوں پر۔۔۔۔ چوراہے میں۔ بوہڑ کے درخت تلے۔۔۔۔۔۔ بھبوسے والے کی دکان پر۔ سہ پہر کو دانوں کی بھٹّی پر۔۔۔۔۔۔ شام کو تنور پر۔۔۔۔۔۔ راہ چلتے ملاقاتیوں نے تازہ ترین اطلاعات کا تبادلہ کیا۔۔۔۔۔۔ خاوندوں نے بچّوں کی غیر موجودگی میں اپنی بیویوں کو بتایا۔۔۔۔۔۔ بیویوں نے ساگ چیرتے ہوئے اپنی سہیلیوں سے کہا۔۔ ۔۔۔۔۔۔ دُوسرے دن بھنگنیں ایک گھر والوں کی رائے دُوسرے گھر لے گئیں۔۔۔۔۔۔ کنواری لڑکیوں نے دبی گھُٹی ہنسی اور آنکھوں کے اشاروں سے تبصرے کیے۔۔۔۔۔۔ جوان لڑکوں نے ماسٹر اور نُوراں کے تعلّقات کی تخیّل کے پردے پر پُوری فلم دیکھ ڈالی۔۔۔۔۔۔ بُوڑھوں نے توبہ اور استغفار کے ساتھ اِس قصّہ میں قُربِ قیامت کے آثار دیکھے۔ اور گھر جا کر اپنی جوان اولادوں کو کڑی نظروں سے گھُورا۔

ماسٹر برکت علی اپنے کمرے کا دروازہ کھولے چارپائی پر لیٹا حُقّہ پیتا رہا۔ اِکّا دُکّا لوگ اُدھر سے گُزرتے۔ تو رُک کر لڑائی کا تذکرہ ضرُور کرتے۔ ماسٹر برکت علی الف سے یے تک سارا قِصّہ سُنا کر اپنی معصومیت ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ لوگ کوئی فیصلہ دِیے بغیر کھِسکنے کی کوشش کرتے۔

دُوسرے دن مدرسے میں چھُٹّی تھی۔ ماسٹر برکت علی بازار میں نِکلا۔ اور لوگوں کے پاس جا جا کر اپنی بے گناہی کا یقین دلاتا۔ لوگ خاموشی سے سُنتے رہتے۔ کوئی ہُوں ہاں کر دیتا۔ لیکن زیادہ تسلّی نہ دیتے۔ ماسٹر زیادہ جوشیلا ہوتا گیا۔ اس کے دلائل میں سرگرمی پیدا ہوتی گئی۔ آواز بلند ہوتی گئی۔ وُہ ایک گروہ سے ہٹ کر دُوسرے گروہ کے پاس جاتا۔ لیکن وُہ بات کہتا تو لوگ زیرِ لب مُسکرانے لگتے۔ ایک دُوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے اور لاتعلق سے ہو کر اِدھر اُدھر کھِسکنے کی کوشش کرتے۔

ماسٹر برکت علی بڑا حیران ہوا۔ بالآخر کسی نے اسے بتایا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔ تبھی اتنی شدت سے اپنے آپ کو معصوم ظاہر کر رہا ہے۔ ماسٹر برکت علی کا خون کھولنے لگا۔ لیکن ماتھے پر ٹھنڈے پسینے آگئے۔ چکی کے پاس لوگوں کا گروہ کھڑا تھا۔ اس نے وہاں جا کر نہایت جوش سے کہنا شروع کیا کہ شرفو افترا پردازہ ہے۔ وہ خود بالکل معصوم ہے، نوراں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ کبھی کبھار اسے بیوہ سمجھ کر اور خدا کا حکم جان کر وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ لیکن لوگ اِس دلیل پر ہنسنے لگے۔ انھوں نے آپس میں ٹھوکے دیے اور معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

ماسٹر برکت علی کی رگ رگ صدمے سے نڈھال ہو گئی۔ وہ جانتا تھا کہ گاؤں کی فضا میں اِس قسم کی بدنامی اس کی قطرہ قطرہ جوڑی ہوئی عزت کو ایک ہی دفعہ مٹا دے گی۔ گھر جا کر وہ چادر میں منہ لپیٹ کر باقی سارا دن اور ساری رات بھنتے کباب کی طرح کروٹیں لیتا رہا۔

صبح مسجد میں جب جماعت کھڑی ہونے لگی۔ تو امام نے ماسٹر برکت علی کی بجائے ایک دوسرے آدمی سے کہا "چلو شاہ جی تکبیر پڑھو" اور وہ تکبیر پڑھنے لگا۔ ماسٹر کا نماز میں بھی دل نہ لگا۔ وہ جلدی لوٹ آیا۔ واپسی پر جب وہ قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگا۔ تو حروف اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے۔ پھر غائب ہو جاتے۔ آواز ٹوٹ ٹوٹ جاتی۔ اور پڑھتے پڑھتے اسے یک لخت محسوس ہوتا کہ اس کا دھیان قرآن کی سطروں کی بجائے پرسوں والے واقعہ میں جکڑا ہوا ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب سکول کھلا تو صرف لڑکے حاضر تھے۔ بچیاں سب غائب تھیں۔ وہ اسے اتفاق سمجھ کر خاموش ہو رہا۔

رات کو عشاء کی نماز میں سنت پڑھتے وقت اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں طرف دو دو گز جگہ خالی ہے اور لوگ پرے ہٹ کر نماز پڑھ رہے ہیں۔

صبح مسواک کرتے وقت اس نے گزرنے والی ایک بڑھی سے پوچھا "ماسی کدھر

چلی سویرے سویرے " تو ماسی جواب دیے بغیر کندھا دباتی آگے چلی گئی ۔ وُہ کنوئیں پر گیا تو ماسی داراں آدھا بھرا گھڑا اُٹھا کر کھسک گئی ۔ شادو اپنی گاگر وہیں چھوڑ کر کہیں ٹل گئی ۔ لیکن جب ماسٹر زبردستی جیناں کا گھڑا بھرنے لگا ۔ تو وُہ آنکھیں نیچی کیے خاموشی سے ایک طرف کھڑی رہی ۔ پھر گھڑا اُٹھا کر چپکے سے چل دی ۔ اور ماسٹر برکت علی نے دیکھا کہ تھوڑی دُور جا کر بوہڑ کے درخت کی اوٹ میں اُس نے پانی زمین پر انڈیل دیا اور خالی گھڑا اٹھائے واپس چلی گئی ۔

گھر کی طرف واپسی پر ماسٹر نے دُور سے دیکھا کہ رنگو کا دادا دہلیز پر بیٹھا سُوٹی پی رہا ہے ۔ لیکن جب وُہ قدرے نزدیک پہنچا تو بوڑھا انجان بن کر اندر چلا گیا ۔

راستے میں اُس نے دو ایک راہ گیروں سے بات کی تو وُہ گفتگو بڑھانے کی بجائے ختم کرنے کی کوشش کرتے اور پھر جلدی سے کھسک جاتے ۔

دن چڑھا تو سکول میں صرف دو شاگرد آئے اور اُنھوں نے بتایا کہ باقی سب کو والدین نے سکول جانے سے منع کر دیا ہے ۔

ماسٹر برکت علی کمرے کے دروازے بند کر کے چارپائی پر مُنہ لپیٹ کر پڑا رہا ۔ اُس کے کان جلتے رہے ۔ دماغ میں چکیاں چلتی رہیں ۔ پپوٹے پھڑکتے رہے ۔ دِل ڈُوبتا رہا ۔ ماتھا کبھی بھٹی بن جاتا کبھی برف کی سِل ۔

ظہر کی نماز کے بعد اُس نے مولوی صاحب سے فریاد کی ۔ اور بتایا کہ وُہ بالکل نیک نیتی سے اُن کے فرمان کے مُطابق ایک بیوہ سمجھ کر نوراں کی مدد کرتا رہا ہے ۔ وُہ بار بار کہتا " مولوی صاحب میں بالکل بے قصُور ہوں ۔ " مولوی صاحب لاتعلق ہو کر داڑھی پر ہاتھ پھیرتے رہے ۔ اور پھر واپس مُڑتے ہُوئے کہنے لگے " نیت کا حال تو قادرِ مُطلق ہی جانتا ہے ۔ لیکن جب سب ایک بات کہہ رہے ہیں ۔ تو کچھ بات تو ہو گی ۔ "

اور ماسٹر برکت علی کو ایسے محسُوس ہُوا جیسے اس کے رگ و پے سے آنسوؤں کا سیلاب پھُوٹ پڑے گا ۔ لیکن اس کی آنکھیں خُشک ہی رہیں اور بجائے آنسوؤں کے اُن میں

انگارے دہکنے لگے۔ کنپٹیوں پر جیسے کسی نے دھما دھم ہتھوڑے مارنے شروع کر دیے۔ بڑی آہستگی سے اُس نے اپنے جسم کو گھسیٹ کر اٹھایا۔ ہاتھوں سے ٹٹول کر جوتی اٹھائی اور ہارے ہوئے جواری کی طرح تھکے تھکے قدموں سے واپس چلا آیا۔ اس کے جسم کا سارا رس جیسے نچڑ سا گیا تھا۔

ماسٹر برکت علی بند کمرے میں چارپائی پر لوٹتا رہا۔ کبھی پاؤں اٹھا کر دھما دھم ادوائن پر مارنے لگتا۔ کبھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔ پھر اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ کھڑکی میں کھڑا ہو جاتا لیکن گلی میں کسی کے آنے کی آواز سُن کر مُنہ چھپانے کو واپس بھاگتا۔ وُہ کافی دیر رسُولِ اکرم کے روضہ مبارک کی تصویر کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا حتیٰ کہ وُہ آہستہ آہستہ کانپنے لگی۔ کمرے کی دیواریں ہولے ہولے گھُوم سی گئیں۔ اور پھر ماسٹر برکت علی ایک دم بلک بلک کر رو دیا۔

شام کے وقت ماسٹر برکت علی کو بڑے زور کا بخار آنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُس پہ ہذیان کی کیفیت طاری ہو گئی۔

اُس شام نوراں نے فیصلہ کیا کہ وُہ گاؤں چھوڑ کر چلی جائے۔ کیونکہ اُسے مزدوری ملنا بند ہو گئی تھی۔ اور تمام گھروں نے اُس کے داخلے کی ممانعت کر دی تھی۔ وُہ جہاں جاتی عورتیں ایک دُوسری سے اِشاروں میں باتیں کرتیں۔ اور اُن کی چبھتی ہُوئی نظریں اُس کے جسم کو چھید ڈالتیں۔ دُوسرے دن صُبح سویرے جب وُہ گاؤں سے نکلنے لگی۔ تو اُس نے سوچا ماسٹر برکت علی سے ملتی چلے۔ اُس کے مکان پر پہنچ کر غفورے نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وُہ کتاب کے ورق کی طرح آسانی سے کھُل گیا۔ نوراں اور غفورا اندر چلے گئے۔

اندر کمرے میں صُبح کا دُھندلکا چھایا ہُوا تھا۔ اس روشن اندھیرے میں نوراں نے دیکھا کہ چارپائی پہ ماسٹر برکت علی مرا پڑا تھا۔

چند ماہ بعد زکوٰۃ کا مہینہ پھر آ گیا۔ مولوی صاحب مسجد میں کھڑے وعظ کر رہے

تھے :" دُکھیا اور بے سہارا بیوہ کی ایک آہ سات آسمانوں میں سوراخ کر دیتی ہے۔ ایسی بیوہ کی مدد کرنے والا سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ اگر دین و دُنیا کی عزّت چاہتے ہو تو بیواؤں کی مدد کرو۔"

(۱۹۵۷ء)

دُعا

صدر بازار میں میری دُکان ہے۔ چند سال پہلے تو میں منیاری والا کہلاتا تھا۔ مگر اب ترقی کرتے کرتے جنرل مرچنٹ بن گیا ہوں۔ کیونکہ مجھے اپنا کاروبار وسیع کرنے کا خبط ہے۔ اور میں نت نئے تجربے کرتا رہتا ہوں۔ جس چیز میں بھی فدا سے منافع کا امکان ہوتا ہے۔ وہ لاکر دکان میں رکھ لیتا ہوں۔ اگر چل نکلی تو بہتر ورنہ چھوڑ دی۔ اسی وجہ سے میری دُکان پر ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ بچّے۔ بُوڑھے۔ مرد۔ عورتیں۔ امیر غریب وغیرہ۔

چند لوگ میرے مُستقِل قسم کے گاہک ہیں۔ اِن میں زیادہ تر پاس پڑوس والے ہیں۔ دُکان سے چند قدم آگے جو موڑ ہے۔ وہاں ایک گرجا یا شاید کانونٹ بھی ہے۔ جس میں بہت سے پادری اور نن عورتیں رہتی ہیں۔ یہ سب لوگ میرے مُستقل

گاہکوں میں سے ہیں اور وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں۔ یہ ایک دُوسرے سے بات کرنے میں کسی کو فادر کہتے ہیں۔ کسی کو برادر۔ اسی طرح عورتیں آپس میں مدر اور سسٹر کہہ کر خطاب کرتی ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ کون کیا ہے۔ میں تو ہر پادری کو "سر" اور ہر نن کو "مس صاحبہ" کہتا ہوں۔ کیونکہ مجھے اتنا پتہ ہے کہ نن عورتیں ساری عمر کنواری رہتی ہیں۔

میری دکان پر یہ عام طور پر گروپ میں آتی ہیں۔ ایک تو ویسے ہی یورپین ہونے کی وجہ سے گوری چٹی اور خوبصورت ہیں۔ اور پھر ان کا ڈھیلا ڈھالا کالا اور سفید لباس بھی خاص طرز کا ہے۔ اِس لیے اِرد گرد سے بچے یا دُوسرے لوگ بھی اُسی وقت آجاتے ہیں۔ اور میری تجارت کو اِس طرح فائدہ پہنچتا ہے۔ ویسے یہ خود بڑی سنجیدہ ہوتی ہیں۔ ضرورت سے زیادہ بات نہیں کرتیں۔ زیباشی چیز خریدنا تو ان کے لیے بالکل حرام ہے۔ صرف چند ایک گنی چنی اشیاء سے ان کو دلچسپی ہوتی ہے۔ بس اُن کے دام پوچھے، پیسے دیئے یا اُدھار کے حساب میں درج کرائے اور چل دیں۔ سوائے ایک نن کے جو اِن سب سے ذرا مختلف ہے۔

یہ نسبتاً چھوٹی عمر کی ہے۔ کوئی بیس بائیس برس کی ہوگی۔ لیکن اِن سب میں سے زیادہ خوبصورت اور صحت مند ہے۔ اور یہ جب بھی اپنے گروپ کے ساتھ آتی ہے۔ تو سب سے سنجیدہ اور کم گو ہوتی ہے۔ اور اُن کے ساتھ ہی چیزیں خرید کر جلدی سے واپس چلی جاتی ہے۔ مگر جب اکیلی آتی ہے تو سودا خریدنے کے علاوہ مجھ سے بھی بات چیت کر لیتی ہے۔ اور مزا یہ کہ اِسے واپس جانے کی بھی جلدی نہیں ہوتی۔ بلکہ کافی دیر کھڑی رہتی ہے۔ اِسی وجہ سے یہ مجھے ان سب سے زیادہ پسند ہے۔

ایک روز یہ میری دکان پر آئی تو گاہک کوئی نہ تھا۔ اور میں اپنے سامنے کاؤنٹر پر تصویریں پھیلائے بیٹھا تھا۔ یہ تصویریں میں فلمی رسالوں سے کاٹ رہا تھا تاکہ البم بناؤں جس میں میری پسندیدہ ایکٹرسوں کے اچھے اچھے پوز ہوں۔ کوئی اور گاہک

ہوتا تو شاید چھپا دیتا۔ مگر اُسے دیکھ کر میں نے ویسے ہی رہنے دیں۔ اور پُوچھا۔

"کیا چاہیے مِس صاحبہ؟"

"او نا ٹی!" وُہ میرا سوال نظرانداز کر کے بولی" یہ کیا کرتا ہے؟"

"مِس صاحبہ البم بناتا ہوں۔"

"البم؟؟ وُہ کیوں؟"

"مِس صاحبہ دِل خُوش کرنے کو۔" میں ہنس کر بولا۔

"نہ نہ نہ۔" وُہ شہادت کی انگلی ھلا کر منع کرتی ہُوئی بولی" دل کھوش کرنا بوری (بُری) بات ہے۔ باہوت بوری (بہت بُری)۔"

"بُری کیوں ہے مِس صاحبہ؟" میں اُس سے مذاق کے مُوڈ میں تھا۔

"باہوت بوری" اُس نے پھر کہا اور گلے میں لٹکی ہُوئی صلیب کو ہاتھ میں پکڑ کر بولی" دِل پر کنٹرول کرو ـــــ پُورا کنٹرول۔"

"اور مِس صاحبہ اگر دِل نہ مانے تو۔" میں نے ہنس کر پُوچھا۔

"تو دُعا پڑھو۔"

"کونسی دُعا؟"

"ہمارا بائیبل میں باہوت دُعا ہے۔ دِل نہ مانے تو ہم فوراً پڑھتا ہے۔"

"مِس صاحبہ ہمیں بھی بتائیے۔"

"تم اپنا دُعا پڑھو ـــــ اپنا ریلیجن کا ـــــ اپنا قرآن کا۔ مگر دُعا ضرور مانگو ـــــ اس سے بورا (بُرا) بات دِل سے نِکل جاتا ہے۔ دعا دِل کو صاف کرتا ہے۔"

اور اس نے ساری تصویریں اکٹھی کر کے کونے میں ڈال دیں ـــــ مگر اس کے جانے کے بعد میں نے اُٹھا لیں۔ اور سجانے لگ گیا۔

اِس قسم کی باتوں کی وجہ سے وُہ مجھے بہت پسند تھی۔ اور میں کئی ایسی چیزیں درگزر کر دیا کرتا۔ جو کسی دُوسرے گاہک کے لیے برداشت نہ کرتا۔ مثلاً اس کی عادت

تھی کہ جب اکیلی آتی تو اپنی چیز خرید چکنے کے بعد دُکان میں اِدھر اُدھر گھومتی رہتی اور چیزوں کے بھاؤ پوچھتی رہتی۔ حالانکہ مجھے بھی علم ہوتا تھا کہ اس کا خریدنے کا ارادہ نہیں ہے۔ اگر کوئی دُوسرا گاہک یہ حرکت کرتا تو مجھے غصّہ آتا۔ مگر اس سے مجھے کبھی گلہ نہیں ہوا۔ میں جانتا تھا کہ نن عورتیں سُرخی پوڈر وغیرہ نہیں خریدتیں۔ مگر جب وہ اُن کے بارے میں کچھ پوچھتی تو میں تفصیل سے بتایا کرتا۔ اور مزے کی بات یہ تھی کہ اس کے زیادہ تر سوال انہی کے متعلق ہوتے۔

"وہ کیا ہے؟" وہ شیلف کی طرف ہاتھ کر کے کسی بہت خوبصورت سے ڈبّہ کی طرف اشارہ کرتی۔

"وہ کوٹی ہے مس صاحبہ۔"

"کوٹی کیا؟"

"یہ پوڈر ہوتا ہے۔"

"اچھا۔ ذرا دکھاؤ۔" میں شیلف کا شیشہ ہٹاتا۔ ڈبّہ نکالتا۔ جھاڑن سے صاف کرتا اور اس کو دے دیتا۔ وہ اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتی۔ پسندیدگی سے اُس کی سطح پر ہاتھ پھیرتی۔ قیمت پوچھتی اور پھر بے دِلی سے واپس کر دیتی۔

"کوئی اور بھی برینڈ ہے؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھتی۔

میں بڑی خوشی سے کٹی کیوڑا یا ایوننگ اِن پیرس کا ڈبّہ نکال کر اُسے دے دیتا جو وہ دیکھنے کے بعد واپس کر دیتی۔ اِس طرح اس نے میری دُکان میں پڑی ہُوئی قریباً ہر لپ سٹک۔ سُرخی۔ اور خوشبو وغیرہ کا معاینہ کیا تھا۔ اور دام پوچھ کر واپس کر دیے تھے ــ اور پھر باہر نکلتے وقت ضرور ایک نظر اس شیلف پر ڈالا کرتی۔

اسے چھوٹی بچیوں سے بھی پیار تھا۔ اس کی موجودگی میں اگر کوئی بچّی آجاتی اور حیران ہو کر اس کے کالے لباس، سفید گریبان اور چمکیلی صلیب کو دیکھتی تو نن

بے اختیار مسکرا دیتی۔ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی۔ اور پوچھتی۔
"بچّہ کیا دیکھتا ہے؟"
بچّی شرما کر اِدھر اُدھر ہو جاتی۔

ایک دن میری دُکان پر چھ سات سال کی بچّی آئی۔ وُہ بڑی خوبصورت اور گول مٹول تھی۔ اس کے سنہری بال سونے کی جھالر کی طرح لٹک رہے تھے۔ اور کچھ بے ترتیب بھی تھے۔ ابھی وُہ سودا خرید ہی رہی تھی کہ نن بھی آگئی۔ وُہ کچھ دیر بچّی کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے میرے شوکیس سے لال رِبن ڈھونڈ نکالا۔ آدھ گز کا ٹکڑا مجھ سے خریدا۔ اور لڑکی کے بالوں میں باندھ دیا۔ وُہ شاید بچّی کو بھی پیار کرتی۔ مگر وُہ اپنا لال ربن ہمجولیوں کو دکھانے کے لیے اتنی بے تاب تھی۔ کہ ہمک کر اس کے بازوؤں میں سے نکل گئی اور دکان سے باہر بھاگ گئی۔

کچھ عرصہ کے بعد ایک اور مزے دار واقعہ ہوا۔ میں دُکان کے لیے کافی مقدار ٹافی اور ڈراپس کی لایا۔ مگر اُن کی فروخت کی رفتار قدرے سست تھی۔ چُنانچہ بچّوں کو لبھانے کے لیے میں نے ایک نیا طریقہ سوچا۔ گاڑھے لال رنگ کے گھٹیا سے نیل پالش کی ایک شیشی کھولی۔ اور جو بچّہ بھی سودا خریدنے آتا۔ میں اس کی ایک اُنگلی کے ناخن پر پالش کر دیتا۔ شرط یہ ہوتی تھی کہ جب بچّہ اگلی بار آئے گا تو دُوسری اُنگلی بھی رنگی جائے گی۔ بچّے اپنی دس اُنگلیاں رنگنے کے لیے بار بار آتے۔ اور اُن کے لیے سب سے آسان خرید ٹافی اور ڈراپس ہوتے۔ میرا سٹاک جلد جلد ختم ہونے لگا۔

ایک دن وُہ نن اکیلی شاپنگ کرنے آئی تھی کہ اِتنے میں چھ سات بچّوں کا گروپ آگیا۔ اور سب نے اپنی اپنی اُنگلیاں میرے سامنے پھیلا دیں۔ میں ہر ایک کی ایک ایک اُنگلی پر پالش کرتا رہا۔ مگر انھوں نے شور کرنا شروع کر دیا۔ کہ دو دو ناخن رنگے جائیں۔ میں انکار کرتا رہا۔ اور وُہ شور کرتے رہے۔ اِس سارے تماشے کو نن دلچسپی سے دیکھتی رہی اور وُہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتی رہی، بالآخر اس نے سفارش کی کہ اتنے

گاہک اکٹھے آنے کی وجہ سے دو انگلیوں کا مطالبہ جائز تھا۔ اب اس سفارش کو کون کافر رد کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً سب کے دو دو ناخن پر پالش کر دی۔ بچے تالیاں بجا کر شور کرنے لگے۔ اس مسرور ماحول میں نہ معلوم مجھے کیا سوجھی کہ میں نے کہا "لائیے مس صاحبہ آپ کے ناخن پر بھی رنگ کر دوں۔"

وہ ہنسی سے دوہری ہو رہی تھی اور ہنستے ہنستے اس نے بے ساختگی سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ مگر جب میں نے برش ڈبو کر باہر نکالا تو اس نے ایک دم ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اور وہ ہونٹ ہلانے لگی۔

میں نے ہنس کر کہا "مس صاحبہ آپ اپنی بائیبل کی دعائیں پڑھ رہی ہیں کیا؟"

مگر اس نے خوفزدہ سی ہو کر گلے میں لٹکی ہوئی صلیب کو تھام لیا۔ انگلی کے اشارے سے سینے پر کراس کا نشان بنایا اور تیزی سے دکان سے نکل گئی۔

اس کے بعد وہ کافی دن تک غائب رہی۔ دو ایک مرتبہ وہ دوسری نن عورتوں کے گروپ میں آئی۔ اور سنجیدگی سے سودا خرید کر چلی گئی۔ اب اس نے آنا بہت کم کر دیا تھا۔ اور اکیلے آنے کا تو اسے شاید کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔

کافی عرصہ بعد ایک دن گاہک کوئی نہ تھا۔ اور میں دیوار میں چھوٹا سا دروازہ کھول کر اندر گودام میں چیزیں درست کر رہا تھا۔ اندر نسبتاً کافی تاریکی تھی۔ اور مجھے اندر سے دکان کا کافی حصہ نظر آتا تھا۔ سامان رکھتے رکھتے میں نے ایک دفعہ نگاہ اٹھائی۔ تو وہ کالا لباس پہنے شوکیس کے سامنے کھڑی نقلی موتیوں کا ہار دیکھ رہی تھی۔ میں اندر کھڑا اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے پاس پڑا ہوا شیشہ اٹھایا اور اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ سے سر کا کپڑا ذرا اوپر کھسکایا۔ تاکہ شیشے میں اپنے بال دیکھ سکے۔ مگر جیسے ہی میری آہٹ سنائی دی۔ اس نے شیشہ رکھ دیا۔ اور گودام کے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ میں باہر آیا تو اس کے ہونٹ ہل رہے تھے ——— غالباً زیرِ لب کوئی دعا پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے بڑی خاموشی سے کچھ

سوئیاں اور دھاگے خریدے اور چلی گئی۔

میں اپنے کاروبار کو وسیع کرنے کے تجربے ہمیشہ کرتا رہتا تھا۔ چند ایک دوستوں کی صلاح پر مکھن۔ ڈبل روٹی۔ کیک رس اور بسکٹ وغیرہ بھی اپنی دکان میں رکھنے شروع کر دیے۔ اُن سے بھی کافی آمدنی ہونے لگی۔

ایک روز نن میری دکان پر اکیلی آئی۔ اس کو جو اشیاء درکار تھیں۔ وہ لانے کے لیے میں نے ملازم کو گودام میں بھیجا۔ اور وہ انتظار کر رہی تھی۔ اتنے میں ایک فوجی سپاہی دکان میں داخل ہوا۔ اور اُس نے مجھ سے ڈبل روٹی مانگی۔ میں نے بکس کھول کر نکالی۔ اور پتھر کی سل پر رکھ کر توس کاٹنے کے لیے چھری اٹھائی۔ مگر اُس نے مجھے اشارے سے روک دیا۔ ہاتھ سے ڈبل روٹی کو دبایا اور کہنے لگا۔

"یہ سخت ہے۔ کوئی دوسری نرم سی دو۔"

میں نے ایک اور نکالی۔ فوجی نے اُسے ہاتھ میں پکڑ کر دبایا۔ اس کی انگلیاں اندر دھنس گئیں۔ مگر وہ کہنے لگا۔

"دراصل مجھے یہ کل استعمال کرنی ہے۔ اور یہ کل تک لوہا بن جائے گی۔ اس لیے کوئی اور ڈھونڈو۔ شاید اس سے بھی نرم مل جائے۔"

دوسرا بکس کھول کر میں بالکل تازہ ڈبل روٹی نکال لایا۔ جو بہت نرم تھی۔

فوجی نے اسے ہاتھ میں پکڑ کر دبایا۔ تو اُس کی انگلیاں تقریباً غائب ہو گئیں۔ ڈبل روٹی بالکل پچک گئی۔ سوائے اس اُبھار کے جو شہادت کی اُنگلی اور انگوٹھے کے درمیان میں سے باہر جھانک رہا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ کو ڈھیلا کیا اور ایک دوبار پھر دبا کر کہنے لگا۔

"یہ ٹھیک ہے۔"

جب اس نے ڈبل روٹی کاؤنٹر پر رکھی۔ تو اس کے پچکے ہوئے حصے آہستہ آہستہ باہر کو اُبھرنے لگے۔

جتنی دیر فوجی سپاہی اپنے مضبوط ہاتھ کی سخت گرفت میں نرم ڈبل روٹیوں کو بھینچتا رہا۔ وہ نن ٹکٹکی باندھے اُس کے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔ اور اس کے چہرے پر لالیاں اُمنڈنے لگیں۔

میں نے ڈبل روٹی لفافے میں ڈالی۔ فوجی سپاہی کو دی اور وہ چل دیا۔

جب میں نن کی طرف متوجہ ہوا۔ تو اس کا چہرہ لال سُرخ تھا۔ اور ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے۔ سودا لے کر اُس نے مجھے پیسے دیئے۔ تو اس کے ہاتھ بُری طرح کانپ رہے تھے۔ اور وہ نگاہیں چُرا رہی تھی۔

نن کے جانے کے بعد میں دُوسرے گاہکوں میں مصروف ہو گیا۔ اور اُسے بھُول گیا۔

اگلے دن میں نے آکر دکان کھولی ہی تھی کہ اِتنے میں وہ نن سامنے موڑ مُڑتی دکھائی دی۔ سڑک پار کر کے وہ سیدھی دُکان کی طرف آئی۔ تو مجھے تعجب ہُوا کیونکہ وہ کبھی اِتنا سویرے نہ آتی تھی۔

میں نے ہنس کر کہا "مِس گُڈ مارننگ" تو اُس نے کچھ بولنے کی بجائے صرف سر ہلا کر جواب دیا۔ عام طور پر جب وہ اکیلی آتی تھی تو کھُل کر بات چیت کرتی تھی۔ مگر اس روز وہ کچھ خاموش اور سراسیمہ سی تھی۔ جب کاؤنٹر کے قریب آئی۔ تو اس کا چہرہ ایسے لگا جیسے صدیوں سے مریض ہو۔ آنکھوں میں شب بیداری کے اثرات تھے اور اُن کے گرد کالے حلقے رُخساروں کو چھُو رہے تھے۔ میرے پاس آکر اُس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اپنے ذمے اُدھار کا حساب پُوچھا۔ میں کاپی نکال کر واجب الادا رقم دیکھنے لگا۔ تو وہ گھبراہٹ سے اُنگلیاں چٹخ رہی تھی۔

"مِس صاحبہ آپ کے ذمے گیارہ روپے اور پچیس پیسے آتے ہیں۔"

اُس نے اپنے ڈھیلے لباس میں سے ایک رومال نکالا۔ اُسے کھولا تو اندر نوٹوں کا بنڈل تھا۔ اس کے پاس اتنی زیادہ رقم دیکھنے کا میرا پہلا اِتفاق تھا۔ اُن روپوں

میں سے اُس نے ایک دس روپے کا اور ایک پانچ روپے کا نوٹ نکالا۔ اور کاؤنٹر پر رکھ دیے۔

دراز کھول کر باقی پیسے نکالتے نکالتے میں نے پوچھا۔

"اور کچھ چاہیے مس صاحبہ؟"

اُس نے ایک جھرجھری سی لی۔ اور جواب دینے کی بجائے ہونٹ بھینچ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

میں باقی پیسے واپس کرنے لگا تو پچاس پیسے کا ایک سکہ اُس کے ہاتھ سے کاؤنٹر پر کنارے کے بل گرا۔ لڑھک کر سرے تک گیا۔ وہاں سے نیچے گرا۔ اور لڑھکتا لڑھکتا اس شیلف سے جا ٹکرایا جس میں پوڈر اور سرخی وغیرہ رکھے تھے۔ میں وہاں تک گیا۔ جھک کر سکہ اٹھایا۔ اور جب واپس مڑنے لگا۔ تو وہ نن اُس شیلف کو بغور دیکھ رہی تھی۔

کاؤنٹر کے پاس واپس آ کر میں پچاس پیسے کا سکہ اُسے دینے لگا مگر اس نے لینے کے لیے ہاتھ نہ بڑھایا۔ بلکہ ایک عجیب سی حرکت کی.........

وہ یہ کہ اس نے نوٹوں کے بنڈل میں سے دس روپے کا ایک اور نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ باقی نوٹ تہہ کر کے لباس کی سلوٹوں میں کہیں چھپا لیے۔ اور پھر دروازے کی طرف دیکھا ——— وہاں کوئی نہ تھا ——— وہ میری طرف بڑھی ——— کاؤنٹر کے پاس والا تختہ اٹھا کر اندر گھس آئی ——— میرے پاس سے گزر کر اس شیلف تک گئی ——— جلدی سے شیشہ کا دروازہ کھولا ——— پاؤڈر کے ڈبے، عطر اور ناخن پالش کی دو تین شیشیاں اُٹھائیں ——— الماری کھلی چھوڑ کر جلدی سے واپس مُڑی ——— اور بھاگتی ہوئی دکان سے باہر نکل گئی۔

اِس واقعہ کو کئی ماہ گزر چکے ہیں۔ مگر اس دن کے بعد وہ نن اس علاقے میں کہیں نظر نہیں آئی ——— نہ معلوم وہ کہاں چلی گئی ہے ——— میں نے کئی دفعہ دوسری

نن عورتوں سے اُس کے متعلق دریافت بھی کیا۔ مگر وُہ مجھے کوئی جواب نہیں دیتیں بلکہ جب بھی اس نن کا ذِکر کرتا ہوں۔ وُہ گلے میں لٹکی ہوئی صلیب کو تھام لیتی ہیں شہادت کی اُنگلی سے سینے پر کراس کا نشان بناتی ہیں اور ان کے ہونٹ تیزی سے ہلنے لگتے ہیں۔

(۱۹۶۳ء)

گورکن

"یا مولا! کسی کو بے موت ہی مار ڈال۔"

اللہ بخش نے مُنہ آسمان کی طرف اُٹھا کر کہا۔ اور لمبی سیدھی سڑک کو مایوسی سے دیکھنے لگا جس پر کوئی آدمی نظر نہ آتا۔ دُور بس سٹاپ پر دو چار آدمی کھڑے تھے۔ کھمبے کے نیچے پان سگریٹ والا اکڑوں بیٹھا تھا۔ لیکن اس سے پچھلے موڑ سے کوئی سائیکل سوار نہ آتا تھا۔ جو اس کے دِل کی اُمید بندھاتا۔ عام طور پر جب بھی کوئی سائیکل سوار تیزی سے موڑ کاٹتا اللہ بخش کی آنکھیں اسی پر جم جاتیں۔ ٹاہلی کے پچھلے چار درختوں تک اس کے پیڈل زور سے چلتے اور اگر پانچویں کیکر پر آکر قدم رُک جاتے اور سائیکل شہد کی دھار کی طرح نرمی سے پھسلنے لگتی تو اللہ بخش کی آنکھوں کی پُتلیاں پھیل جائیں اور حُقّے کی نے پر اس کے ہونٹ کھُلے رہ جاتے۔ پھر دو سو گز آگے آکر

جب سائیکل سڑک سے پھسل کر پگڈنڈی پہ اُترتا تو اللہ بخش بے اختیار پکار اُٹھتا۔

"مولا تیرا شکر ہے۔"

اور چند لمحوں میں آنے والا سائیکل کو قبرستان کی کچی دیوار سے ٹکا کر اسے کسی کی موت کی خبر سناتا۔ وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے قبر کا سائز پوچھتا تو آنے والا یا تو اُسے فٹ کا حساب بتاتا یا جیب سے مڑے تڑے ہوئے کاغذ پر لپٹا ہوا دھاگا نکال کر اللہ بخش کے حوالے کرتا۔ اُس کا دل دھاگا کھولتے کھولتے اچھلتا رہتا۔ کہ نامعلوم کس سائز کی قبر تیار کرنا پڑے۔ اور اس کے کتنے پیسے ملیں۔ دھاگے کا ایک سرا ہاتھ میں پکڑ کر وہ بازو سیدھا کھڑا کرتا اور لٹکے ہوئے دھاگے کے نچلے سرے کو دیکھتا ہوا بڑے کاروباری انداز میں پوچھتا۔

"اور کب لاؤ گے جی میّت؟"

آنے والا میّت کا لفظ سن کر کانپ سا جاتا لیکن اللہ بخش خیال کیے بغیر جواب لے کر کدال سنبھالنے لگتا۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ پچھلے ایک ہفتہ سے کوئی مردہ نہیں آیا تھا۔ اور اللہ بخش کی آمدنی کا بھرپور وسیلہ بند تھا۔ پھر بارش بھی ہوتی رہی تھی۔ کوئی اللہ والا فاتحہ کو بھی نہیں آتا تھا۔ دو ایک آئے بھی لیکن اُسے کچھ دیے بغیر چلے گئے۔ وہ سوچتا تھا پچیس ہزار کی آبادی اور ایک بھی موت نہیں ہوئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کمیٹی نے کوئی اور قبرستان بنوا دیا ہو۔ اُس نے سیکرٹری کو خوش تو بڑا رکھا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے دوسرے قبرستان کی سکیم ہر دفعہ کمیٹی سے نامنظور ہو جاتی تھی۔ لیکن جہنم میں جائیں سب ڈاکٹر جو ستر اسّی سال کے کھوسٹ لوگوں کو بھی بار بار موت سے بچا لیتے ہیں اور اپنی آمدنی کے لالچ میں دوسروں کی روزی مارتے ہیں۔ اس نے گردن ہلا کر نفرت سے زمین پر تھوکا۔ پوٹلی اُٹھائی۔ اس میں سے تمباکو کی پتی نکال کر ہاتھوں میں مسلی چھوٹی سی چلم زمین پر مار کر راکھ جھاڑی۔ اس میں پتی جمائی۔ اُوپر حقّہ کی نے سے پانی کے دو قطرے

ٹپکائے اور مُنہ نلکی سے لگا کر ماچس چلم پر لگائی تیلی کا شعلہ ایسے چلم پر چپکا جیسے بچّہ کتّے سے ڈر کر ماں کی چھاتی میں چھپتا ہے۔ اللہ بخش نے "کھوں" کر کے بہت سا دُھواں مُنہ سے اُگل دیا۔ اور پکار اٹھا۔

"توبہ میری۔ اتنا مندا کبھی نہ دیکھا تھا۔ پتہ نہیں ملک الموت بھی کہیں مر گیا ہے۔"

اللہ بخش بیزار تھا کیونکہ پچھلے دس دن سے اس نے گھر میں کوئی پیسہ نہ دِیے تھے۔ ایک دو دفعہ وہ گھر گیا لیکن خالی ہاتھ۔ اس کے دس سالہ بچّے شرفو نے پتنگ کے لیے پیسے مانگے تو وُہ نہ دے سکا۔ حالانکہ پتنگ کے لیے اُس نے کبھی انکار نہ کیا تھا۔ ساری عمر اُس نے خود خوب پتنگ بازی کی تھی۔ ہر وقت قبرستان میں رہنے والا قبروں سے تو بات نہ کر سکتا تھا۔ اس کا باپ اُسے وہیں چھوڑ کر خود اِدھر اُدھر چلا جاتا۔ اور اگر اسے پتہ چلتا کہ بعد میں اللہ بخش غیر حاضر رہا ہے۔ تو وُہ اُسے شہتوت کی سیٹنٹی سے مارتا۔

"ابے ماں کے خصم! جنازے کا بھی کوئی اعتبار ہے۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ موت کے بھی دفتری ٹیم (TIME) ہیں۔"

اِس لیے اللہ بخش قبرستان میں ہی اُچک اُچک کر پتنگ اڑاتا رہتا۔ اب تو پچاس برس کی عمر میں وُہ یہ شغل چھوڑ چکا تھا۔ لیکن اپنے لڑکے شرفو کو پتنگ اُڑاتے دیکھ کر اس کا دِل بھی اُچھلنے لگتا۔ اسی لیے وُہ اسے کبھی نہ روکتا۔ بلکہ پیچ لڑانے کے ڈھنگ بتایا کرتا۔

لیکن اللہ بخش کو سب سے زیادہ دُکھ یہی تھا کہ اسے تنگ دستی کی وجہ سے بچّے کو پیسوں سے انکار کرنا پڑا۔ اِس لیے وُہ دو تین روز سے گھر بھی نہ گیا تھا۔ اور قبرستان کی کوٹھڑی میں ہی رہتا تھا۔ البتہ بیوی اور دس سالہ لڑکے شرفو کو شہر میں رکھا تھا۔ جہاں بندو چاچا ان کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ دُوسرے چوتھے روز اللہ بخش گھڑی بھر کو چلا جاتا۔ بیوی کو دھوتی کی ڈب سے روپے کھول کر دیتا۔ شرفو کے پتنگ کو دو چار ٹھنکے مارتا۔ چاچے بندو کی دکان پر چلم کے چار کش لیتا۔ بازار میں اڑوس پڑوس کی بات کرتا

اور پھر واپس قبرستان آجاتا جہاں کیکر اور دھریک کے درختوں کے جھنڈ میں اُس کی کوٹھڑی تھی۔ اور حقہ تھا۔ کسی کے مرنے کی خبر آتی تو وہ قبر کھودنے، جنازے کا انتظام کرنے، وضو کے لیے کوزے اکٹھے کرنے اور قبر پر انڈیلنے کے لیے پانی کے گھڑے بھرنے میں مصروف رہتا۔ کوئی لوگ عزیزوں کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے آتے تو وہ بھی وہاں جا پہنچتا۔ اور اس پر بیت سے قبر پر سے خشک پتے ہٹاتا۔ اور مٹی کے ڈھیلے اِدھر گرد جماتا جیسے قبرستان میں وہ سب سے زیادہ اسی قبر کا خیال رکھتا ہے۔ فاتحہ والے اسے کچھ دے دیتے تو قبر کی سب دلچسپی بھول کر انھیں وہیں چھوڑتے ہوئے کوٹھڑی میں آ کر حقہ پینے لگتا۔

اللہ بخش نے اسی کوٹھڑی میں پچاس سال پہلے جنم لیا تھا۔ جب یہاں تھوڑی سی قبریں تھیں۔ انہی قبروں کی ڈھیریوں کے سہارے اُس نے چلنا سیکھا تھا۔ ماں سے روٹھ کر یا باپ سے ڈر کر وہ پکی قبروں کے بڑے کتبوں کے پیچھے چھپ جایا کرتا تھا۔ قبرستان کے روایتی ڈر کا اُسے کبھی احساس بھی نہ ہوا تھا۔ خواہ تاروں بھری ٹھنڈی رات ہو یا بجلیاں برساتے طوفانی اندھیرے جب اُس نے شعور سنبھالا۔ تو ہر طرف قبریں دیکھیں جن میں کبھی کبھار جنازے آیا کرتے تھے۔ دس پندرہ خاموش سے آدمی اور چار پانچ شور کرتی عورتیں۔ بڑ کے پیڑ کے نیچے جنازہ رکھا جاتا۔ لائن بنائی جاتی۔ جس میں سے مولوی صاحب صرف ایک کو آگے پیچھے کرتے۔ پھر مولوی صاحب تھوڑی تھوڑی دیر بعد لمبی آواز میں چلاتے تو پیچھے کھڑے لوگ اپنی آوارہ نظریں سمیٹ کر سامنے والوں کی ایڑیاں دیکھنے لگتے۔ اس کا باپ اچھی بھلی تیار شدہ قبروں سے خواہ مخواہ مٹی اِدھر اُدھر کرتا رہتا۔ اور وہ باپ کے اشارے کا منتظر درخت کی اوٹ میں چھپا رہتا۔ جیسے ہی مردہ لحد میں اُتارا جاتا۔ اللہ بخش لپک کر چارپائی سے نئے لٹھے کی سفید چادر اُٹھا کر سیدھا ماں کو دے آتا۔ جو پہلے ہی انتظار میں ہوتی۔ مہینے ڈیڑھ بعد اس کا باپ ساری چادریں لے کر حاجی کریم اللہ کپڑے والے کی دکان پہ جاتا اور روپے ڈبے میں ڈال کر دیکھتے ہوئے

چہرے سے واپس آتا۔

خدا بخش کو احساس ہی نہ تھا کہ موت کیا ہوتی ہے؟ یہ اس کے لیے کاروبار تھا۔ دُوسروں کی موت میں اس کی زندگی تھی۔ اور ان کی زندگی سے اُس کے اپنے مرنے کا ڈر تھا اس لیے وُہ ہمیشہ چاہتا تھا کہ دُوسرے ایسے ہی مرتے رہیں۔ جیسے کہ تئیس سال پہلے ہیضے میں مرتے تھے۔ کیا دِن تھے وُہ بھی!!! ایک کے بعد دُوسرا۔ دُوسرے کے بعد تیسرا۔ سات سات مُردوں کی نمازِ جنازہ اکٹھی پڑھنا پڑی۔ اور کام سے نبٹنے کے لیے اسے علیحدہ مزدُور لگانے پڑے۔ اُن دِنوں تو وُہ خاصا افسر بن گیا تھا۔ دس مزدور اس نے رکھ لیے تھے۔ اور خود ہاتھ میں ڈنڈا لیے اُن کی نگرانی کرتا رہتا۔ انھیں کدالیں بھی اپنے پاس سے خرید کر دیں۔ اب تک وُہی اُس کے کام آ رہی تھیں۔ اِتنی آمدنی ہوئی تھی ان دنوں کہ اس نے ٹھاٹھ سے اپنی شادی رچائی۔ ورنہ تو اتنے نک چڑھے گورکن کی بیٹی کا رِشتہ اُسے کون دیتا تھا۔ اور جب بیوی پہلی مرتبہ آئی تو سب قبروں پر دِیے روشن کیے تھے۔ کیا بہار تھی وُہ بھی۔ اور اب تو نئی نئی دواؤں کی وجہ سے کوئی وبا آتی ہی نہ تھی۔ اِسی لیے وہ گزشتہ برس سے بائیں آنکھ کے موتیے کا اپریشن بھی نہ کرا سکا تھا۔

ویسے اپنے کاروبار میں اللہ بخش کافی ہوشیار تھا۔ قبرستان کے باہر بورڈ لگا تھا کہ چھوٹی میت کی قبر کی کھُدائی پانچ روپے اور بڑی قبر کی کھُدائی دس روپے ہے۔ لیکن بورڈ کے حروف اُس نے بڑی چابکدستی سے بیچ بیچ میں سے مِٹا دِیے تھے۔ اور عام طور پر پندرہ روپے فیس لیا کرتا تھا۔ اگر کوئی اعتراض کرتا تو کہتا:

"بادشاہو! اِدھر بورڈ لگا ہے خُود دیکھ لو۔"

دیکھنے والا اگر چلا بھی جاتا تو کچھ نظر نہ آتا۔ زنگ آلودہ سطح کو انگلیوں سے صاف کرنے پر اگر کسی حرف کا بچا کھچا کونا نظر آجاتا اور وہ کوشش سے پڑھ بھی لیتا تو اللہ بخش کہتا۔

"جناب! دیکھتے نہیں عرصہ سے بارش نہیں ہُوئی۔ پتھر کی طرح زمین سخت ہے۔

دو آدمی ساتھ لگائیں گے تب ہی قبر تیار ہو گی۔ اُن کو بھی تو مزدوری دینا ہے۔"

اور اگر کبھی بارش ہوئی ہوتی تو کہتا "جناب! آپ کو کیا پتہ کتنا مشکل کام ہے، مٹی اتنی نرم ہے کہ بار بار کنارے اندر گر جاتے ہیں۔ دو آدمی ساتھ لگانا پڑیں گے۔"

لاش قبر میں اُتارنے کے بعد جب سب لوگ ایک ایک مُٹھی مٹی کی پھینک دیتے تو وہ بڑی تن دہی سے کُدال چلا کر ڈھیری بناتا۔ دونوں ہاتھوں سے سطح ہموار کرتا۔ دو بٹین پانی کے چھڑکتا۔ اور مُردے کے وارث سے دس پندرہ قدم دُور چلا جاتا۔

"جناب اگر حکم ہو تو ڈھیری جمانے کے لیے دو چار دن ماشکی سے پانی ڈلوالوں۔" وہ فاصلہ کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے پکار کر کہتا۔

دو ایک بزرگ فوراً "ہاں!" پکار اُٹھتے اور وارث کی جیب کا بوجھ اور ہلکا ہو جاتا۔

"اور جناب اگر حکم ہو تو پہلی تین جُمعراتوں کو پنج تن پاک کا دیا بھی جلاؤں؟"

مُتوفّی کے خاندان سے تعلّقات کا دعویٰ کرنے والے چند لوگ فوراً ہاں ہاں پکار اُٹھتے۔ اور وارث کی پیشانی سُکڑ جاتی۔

اللہ بخش پہلے دس پندرہ دِن ہر نئی قبر کا خاص خیال رکھتا کیونکہ رشتہ دار آتے رہتے تھے۔ بعد ازاں ہر جمعرات کو اور پھر تہواروں کو قبر درست کیا کرتا۔ زندوں کا مُردوں سے واسطہ ہی اتنا ہوتا تھا۔ اس کے بعد اللہ بخش بیل یا گدھے کو قبر کے اُوپر سے گزار دیتا جس سے کنارے ٹوٹ جاتے، چوٹی دب جاتی اور ایک آدھ گڑھا پڑ جاتا۔ اگلی دفعہ آنے والا رشتہ دار خفا ہوتا۔ اور خفگی کے بعد آئندہ احتیاط کے آرڈر کی قیمت بھی ادا کر جاتا۔ نئے مرنے والوں کے گھروں سے جمعرات اور تہواروں کا کھانا علیحدہ تھا۔

اس کے مانگنے کے بھی قواعد تھے۔ مرنے والے بچّوں کی ماں سے مانگو۔ جوانوں کے باپ سے مانگو۔ ساس سے کبھی نہ مانگو۔ بوڑھوں کے سب سے بڑے بیٹے سے مانگو۔ رونے والوں کی باری ہوتی ہے۔ ایک شخص شدّت سے روتا ہے۔ اور

باقی اُسے چُپ کراتے ہیں۔ اُس کے چُپ ہونے پر دُوسرا اُس کی جگہ لے لیتا ہے۔ جو شخص بار بار روئے۔ اس سے کچھ نہ مانگو۔ کیونکہ وُہ سب سے زیادہ ہوشیار ہے اور کچھ نہ دے گا۔ ایسے وقت میں مانگو جب دینے والا دو چار آدمیوں میں کھڑا ہو۔ چالیسویں پر جتنا لے سکتے ہو لو۔ کیونکہ بعد ازاں بہت کم لوگ قبر کی خبر لیتے ہیں۔

وہ اپنی تفریح کا سامان کبھی موت سے کیا کرتا تھا۔ فلاں آدمی روتا کیسے تھا۔ جیسے آٹے کی چکّی ٹھوٹھو کر رہی ہو۔ آج پھر مولوی شبیر علی جنازے کے ساتھ آیا تھا۔ عجب طریقے سے دُعا پڑھتا ہے یہ بھی۔ جیسے رائے طوطا بول رہا ہو۔ یہ بوڑھا بھی خوب آدمی تھا۔ رونا تو آتا نہ تھا۔ خواہ مخواہ دُوسروں کو متاثّر کرنے کے لیے مُنہ بسورے رہا تھا۔ جیسے پیٹ میں درد ہو۔ کتنی مضحکہ خیز شکل بن جاتی تھی اس کی۔ اور وُہ کوٹھڑی میں بڑا حُقّہ پر مُنہ جمائے پہروں ہنسا کرتا۔ اگر کسی ساس یا سُسر کی دو بہوئیں اپنے خاوندوں سمیت آجاتیں تو اُسے بڑا لُطف آتا۔ دونوں بہوئیں ایک دُوسری سے بڑھ چڑھ کر رونے کی کوشش کرتیں۔ اور اتنا شور کرتیں کہ وُہ حُقّہ پر ہونٹ جما کر مُسکراہٹ چھپانے لگتا۔ اُس دن اُسے آمدنی بھی ہو جاتی۔ جب موٹی عورتیں قبروں سے لپٹ کر روتیں تو وُہ پیچھے کھڑا اُن کی ہلتی ہُوئی پُشت کی تھرتھراہٹ پر دل ہی دل میں ہنستا جاتا۔ جیسے آگ پر پڑی ہُوئی کیتلی کا ڈھکن اُچھلتا رہتا ہے۔

جوانی کے دِنوں میں اللہ بخش ہمیشہ اِس موقع کی تاڑ میں رہتا۔ جب برادری کی بہت سی عورتیں اکٹھی فاتحہ خوانی کے لیے آتیں۔ اُن کے سوگ کا انداز خاندانی سیاست کے تناسب سے متعیّن ہوتا تھا۔ بعض تو ایسی اداکاری کرتیں کہ پیٹتے پیٹتے بے حال ہو جاتیں بُرقعہ غائب۔ دوپٹہ پہلے بازوؤں میں اُلجھتا۔ پھر اُڑ کر سامنے والے کیکر پر جا گرتا۔ گریبان کھُل جاتے اور اللہ بخش . . . . . . دیکھتا ہی جاتا۔ بعض اوقات ان میں سے ایک آدھ غش کھا کر گر پڑتی۔ اور باقیوں کی چیخیں اسے مدد کو بلاتیں۔ وہ دوڑ کر چارپائی اٹھا لاتا۔ اور بعض دفعہ اسے خود ہی اُٹھا کر اسے چارپائی پر ڈالنا پڑتا تب

وہ کوٹھڑی میں حقہ پیتے ہوئے گھنٹوں اس موقعہ کا ذہنی طور پر مزا لیتا رہتا۔ ایک عورت سے تو اس کا معاشقہ بھی چل نکلا تھا۔ وہ دو ایک دفعہ قبر پر آ کر بے ہوش ہوئی۔ اور اللہ بخش نے اسے سنبھالا۔ اور بعد ازاں کافی عرصہ اسے بغیر بے ہوش ہوئے سنبھالتا رہا۔

اللہ بخش کے لیے موت نہ تو حادثہ تھی اور نہ المیہ۔ غمزدہ چہرے۔ اُبلتے ہوئے آنسو۔ دبی ہوئی سسکیاں۔ فاتحہ کے لیے اٹھتے ہوئے پر خلوص ہاتھ اور پھٹی پھٹی آنکھیں اس کے دل میں کوئی تاثر پیدا نہ کرتی تھیں۔ جب مردے کو لحد میں اتارنے سے پہلے کفن کھول کر چہرہ دکھایا جاتا تو ایک کہرام مچ جاتا۔ لیکن اللہ بخش اس وقت بھی قبر میں سے پاؤ پاؤ مٹی نکالتا رہتا۔ اور لوگوں کو کنارے سے پرے ہٹاتا رہتا۔ بوڑھے والدین اپنی جوانا مرگ اولادوں کی قبروں پر آئیں۔ یا معصوم بچے اپنی ماں کی تربت سے لپٹ کر "امی امی" پکاریں، یا کسی لطیف رشتے والی ہستی دنیا کی نظروں سے چھپ چھپ کر کسی ڈھیری پر چپ چاپ آنسو بہاتی رہے، وہ ان سب کی دلی حالت سے بے پرواہ پیسے بٹورنے کی فکر میں رہتا۔ قبر کھودنے میں بھی وہ کبھی ملول نہ ہوا تھا۔ بلکہ کدال چلاتے ہوئے ماہیا کے بول الاپتا رہتا۔ اور اگر کبھی زیادہ پیسوں کے ملنے کا یقین ہوتا تو ہر دو چار ہاتھ چلانے کے بعد کدال سر پر اٹھا کر قبر میں ہی ناچنے لگتا۔ اور جب لحد تیار ہو جاتی تو اندر نرم نرم مٹی پر بیٹھ کر حقہ پیتا رہتا۔ ایک دن بندو چاچا اسے پوچھتے پوچھتے قبر کے کنارے تک آ گیا۔

"او بخشا۔ تو جندگی میں ہی قبر میں گھس پڑا۔ باہر بیٹھ کر حقہ نہیں پی سکتا کیا؟"

اللہ بخش نے نتھنے پھلا کر دھواں باہر پھینکا اور کھانس کر بولا "ہماری تو جندگی ہی قبروں میں ہے چاچا۔ گڑھا کھودتے رہیں تو اپنے پیٹ کا گڑھا بھرتا ہے۔"

"تجھے ڈر بھی نہیں آتا اس میں بیٹھے بیٹھے؟"

"ڈر کاہے کا پگلے۔ تانگے کا کوچبان بھی تو رات گھر آکر گھوڑے سے دو لاڈ کر لیتا ہے۔ ہم کیوں نہ دم بھر کو لاڈ کریں اس سے۔"

اسی طرح الہ بخش کی ساری عمر قبروں سے لاڈ کرتے گزری تھی۔ لیکن پچھلے ہفتہ بھر سے قبر کھودنا ملی ہی نہ تھی۔ وہ پیار کس سے کرتا۔ سارا سارا دن اونگھتے گزر جاتا۔ چلم پی پی کر اس کی چھاتی پکنے لگی تھی۔ سڑک کی طرف دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔

"یا مولا کسی کو بے موت ہی مار ڈال۔" قبل دوپہر کا تیز سورج اس کی پیشانی پر چمک رہا تھا۔

سہ پہر کے قریب اللہ بخش حقہ سینے سے چمٹائے دھیرے دھیرے کش لے رہا تھا۔ اُس کی نظریں سڑک کی طرف لگی تھیں۔ اور اُنگلیوں میں گھاس کے تنکے مروڑ رہا تھا۔ معاً ایک سائیکل سوار تیزی سے موڑ مڑا۔ اللہ بخش کے ہونٹ کش لگانے سے پہلے کھلے رہ گئے۔ سائیکل آگے آرہی تھی۔ اور وہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ پانچویں کیکر کے پاس آکر سوار نے پیڈل روک لیے۔ اللہ بخش کا سانس رُک گیا...... سائیکل پھسلتی آئی اور...... اور...... سڑک سے ہٹ کر پٹڑی پہ اُتر آئی۔

"شکر ہے مولا تیرا۔" اللہ بخش اُچھل پڑا "سن لی تو نے مجھ غریب کی۔"
سائیکل سوار قریب آیا لیکن اتنا نہیں۔ وہ پندرہ سولہ برس کا لڑکا تھا۔ دروازے کے پاس آکر اُس نے تیزی سے پیڈل اُلٹے گھمائے اور موڑ مڑتے ہوئے ہاتھ ہلا کر بولا۔

"جلدی سے چار فٹ کی قبر تیار کر دو۔"

اور یہ جا وہ جا۔

اللہ بخش کے ہاتھ سے حقہ لڑھک گیا۔ تھوڑا اُٹھتے ہوئے وہ پکارا۔

"ارے سن تو۔"

لیکن لڑکے نے مُڑ کر ہاتھ ہلایا اور پکارا:

"جلدی کرو۔"

پھر تیزی سے آٹا گوندھنے کی طرح پیڈل مارتا نکل گیا۔

لمحہ بھر کو اللہ بخش کو غصّہ آیا۔ مگر پھر ایک دم اُس پر خوشی غالب آگئی۔ ساری لئے گوں میں ایک دم پھُرتی جاگ پڑی۔ اور وُہ کدال اُٹھا کر قبرستان کے سِرے کی طرف لپکا۔ زمین پر کدال جما کر دونوں سروں پر نشان لگایا۔

"یہ تین فٹ ہوتے!" وُہ بولا۔

پھر کدال کا اگلا پھل ٹِکا کر دُوسرا نشان لگایا۔

"یہ پُورے چار اور۔۔۔۔۔۔ یہ ہوئی ایک بالشت۔" نشان لگا کر اُس نے ہاتھوں میں تھوکا اور جب کدال اُٹھانے لگا تو مٹول سا ہو گیا۔

"مولا جی سات روز بعد بھیجا بھی تو ایک دانہ ہی۔"

دانہ سے مُراد بچہ کی لاش تھی۔ اور یہ چیز مایوس کُن تھی کیونکہ اللہ بخش کا زندگی بھر دستور رہا تھا کہ بچّے کی میّت کی قبر کی کھُدائی کے علاوہ اور کوئی بخشش نہ لیا کرتا تھا۔

"جس گھر کا بوٹا ہی ٹوٹ گیا جی۔ اُس کو اور کیا توڑیں۔"

وُہ اپنے واقف لوگوں سے کہا کرتا۔ اِس لیے آج وُہ زیادہ سے زیادہ پندرہ روپے لے سکتا تھا۔ جو بہت کم تھے۔ اپنی بیوی کو خرچے کے علاوہ شرفو کو پتنگ کے لیے تو کچھ دینا تھا۔

اللہ بخش کے ہاتھ جھپا جھپ چلتے گئے۔ کدال سر پر اُٹھا کر دونوں بازو پورے زور سے زمین پر مارتا اور رُکا ہُوا سانس بآوازِ بلند چھوڑتا۔ ایک گھنٹہ میں اس نے قبر تیار کر لی۔ پہلے کدال پر جما جما کر مٹی باہر پھینکی اور پھر ہاتھوں سے سمیٹ کر باہر ڈالنے لگا۔ اب کام کی تیز رفتاری گزر جانے کے بعد اس کو تھوڑا تھوڑا غصّہ

آنے لگا اور صرف بچہ کیوں مرا جب کہ اُسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ دل ہی دل میں جھنجھلاتا رہا کہ اللہ کے کارخانے میں کیا بوڑھوں کی کمی تھی۔ جو عزرائیل کو بچہ ہی ملا۔ اور پھر اُس نے فیصلہ کیا کہ بلا سے دانہ ہی ہو۔ لیکن آج تو میں کبھی بخشش نہ چھوڑوں گا۔ جب مولا ہم پر رحم نہیں کرتا۔ تو ہم دوسروں پر کیوں کریں۔ یہ فیصلہ کر کے اُس نے دھم سے کدال کو زمین میں دھنسا دیا۔ اور بڑے اعتماد سے حقّہ میں چلم بھرنے لگا۔

اتنے میں بندو چاچا آتا دکھائی دیا۔

"ادھر ہی آجاؤ چاچا۔ چلم بھی تیار ہے۔" اُس نے ہاتھ ہلا کر پکارا۔ چاچا چلتا چلتا وہیں پہنچ گیا۔ اللہ بخش کش لگا رہا تھا۔ اس لیے بولا نہیں۔ بندو نے قبر کا جائزہ لیا اور بولا:

"قبر بن گئی ہے؟"

اللہ بخش نے اس غیر ضروری سوال کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ اور حقّہ کی نلکی بندو کی طرف موڑتا ہوا کھوں کھوں کرنے لگا۔

"آؤ بخشا ذرا شہر چلیں۔"

"واہ شہر کیسے چلیں ابھی تو جنازہ آنے والا ہے۔"

"ہاں ہاں وہ جنازہ ہی تو لانا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اب کیا کہوں بخشا۔ اللہ کی رضا ہے۔ نثر و پتنگ اٹھاتے اُڑاتے کوٹھے سے گر کر مر گیا ہے۔ میں نے لڑکے سے کہا تھا کہ اللہ بخش کو نہ بتانا میں خود ہی آ کر بتاؤں گا۔"

اللہ بخش ایک دم سُن سا ہو گیا۔ اسے پہلی دفعہ پتہ چلا موت کیا ہوتی ہے۔ وہ ایک دم چیخ مار کر اُٹھا اور کدال اٹھا کر دھما دھم مٹی قبر میں گرانے لگا۔

(۱۹۶۲ء)

پاخدا

جیسے ہی وہ موڑ مڑا سامنے ایک غار نظر آئی اور مسافر خوشی سے کھِل اُٹھا۔
دہانے پر کھڑے ہو کر وہ پہلے کھنکارا کہ اگر کوئی آدمی اندر ہو تو بول پڑے۔۔۔
قدرے توقف کے بعد اس نے ایک پتھر اُٹھا کر اندر پھینکا کہ اگر کوئی جانور ہو تو باہر نکل آئے۔ لیکن پتھر کسی دیوار سے ٹکرا کر دھپ سے گرا اور شام کی خوش گوار خنکی اپنے کانوں پر محسوس کرتا وہ چند لمحے سُنتا رہا۔

اندر کوئی نہ تھا۔ قدرے محتاط ہو کر وہ دہانے میں گھس گیا۔

ارے!!۔۔۔ سامنے کوئی کھڑا تھا۔۔۔۔ وہ ٹھٹکا۔۔۔۔ اور پھر مسکرا پڑا۔
اُس کی پشت پر سورج غروب ہو رہا تھا۔ جس کی سنہری روشنی کا گول چندوا دہانے سے گزر کر سامنے والی دیوار پر چمک رہا تھا۔ اور اس کے بیچ اس کا اپنا سایہ کھڑا تھا جسے

دیکھ کر وہ ٹھٹکا تھا۔ دیوار کی روشنی سے پوری غار پو پھٹتے آسمان کی طرح تاریک اجالوں سے بھری تھی اور اُس نے دیکھا کہ وہ کافی کشادہ غار ہے۔ جس کے فرش پر کنکریاں، مٹی اور ریت بکھرے پڑے ہیں۔ اُس نے سگریٹ لائٹر جلایا اور سب کونوں کو دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ کہیں سانپ وغیرہ کا بل نہ ہو۔ پھر اپنی گٹھڑی ایک کونے میں ڈال کر وہ باہر نکل آیا اور غار کے دہانے میں کھڑا ہو کر نیچے وادی دیکھنے لگا۔

اس کے سامنے سپین کی سرزمین پھیلی ہوئی تھی۔ اپریل ۱۹۶۰ء کے سورج کا سنہری طشت بحر الکاہل کے نیلے پانی میں غوطہ لگانے کو تھا۔ اس کا نچلا کنارہ مٹیالا پڑ گیا تھا اور وہ دوری کے باوجود ایسے بڑا بڑا اور قریب لگ رہا تھا۔ جیسے تاروں کے اندھیرے میں کسی چینی عورت کا گورا چٹا چہرہ بالکل آپ کے چہرے پر جھکا ہو۔ کبھی کوئی پرندہ اپنے سبک جسم کا ترشا ہوا تاریک عکس دکھاتے ہوئے سورج کے سامنے سے گزر جاتا۔ نیچے پہاڑی کی ڈھلان پر رنگ برنگے چوکور ٹکڑے کھیت کسی فقیر کی رضائی کا نقشہ بنا رہے تھے۔ کہیں چٹانیں اُبھر تیں، کہیں درختوں کے جھنڈ اس نمونے میں جدت پیدا کرتے اور کہیں کوئی ننھی سی پگڈنڈی لہرا کر اپنی ایک قوس دکھاتی اور پھر چنچل کنواریوں کی طرح لہرا کر چھپ جاتی۔ مسافر کی نظروں نے اُچک اُچک کر پہلے ایک گرجے کا مینار ڈھونڈا، پھر سفید چٹان، صنوبر کے بڑے درختوں کا جھنڈ اور ایک نالے کا ٹوٹا ہوا پل۔ وہ اس راستے کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس پر چلتا چلتا وہ اس غار تک پہنچا تھا۔ آج سارا دن اُس پر مایوسی چھائی رہی تھی کہ رات نہ معلوم کہاں گزرے گی۔ کیونکہ وہ اگلے شہر کے فاصلے کے بارے میں غلط اندازہ کر چکا تھا۔ لیکن غار دیکھ کر اسے پریشانی سے نجات مل گئی۔

کافی دیر کھڑا وہ سمندر کی طرف سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے اپنے چہرے پر سہتا رہا جو کبھی وادی میں نالے کے پانی کا شور اُٹھا کر اس کے کانوں میں ڈال دیتے اور کبھی کسی جانور یا پرندے کی آواز۔ جب سورج کی گلابی طشتری اُفق میں

بالکل ڈوب گئی اور بادلوں کے سُرخ جھالر سُرمئی اندھیرے میں تحلیل ہونے لگے تو وہ غار میں واپس آیا۔ ایک برقی لیمپ روشن کیا۔ اپنے جھولے میں سے سینڈوچز اور روسٹ مُرغ نکال کر کھانے لگا۔ فارغ ہو کر وہ ذرا دیر ٹہلتا رہا۔ اور پھر مذہبی کتاب نکال کر پڑھتا رہا۔ کافی دیر بعد جب غار کے دہانے سے اُسے تارے چمکتے نظر آئے اور تاریک فضا میں جانوروں کی آوازیں، درختوں کی سائیں سائیں اور گرتے ہوئے پتھروں کا شور سحر زدہ انداز میں وقتاً فوقتاً اُبھرنے لگا۔ تو اس نے گٹھڑی میں سے ایک جال نکال کر غار کے دہانے پر تن دیا اور خود لیٹ کر سو گیا۔ تھوڑی دیر بعد غار اس کے خرّاٹوں سے بھر گئی۔.........

آج سے سولہ سو برس پیشتر تیسری صدی عیسوی میں بھی کوئی اس غار میں آیا تھا۔ وہ ایسی ہی حسین شام تھی اور اس وادی کا حسن شام کے دُھندلکے اور سُورج کے سنہرے قمقمے سے ایسا ہی سحر انگیز تھا۔ لیکن آنے والے کو اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ اس مسافر کی طرح غار کے دہانے پر کھڑا ہو کر ماحول سے لُطف اندوز ہو سکتا۔ وہ اس وقت بیس میل کا فاصلہ بھاگ کر، رینگ کر، چوپایوں کی طرح چل کر اور چھپ چھپا کر طے کر کے اس غار تک پہنچا تھا۔ اور خوف سے پھیلی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا سیدھا غار میں جا گھسا تھا، جہاں ٹھٹھری ہوئی بلّی کی طرح ایک کونے میں دبک کر بے سُدھ پڑا رہا۔ اور اپنے پسینے میں شرابور کانپتے ہوئے ہاتھوں میں انجیل تھام کر اُکھڑے سانسوں میں دُعا مانگتا رہا۔

"یا خدا! یسوع مسیح کی برکت سے مجھے محفوظ رکھنا۔ مجھے ان کافروں سے نجات دلا اور توفیق دے کہ میں ان کو تیرا سیدھا راستہ بتا سکوں!"

اُسے یقین تھا کہ وہ تعاقب کرنے والے سپاہیوں سے بچ گیا ہے اور آج رات پہلی دفعہ جیل سے باہر آ کر سُکھ کی نیند سوئے گا۔ جہاں آدھی رات کے وقت سوتے میں اس کے جسم پر گرم اور پھر ٹھنڈا پانی ڈال کر کوڑے لگانے والا جلاد کوئی

نہ ہوگا۔ اُس نے انجیل کو سینے سے لگا لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ جیل سے بھاگا ہُوا قیدی تھا، جہاں وہ موت کی سزا کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے اِس لیے قید کیا گیا تھا کہ وُہ عیسائی ہو گیا تھا اور عیسائیت رومن لوگوں کی ہسپانیہ تک پھیلی ہُوئی سلطنت میں خلافِ قانون قرار دی گئی تھی۔ تمام عیسائیوں کو قتل کرنے یا مذہب سے مُنکر کرنے کی سرکاری تحریک بہت زوروں پر تھی۔

پناہ گزین بظاہر تو خاموشی سے دبکا ہُوا تھا لیکن اس کا دِل دھڑ دھڑ ہل رہا تھا۔ رواں رواں کان بنا ہُوا تھا اور باہر سے آنے والی ہر آواز کو وُہ سانس روک کر سُنتا۔ کافی دیر بعد جب رات گہری پڑ گئی تو اُسے کچھ سکون آنے لگا۔ اور قریب ہی جھینگر کی الاپ اور دُور سے گیدڑ کی للکار سُننے کے قابل ہو گیا۔ بڑی آہستگی سے وُہ ہولے ہولے لیٹا، دم سادھے ہُوئے ایک پتّھر کو سر کے نیچے رکھا اور انجیل سینے پر رکھ کر تھوڑی دیر بعد نیند میں جھکولے کھانے لگا۔

ایک دردناک چیخ غار کو ہلا گئی۔ لیکن اس کی گُونج ختم ہونے سے پیشتر مُسافر مر چکا تھا اور غار میں شکاری کُتّوں کی مسرور غُرّاہٹ گونج رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد تین رومن سپاہی مشعلیں اُٹھائے غار میں داخل ہُوئے تو کُتّے لہو بھرے جبڑوں میں مُسافر کی بوٹیاں پکڑے گرم گرم خُون کے فواروں میں لوٹ رہے تھے اور اس کا بچا کھچا زخمی جسم ماہئ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر اُچھل رہا تھا۔ تینوں سپاہی خُوشی سے کھڑے ہو کر دیکھتے رہے۔ جب جِسم تڑپ کر ان کے قریب آتا تو وُہ پاؤں سے پرے ہٹا دیتے۔ جب وُہ ٹھنڈا ہو گیا اور غار میں ہڈیوں کے چبانے کی آوازیں گونجنے لگیں تو ایک سپاہی، جو عین اسی جگہ کھڑا تھا جہاں مُسافر نے خُدا سے دُعا مانگی تھی۔ اپنے ہاتھ اُوپر اُٹھا کر دُعائیہ انداز میں کہنے لگا۔

"یا خُدا! ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ تیری مدد رہی تو سب مُرتد جلد ہی ختم ہو جائیں گے۔"

فرق صرف یہ تھا کہ پہلے آدمی نے انجیل کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اور اس پر عقیدت سے سر جھکا کر خدا سے دعا مانگی تھی اور دوسرے نے اسی انجیل کو پاؤں کی ٹھوکر سے پرے پھینک کر اپنے خدا سے یہ الفاظ کہے تھے۔

پانچ سو برس بعد یہ غار پھر آباد ہوئی۔

آٹھویں صدی عیسوی کا آغاز تھا۔ سپین میں ہلال اور صلیب کے خونچکاں ٹکراؤ کی جھنکار سارے یورپ میں گونج رہی تھی۔ جبل الطارق سے مسلمانوں کی تھوڑی سی جمعیت اپنے جہاز جلا کر ہسپانیہ کی سرزمین پر پھیلتی جا رہی تھی۔ اور عیسائیت کا جمِ غفیر اس کے مقابل تھا۔ دونوں فریق خدا کو خوش کرنے کے لیے لڑ رہے تھے۔

ایک چلچلاتی ہوئی دوپہر کو اس وادی میں چار سوار سرپٹ گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ کھیت۔ پگڈنڈی، نالہ اور بند، جو بھی سامنے آتا اندھا دھند پار کر جاتے۔ درختوں کے نیچے سے جھک کر، جھاڑیوں کے اوپر سے پھلانگ کر، چٹانوں کے کونوں سے کترا کر وہ گولی کی طرح اُڑ رہے تھے، زندگی اور موت کا سوال تھا۔ یہ عیسائی تھے جو قریب کے میدانِ جنگ سے مسلمانوں سے شکست کھا کر بھاگے تھے اور اب درجن بھر عرب ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ وادی کے نشیب و فراز میں لہراتے ہوئے راستوں پر دونوں گروہ ٹوٹتے ہوئے تاروں کی طرح لپک رہے تھے۔ ہوا زنّاٹے بھر رہی تھی۔ ماحول اُڑدھا سا تھا۔ گھوڑے پسینے سے شرابور تھے۔ اور ان کے سانسوں کی دھونکیاں ٹاپوں کے شور سے زیادہ بلند تھیں۔ اتنے میں ایک موڑ پر آ کر ایک سوار کا گھوڑا اچک کر گرا۔ دوسرا اس سے ٹکرایا۔ اور ٹھوکر کھا کر اُلٹا۔ دونوں سوار نیچے گرے۔ ایک تو بچ گیا لیکن دوسرا سڑک کے کنارے سے نیچے گہرے کھڈ میں لڑھکتا چلا گیا۔

چلچلاتی دھوپ، تھکن سے چور، پیاس سے زبانیں لٹکتی ہوئیں۔ پسینے کے دھارے آنکھوں اور منہ میں گھستے ہوئے اور ہر لحظہ قریب آتی ہوئی تلواریں۔ وقت بڑا

نازک تھا بھٹی بھٹی سراسیمہ آنکھوں سے چارسُو نظر دوڑائی۔ ہوتے ہر طرف مُنہ پھاڑے کھڑی تھی۔ اِتنے میں ایک کی نگاہ غار پر پڑی اور تینوں ترکش سنبھالتے اندر بھاگے۔

تعاقب کرنے والے بھی چشم زدن میں موقعے پر پہنچ گئے۔ گھوڑے کی لاش نے نشان دہی کر دی اور انھوں نے غار کا محاصرہ کر لیا۔ اُن میں سے ایک ڈپٹ کر بولا۔

"عیسائی فوج کے سپاہیو! تم اب محصُور ہو۔ ہم ایک دفعہ پھر کہتے ہیں کہ ہمارا تم سے کوئی جھگڑا نہیں۔ ہم اللہ کے دین کا پیغام لے کر دُنیا میں گھوم رہے ہیں اگر تم اسلام قبول کر لو تو ہمارے بھائی ہو۔"

غار کے اندر سے آواز آئی۔ "عرب لٹیرو! اللہ کا دین اور اللہ کا پیغام آج سے سات سو برس پہلے یسوع مسیح ہمارے پاس لے کر آئے تھے۔ تم اس پر قائم رہو اور خدائے یسوع مسیح کی امان میں آجاؤ۔"

"اگر تم اللہ کا پیغام نہیں سُنتے تو جنگ کا پیغام سُنو۔ باہر نکل آؤ اور ہتھیار ڈال دو۔ ورنہ ابھی تمھارا خاتمہ ہو جائے گا۔"

جواب میں اندر سے ایک تیر سن سے نکلا۔ اور ایک گھوڑے کی چھاتی میں پیوست ہو گیا۔ گھوڑا چکرا کر گرا۔ اس کا سوار طیش میں آکر اندر گھسنے لگا۔ لیکن ایک ساتھی نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ پھر سب نے مِل کر غار کے دہانے میں تیروں کی بارش کر دی۔ اور تلواریں سونت کر اندر گھس گئے۔

تھوڑی دیر بعد دُشمن کا خاتمہ کر کے وُہ اپنے ایک زخمی ساتھی کو گھسیٹتے ہوئے باہر نکلے۔ اس کی گردن کے قریب گہرا گھاؤ تھا۔ خُون میں لت پت، بالکل نڈھال۔ ایک ہمراہی نے اُسے زمین پر لٹا دیا اور سر گھٹنے پر رکھ لیا۔ اس کی آنکھیں پتھرا رہی تھیں۔ چھاگل کھول کر چند چھینٹے پانی کے مارے تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

"عبداللہ...... عب د اللہ...... م میری...... دائیں جیب میں..... میر..... میرے...... نام کی مُہر ہے..... یہ نک نک نکال لو

..... اور ہر مہینے میری بوڑھی ماں . . . . کو خط لکھ دیا کرنا کہ میں . . . . . زِ ز
زِ زندہ ہوں ۔ نیچے یہ مُہر لگا دیا کرنا ۔ اُف . . . . . ھائے میں مرا . . . . ہائے . .
میری بوڑھی ماں . . . . کا اور . . . . کوئی سہارا نہیں . . . اسے معلوم . . . .
نہ ہونے پائے کہ میں مر گیا ہوں . . . . . ورنہ وہ وہ وہ پپ پاگل ہو جائے گی ۔
اسے پتا . . . . نہ . . . . لگے . . . . کہ . . . . ۔"

اس کے ہونٹ کانپتے رہے ۔ لیکن آواز غائب ہو گئی اور پھر وہ ایک دم
کسمسا کر ٹھنڈا ہو گیا ۔

عبداللہ اپنے دوست کے الفاظ پر رو دیا ۔ باقی ساتھی بھی آبدیدہ ہو گئے ۔
پھر اُنھوں نے نمازِ جنازہ پڑھ کر اسے دفن کیا ۔ اور عبداللہ ہاتھ اُٹھا کر دُعا
پڑھنے لگا ۔

"یا خدا اس نے تیری راہ میں جان قربان کی ۔ اس کی بوڑھی ماں کو صبر دے
اور اسے اپنے وعدے کے مُطابق بہشت بریں میں جگہ دے ۔"

اور وہ فتح کی خوشی بھول کر بوجھل قدموں سے واپس چلے گئے ۔

رات کا اندھیرا پڑنے پر اس علاقے کے چرواہے ایک پادری کو بُلا لائے جس
نے غار میں آ کر عیسائیوں کی لاشوں پر مُقدس پانی چھڑکا ، صلیب کا نشان لگایا اور ہاتھ
اُٹھا کر باآوازِ بلند بولا ۔

"یا خُدا انھوں نے تیری راہ میں اپنی جانیں لٹائی ہیں ۔ اپنا وعدہ پُورا کر اور
ان کو جنّت میں جگہ دے ۔"

پندرھویں صدی کے آخری سالوں میں یہ غار پھر آباد ہوئی ۱۴۹۲ء میں شاہ
فرڈی نینڈ اور ملکہ ازابیلا نے غرناطہ کو فتح کر کے سپین میں مُسلمانوں کا آخری مورچہ
توڑ دیا تھا ۔ اور اب شاہ چارلس کے وقت اِن کوئی زیشن (INQUISITION)
کی سرکاری تحریک زوروں پر تھی ، جس کا مقصد مُسلمانوں کا نام مٹانا تھا ۔ خواہ وہ عیسائی

بنا لیے جائیں یا تہ تیغ کیے جائیں۔ ہزاروں لوگ بظاہر عیسائی بن گئے تھے لیکن درپردہ مسلمان تھے۔ حکومت کی خفیہ پولیس ان کی تلاش میں رہتی تھی اور پکڑے جانے پر زیادہ تر لوگوں کو موت سے ہمکنار ہونا پڑتا تھا۔

ایسا ہی ایک خاندان اس غار میں پناہ گزین تھا۔ درمیانی عمر کی ایک عورت اپنے دو بچوں کو لے کر وہاں چھپی ہوئی تھی۔ اس کا شوہر سارا دن شہر میں کام کرتا۔ اور رات گئے واپس آتا۔ وہ ہر روز مختلف راستوں سے واپس آتا تاکہ اُن کی کمین گاہ کا علم نہ ہو جائے، اور ہر روز بھیانک خبریں لاتا۔ کہ آج فلاں بازار میں اتنے مسلمانوں کو زمین پر باندھ کر گھوڑوں سے کچل دیا گیا ہے۔ آج فلاں میلے میں بچّوں کو ہوا میں اچھال کر ان پر ہوائی تیر اندازی کے مقابلے کیے گئے ہیں۔ آج فلاں علاقے میں ہمارے ماموں اور ممانی کی لاشیں اُلٹی لٹکائی گئی ہیں۔

ایک پہر دن گزرا ہوگا۔ بچّے غار کے سامنے کھیل رہے تھے۔ باپ تھوڑی دیر پہلے شہر جا چکا تھا۔ ماں اندر بیٹھی کچھ پکا رہی تھی اور باہر سے بچّوں کی آوازیں سُن کر اپنی مصیبت بھول چکی تھی۔

اتنے میں چھ سالہ فوزیہ اندر بھاگی آئی۔

"امّی ۔ ۔ ۔ ۔ امّی ۔ ۔ ۔ ۔" اس کی بلوری ہنسی کھنک رہی تھی، "یہ دیکھیں کیا ہے؟"

وہ ایک تیتری ماں کو دکھانے لگی۔ جس کے پر اُس نے بڑی احتیاط سے اپنی ننھی سی اُنگلیوں میں پکڑ رکھے تھے۔ اور وہ بڑی تیزی سے ٹانگیں ہلا رہی تھی۔ فوزیہ اپنے چھوٹے سے ہاتھ کی اوٹ میں اُسے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں نے شکیل سے چھینی ہے۔ ھی ھی ھی۔" وہ خوشی سے اُچھلنے لگی۔ "اس نے اُسے پکڑا تھا۔ اور پھونک مار کر پروں سے مٹی اُڑا رہا تھا۔ کہ میں نے پیچھے سے جا کر چپکے سے ایسے کر کے چھینی۔ (وہ چھیننے کے طریقے سے ہاتھ ہلا کر بولی) وہ میرے

پیچھے بھاگا۔ میں پودوں میں گھس گئی۔ اس نے سمجھا میں تالاب کی طرف گئی ہوں۔ وہ ادھر بھاگا تو میں چھپ کر اِدھر بھاگ آئی۔ ہی ہی ہی۔" بچّی ماں کی گود میں بیٹھ کر ہنسنے لگی۔

"نہیں بیٹی۔ مِل کر کھیلا کرتے ہیں۔ ایک دُوسرے کی چیزیں چھین کر جھگڑا نہ کیا کرو۔"

"واہ بھلا!" بچّی ماں کی گود میں مچل کر بولی، "کل میں نے چڑیا پکڑی تو بھلا شکیل نے کیوں چھین کر اُڑا دی؟"

اور تِتلی کو مُنہ کے پاس لا کر اس کے پروں کو سہلانے لگی۔

اِتنے میں کھٹکا ہُوا تو وُہ کود کر اُٹھی اور جلدی سے سرگوشی میں بولی "امی شکیل کو نہ بتانا۔" اور جھٹ سے ایک صندُوق کے پیچھے چھُپ گئی۔

ماں مُسکرانے لگی، کیونکہ فوزیہ اپنی دانست میں چھُپ گئی تھی لیکن اس کا ننّھا سا پاؤں اور ٹانگ دکھائی دے رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد بچّی نے بے چینی سے باہر جھانکا۔ "شکیل نہیں آیا۔ امّی۔" وہ چاہتی تھی کہ شکیل اسے ڈھونڈے اور نہ پا کر پریشان ہو۔ آہستہ سے اُٹھ کر وہ غار کے دروازے تک گئی اور پھر کوئی شک پڑتے ہی جلدی سے بھاگ کر چھُپ گئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وُہ اپنے مورچے سے ننّھا سا ناک اور ایک شوخ آنکھ نکال کر دیکھ لیتی اور پھر کہتی "امی شکیل کو نہ بتانا۔"

وہ کافی دیر وہاں پڑی شکیل کا اِنتظار کرتی رہی۔ پھر ایک دم بولی " امّی شکیل کہیں رو رہا ہے۔"

"کہاں؟" ماں حیرت سے بولی۔ کان لگا کر سُنا تو اپنے بیٹے کے رونے چیخنے کی آواز سُنائی دی جو آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ وُہ اُٹھی اور دروازے سے باہر جھانکنے لگی۔ فوزیہ بھی بھاگ کر ماں کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے دونوں بازو پیچھے باندھ کر تِتری کو چھپا لیا تھا۔

اِتنے میں ایک ہسپانوی سپاہی شکیل کو اُٹھائے آتا نظر آیا۔ بچہ اس کے بازوؤں

میں کلبلا رہا تھا۔ اور روتے چیختے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ "امّی مجھے بچاؤ! امّی مجھے چھڑاؤ!"

لیکن سپاہی اُسے مضبوطی سے پکڑے تھا۔ وُہ عورت کو دیکھ کر سیدھا اسی طرف آگیا۔ وُہ بھاگ کر بچّے کو چھُڑانے آگے بڑھی۔

سپاہی نے فوراً اس کا بازو پکڑ لیا اور مُنہ میں وِسل ڈال کر زور سے بجائی اسے سُنتے ہی پانچ چھ سپاہی بھاگے ہُوئے آئے اور ان کو گھیرے میں لے لیا۔ اس نے بچّے کو دُوسرے سپاہی کے سپرد کیا اور عورت کو گھسیٹ کر غار کی طرف لے چلا۔ بچّی سہم کر ماں سے چمٹ گئی۔

غار میں آکر سپاہی نے ڈپٹ کر عورت سے پُوچھا۔

"تم مسلمان ہو؟"

وُہ خاموش رہی۔

"بولتی کیوں نہیں؟" اُس نے زور سے طمانچہ اس کے مُنہ پر مارا۔

عورت چکرا کر گرنے لگی۔ پھر سنبھلی۔ اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو نفرت اُبھری لیکن بچّی پر نگاہ پڑتے ہی دب گئی اور اسے ساتھ لپٹاتے ہُوئے وُہ بولی:

"نہیں۔"

"ہُوں!! ناہیں!!" سپاہی نے سخت نظروں سے دیکھتے ہُوئے الفاظ کھینچ کر نقل اُتاری۔

"تلاشی لو اس غار کی۔" اُس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔

تین چار آدمی اندر گھُس گئے۔ سب چیزیں اُتھل پتھل کر ڈالیں۔ تھوڑی دیر بعد قرآن کے اوراق اُٹھا کر باہر لے آئے اور سردار کو پیش کیے۔

سردار نے فاتحانہ مسکراہٹ سے عورت کی طرف دیکھا۔

"تم لوگ ہمیں دھوکا نہیں دے سکتے۔ تمھارا خاوند آج صبح راستے میں گرفتار

ہو چکا ہے۔ شام تک اُسے مُہلت ہے کہ وہ عیسائی بن جائے۔ یہی مُہلت تمہیں بھی ہے۔"

خاوند کی گرفتاری کا سُن کر عورت کانپ اُٹھی۔ بچّی کو اُٹھا کہ اس نے زور سے اپنے ساتھ بھینچ لیا اور ڈر کر پیچھے ہٹنے لگی۔

"آج شام تک تمہاری غار پہ پہرہ رہے گا۔ شام کو میں آؤں گا اور تمہیں خدا کی امان میں لے آؤں گا۔"

"نہیں نہیں۔" وہ عورت چلّائی "میں عیسائی نہیں بنوں گی۔"

"بکواست" وہ دھاڑا، "یہ بھی تم پر کرم کر کے تمہیں شام تک مُہلت دے دی ہے، ورنہ ابھی تمہارے خاوند کے ساتھ تمہیں قید خانے میں لے جاتا۔"

عورت بالکل بغاوت پر تُل گئی۔ "مجھے لے چلو اس کے پاس۔ لے چلو قید خانے میں۔ مجھے ہزار شام کی مُہلت بھی دے دو تو میں پھر بھی اسلام نہیں چھوڑوں گی۔ جو چاہے کر لو۔"

"جو۔ چاہے۔ کر لو۔" سردار غُصّے سے کپکپایا "جانتی ہو مجھے کتنے اختیارات ہیں؟ مجھے حُکم ہے کہ جو مُسلمان نظر آئے اُسے قتل کر ڈالوں۔ لیکن میں تم پر ترس کر رہا ہوں کہ شام تک شاید تمہیں خُدا ہدایت دے دے اور تم صحیح راستے پر آجاؤ۔ خاوند کی فکر نہ کرو۔ اگر وہ بھی تمہاری طرح ہٹ دھرم ہے تو صُبح سویرے تک اس کی ہڈیاں پس جائیں گی۔ اور پھر..... (اس کی نگاہیں مُسکرائیں) اگر تم شام تک صحیح فیصلہ کر لو تو تمہارے جیسی موہنی عورت کو خاوند کی کوئی کمی نہیں۔ جو اَب تمہیں مُہلت دے سکتے ہیں وہ تم سے شادی بھی کر سکتے ہیں۔" وہ معنی خیز انداز میں مُسکرایا۔

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ مجھے شام تک مہلت نہیں چاہیے۔ مجھے بے شک ابھی گرفتار کر لو اور جیل لے جاؤ۔ چاہے ابھی مار ڈالو....."

اور سردار کے چہرے پر نئی چمک دیکھ کر وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ اور اسے

حیرت سے دیکھنے لگی۔

"نہیں مانے گی!!" سردار چلّایا، "شام تک سوچ لے۔ اور میں اس کا انتظام کیے دیتا ہوں کہ شام تک اس کے علاوہ اور کچھ سوچ ہی نہ سکو۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے گروپ کی طرف گیا۔ شکیل کو دُوسرے سپاہی سے لے کر زمین پر گرا دیا۔ اور ایک ہی وار میں گردن کاٹ دی۔

عورت چیخ مار کر آگے بڑھی۔ فوزیہ سہم گئی۔ لیکن سپاہیوں نے دونوں کو پکڑ لیا اور قریب نہ آنے دیا۔

دو سپاہیوں کو سردار نے پاس بُلایا اور بولا "اِس عورت کو غار سے نکلنے نہ دو۔ بچّے کی لاش غار کے سامنے رکھ دو۔ جہاں سے یہ سارا دن دیکھ سکے، تاکہ اسے فیصلہ کرنے میں سہولت ہو۔ میں شام کو آؤں گا۔"

دو سپاہیوں کو چھوڑ کر باقی لوگ چلے گئے۔

سامنے بچّے کی خُون آلودہ لاش — سر پر دشمن کا سنگین پہرہ۔ گود میں سہمی ہوئی معصوم بچّی۔ موت کے چُنگل میں پھنسا ہُوا بے بس خاوند — زخمی ماں تا کی بیتاب تڑپ — پکّے عقیدے کی مضبُوط بندش — اکیلی جان کس کس کا خیال کرتی! ہمک ہمک کر بچّے کے لاشے کی طرف جاتی تو سپاہی تلواروں کی نوکوں سے اندر دھکیل دیتے۔ خُود تو مر بھی خُوشی سے جاتی۔ لیکن فوزیہ کا کیا ہوگا؟ یہی سوچ کر پھر اندر چلی جاتی اور بچّی کو لپٹا لیتی، جو بالکل گُم سُم پھٹی پھٹی نظروں سے بھائی کو مُسلسل دیکھ رہی تھی، نہ آنکھ میں آنسُو، نہ چہرے پر سوزنا۔ پتّھر کا بُت بنی ٹکٹکی لگائے بیٹھی تھی۔ ماں اُس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھتی، گود میں اس کا مُنہ چُھپاتی، لیکن وہ نظریں نہ ہٹاتی۔

عورت ہاتھ جوڑ کر سپاہیوں کی منّت کرتی۔ اس خدا کے واسطے دیتی جس کو خُوش کرنے کے لیے وہ اس بے دردی سے خُون بہا رہے تھے۔ کہ وہ بچّے کی لاش پر سے مکھیاں تو ہلائیں۔ پرندوں کو ٹھونگیں نہ مارنے دیں لیکن بے سُود۔ ہڑبڑا کر وہ

شکیل کو آوازیں دیتی۔ اپنے منہ میں کپڑا ٹھونس کر سسکیاں روکتی۔ اٹھ کر دیوانہ وار اِدھر بھاگتی اور پھر بے بس ہو کر بچّی کو لپٹا لیتی۔

دوپہر اسی طرح گزر گئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ تو اس نے بچّی کو چارپائی پر لِٹا دیا۔ اور خود سسکیوں کو دباتی، برستی آنکھوں سے مصلّے پر نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔

ابھی اس نے آدھی ہی نماز ادا کی ہو گی کہ ایک دم باہر سے بچّی کے چیخنے کی آواز آئی۔ ماں نے ہڑبڑا کر باہر دیکھا تو وُہ شکیل کی لاش سے چمٹی ہوئی تھی۔ اور ایک سپاہی اسے کھینچ رہا تھا۔ ماں بے اختیار باہر بھاگی۔

"امّی میں شکیل کی تیتری واپس دینے آئی تھی۔ اور سپاہی دینے نہیں دیتا۔"

ایک ہاتھ سے وُہ لاش کے گرد چمٹی تھی۔ اور دُوسرا ننھا سا بازو ہوا میں اٹھائے آدھ موئی تیتری دکھا رہی تھی۔ جس کا ایک پر دِن بھر مٹھی میں بھنچے رہنے کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ دراصل وُہ صبح سے ہی اس تاک میں تھی کہ کب سپاہی اور ماں کا دھیان دُوسری طرف ہو اور وُہ تیتری واپس دے دے۔ کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ شکیل اُس سے ناراض ہو کر اِس طرح پڑا ہے اور تیتری مِلتے ہی بھلا چنگا ہو کر اُٹھ کھڑا ہو گا۔

بچّی نے ضد کی تو سپاہی نے ایک دو طمانچے اس کے منہ پہ مارے۔ وُہ بلکنے لگی۔ عورت کے دِل پر آرے چل گئے۔ اُس نے بچّی کو بازوؤں میں لینا چاہا تو سپاہی نے دھکا دے کر پرے گِرا دیا۔

"اُدھر کھڑی رہ۔ خبردار جو بچّی کو ہاتھ لگایا۔ اگر تو اس پر قابو نہیں رکھ سکتی تو ہم اسے اپنے پاس رکھیں گے۔" بچّی بدستور رو رہی تھی۔

ماں بڑبڑائی "خدا کے واسطے بچّی دے دو۔ اب میں اسے نہیں چھوڑوں گی اب یہ باہر نہیں نکلے گی۔ وُہ ناسمجھ ہے۔"

لیکن سپاہی اُسے دھکیل کر غار میں لے گیا اور بچّی کو پرے درخت کے ساتھ باندھ دیا، جہاں سے وہ "امّی امّی" پکارتی رہی اور اس کی ماں ماہئ بے آب کی طرح

غار میں تڑپتی رہی۔

شام کو سردار آن پہنچا۔ وہ سیدھا غار میں آیا۔

"اب تک اسلام کا سودا تیرے سر سے نکلا ہے یا نہیں؟"

"للّٰہ میری بچّی مجھے دے دو۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بلک پڑی۔

سردار نے سوالیہ نظروں سے سپاہی کی طرف دیکھا تو وہ بولا "بچّی بار بار لاش کی طرف جاتی تھی تو میں نے اُسے درخت کے پاس باندھ دیا۔"

"ٹھیک کیا۔" سردار بولا "یہ عیسائی ہونے کو تیار ہے یا نہیں؟"

"مجھے میری بچّی دے دو۔ تو میں ابھی تمھارے مُلک سے چلی جاؤں گی۔ تمھارا مُلک عیسائیوں کو مبارک ہو۔ میں ابھی کسی اور طرف چلی جاتی ہوں۔"

"چلی جائے گی اور اسلام نہیں چھوڑے گی۔"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔" وہ رونا بند کر کے درشتی سے بولی۔

سردار اُسے گھورتا رہا، پھر سپاہی کی طرف مُڑ کر بولا۔

"بچّی اب بھی بھائی کے پاس جاتی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"اُسے جانے دو۔"

سپاہی نے فوزیہ کو کھولا تو وہ ماں کی طرف بھاگی۔ لیکن سردار نے پکڑ لیا۔

"تمھیں تو بھائی سے زیادہ محبّت تھی۔ ہے نا؟ چلو تم دونوں اکٹھے ہی رہو۔" اور یہ کہہ کر ایک نیزہ بچّی کے آرپار کر دیا۔ وہ چیخ مار کر گری اور ماں چلّاتی ہوئی جھپٹی لیکن سپاہی نے پکڑ لیا۔

"بول اب بھی عیسائی ہوگی یا نہیں؟"

جواب میں عورت جھپٹ کر آگے بڑھی اور ناخنوں سے سردار کا مُنہ نوچنے لگی۔ سپاہی فوراً اس پر ٹوٹ پڑے اور چشم زدن میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

رات کے وقت بڑے کلیسا میں ایک اعلیٰ افسر پادریوں کے جھرمٹ میں بیٹھا تھا۔ مختلف اطراف سے سپاہی جمع تھے جو رپورٹیں پیش کر رہے تھے کہ آج انھوں نے کتنے مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ سردار نے اُٹھ کر بتایا "یہاں سے کافی دُور جنگل میں ایک خاندان کافی عرصے سے چھپا ہوا تھا۔ میں تین ہفتوں تک اُن کا پتا چلاتا رہا۔ آج صبح اُن کے مرد کو گرفتار کیا گیا اور اب سے تھوڑی دیر پہلے اُس کے جسم کے ساتھ پتھر باندھ کر دریا میں پھینکا جا چکا ہے۔ خاندان کے باقی تین افراد کو شام تک کی مہلت دی گئی تھی۔ کہ وہ عیسائی ہو جائیں، لیکن ان کے انکار پر اُن کو قتل کیا گیا۔ ثبوت میں یہ پیش کرتا ہوں۔"

اور اس نے آگے بڑھ کر ہاتھوں سے کاٹی ہوئی چار انگلیاں افسر کے سامنے پیش کر دیں۔ جس نے دیکھ کر پادری کو بڑھا دیں۔ اُس نے غور سے دیکھا اور بولا:

"خدا کی رحمتیں تم پر نازل ہوں۔ میرے بچّے۔ تم نے اس کے نام کو بچا لیا ہے۔"

وقت گزرتا گیا۔ غار میں ہڈیاں گل سڑ گئیں اور سولھویں صدی کے دُوسرے نصف حصّے میں یہ غار چند روز کے لیے پھر آباد ہو گئی۔ یہ زمانہ سپین میں شاہ فلپ کا عہدِ حکومت تھا۔ جو اپنے آپ کو خدا کا چُنا ہوا بندہ تصوّر کرتا تھا۔ اور اُس کا نام بلند کرنا زندگی کا واحد مقصد سمجھتا تھا۔ عیسائیت میں پروٹسٹنٹ فرقہ گذشتہ پچاس برس سے مارٹن لوتھر کی سرکردگی میں زور پکڑ رہا تھا اور شاہ فلپ اپنی حکومت کے تمام وسائل اس کے کچلنے میں استعمال کر رہا تھا۔

اُسی زمانے میں ایک شام کو ایک نوجوان غار میں فرش پر لیٹا تھا۔ چہرے پر تشویش، داڑھی بے ترتیب سی بڑھی ہوئی۔ کپڑے میلے چکٹ اور پھٹے ہوئے، بال پریشان۔ قریب ہی ایک دو خالی برتن پڑے تھے۔ خاموش لیٹا ہوا وہ چھت پر نظریں گاڑے سوچ رہا تھا۔ غار کے کونوں میں اندھیرا چھا چکا تھا۔ اور درمیان والا حصّہ اور چھت دھانے سے آنے والے اُجالے کی وجہ سے قدرے روشن تھے۔ اِتنے میں چھت

کے روشن حصے پر کوئی تاریکی لہرائی۔ نوجوان نے مڑ کر دیکھا تو دروازے میں ایک نوجوان حسینہ ہاتھ میں ٹوکری اٹھائے کھڑی تھی۔

"تم آگئیں میری رانی۔" وہ بیتاب ہو کر اٹھا اور دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ لڑکی نے ٹوکری وہیں رکھ دی اور اُس کے سینے سے سر لگا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ نوجوان بیتابی سے اُسے تھپک رہا تھا۔ آہستہ آہستہ لڑکی کی سسکیاں ختم ہو گئیں۔ اور وہ کافی دیر گم سُم چمٹے کھڑے رہے۔

"چارلس میں تین دن سے کوشش کر رہی ہوں لیکن مخبر اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ آنے کا بالکل موقع نہ مل سکا۔ تم نے کچھ کھایا تو نہ ہوگا۔ ان دنوں میں۔"

جواب میں چارلس نے گہری نظروں سے اُسے دیکھ کر بے اختیار چوم لیا۔

"تم آگئیں تو اب مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

"پاگل مت بنو۔" وہ اُس کا کھلا ہوا گریبان بٹن سے سمیٹتی ہوئی بولی "لو جلدی سے کچھ کھالو۔"

ٹوکری کھول کر اس نے زمین پہ کھانا لگایا چارلس کو بٹھایا اور خود نوالے بنا بنا کر اسے دینے لگی۔

چارلس کھانا کھا رہا تھا۔ روزی اُسے کافی دیر تک دیکھتی رہی اور پھر بولی "چارلی تم نے کیا حال بنا رکھا ہے اپنا۔ خدا کے لیے یہ ضد چھوڑ دو۔ اور واپس چلے چلو۔ یہ غار تمھارے آرام دہ محل سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ میں اپنے باپ کو بھی فوری شادی پر رضامند کر لوں گی۔ اسے ابھی تک پتہ نہیں کہ تم پروٹسنٹ ہو گئے ہو۔"

"اب میرے لیے پیچھے ہٹنا ناممکن ہے روزی۔ میں نے اب صحیح روشنی پالی ہے۔ میں خدا تک خود بھی پہنچ سکتا ہوں۔ مجھے وہاں تک جانے کے لیے اب پوپ جیسے ٹھیکیدار کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ یہ دیکھو۔ یہ مارٹن لوتھر کی ترجمہ شدہ بائبل ہے۔ اسے پڑھو تو تم بھی پروٹسٹنٹ بننے پر مجبور ہو جاؤ گی۔"

"چارلی۔ تمھیں تم سے میں خود مانگ رہی ہوں۔ پوپ نہیں مانگ رہا۔"

"لیکن تم تک پہنچنے کے لیے مجھے پوپ سے مانگ کر کیتھولک مذہب کی پوشاک پہننا ہوگی، جو میرے لیے ناممکن ہے۔ میں تو اب تک اس ملک سے چلا گیا ہوتا، لیکن صرف تمھارا خیال میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دیتا ہے میری روزی۔ میں اس گوشے میں پچھلے دو مہینے سے پڑا ہوں کہ شاید حالات ٹھیک ہو جائیں اور میں تمھارے قریب رہ سکوں۔"

"حالات ٹھیک نہیں ہوں گے چارلی۔" وہ بڑے درد سے بولی "تم یہاں اس تاریک غار میں اپنے خیالوں میں مگن رہتے ہو۔ تمھیں کیا پتا شہر کے چوراہوں میں الاؤ جل رہے ہیں۔ کونے کونے میں حکومت اور لوگوں کے مخبر گھوم رہے ہیں۔ جو سات تہہ خانوں کی گہرائی سے بھی پروٹسٹنٹ لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال لاتے ہیں اور شعلوں میں زندہ دھکیل دیتے ہیں۔"

لڑکی کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ "میں نے والدین کو پتھر دل بنے اپنے بچوں کو آگ میں جھونکتے دیکھا ہے۔ بھائی بھائی کو شعلوں میں دھکیل رہا ہے۔ خدا کو خوش کرنے کے لیے دوست بھی دشمن بن گئے ہیں۔ یہ حالات نہیں سدھریں گے جب تک پروٹسٹنٹ ختم نہ ہو جائیں گے۔ چارلی خدا کے لیے یہ ضد چھوڑ دو۔ اس عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو پھر کیتھولک ہو جاؤ۔"

چارلس انکار کے طریقے پر مسکرانے لگا۔ وہ بولی:

"اگر یہ حالات ٹھیک ہو بھی گئے تو کیا؟ میں تو پھر بھی کیتھولک ہوں۔ کیتھولک باپ کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ پادری ہے۔ وہ کیسے ہم کو یکجا دیکھ سکے گا؟ سوچو تو سہی۔ اپنے لیے نہ سہی، میرے لیے ہی سوچو!" اور وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر پھپک پھپک کر رونے لگی۔ لڑکا اس کے بالوں میں آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا رہا۔

"تمھارے لیے ہی سوچ کر یہاں رکا ہوں میری روزی۔ حالات ضرور ٹھیک ہوں گے اور ایسے ہوں گے کہ تم بھی اور تمھارا پادری باپ بھی پروٹسٹنٹ ہو جائے گا۔ حق کبھی

نہیں چُھپ سکتا۔ سچائی کو ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔"

لڑکی تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے چارلس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی "احمقانہ باتیں نہ کرو چارلی۔ حق کے نام پر ہزاروں برس سے خون کے تالاب بن رہے ہیں۔ جن میں باطل کے کیڑے پرورش پاتے ہیں۔ آخر تمہاری وہ سچائی کس دن نظر آئے گی؟"

وہ اُس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہی اور پھر بولی "ہم اِنسان ہیں چارلی۔ خدا ہمیں ایک ہی دفعہ اِس دُنیا میں آنے کا موقعہ دیتا ہے۔ اور اُس نے ہزاروں نعمتیں اس موقعے کو خوشگوار بنانے کے لیے پیدا کی ہیں، لیکن ہم خُدا کے شکر گزار ہونے کی بجائے اسی کی زندگی کو اسی کے نام پر لڑ کر ختم کر دیتے ہیں۔ نہ صرف اپنی زندگی کا سُنہری موقع کھو دیتے ہیں بلکہ اِس نعمت بھرے ماحول میں دُوسرے رہنے والوں کی زندگی بھی جہنّم بنا دیتے ہیں۔ خُدا نے اِنسان بنایا ہے اور اِنسان نے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ بنا کر اِنسانیت ختم کر دی ہے۔ چارلی۔ لِللہ میری طرف دیکھو —— یہ بتاؤ —— اگر تمہیں خُدا سے محبّت ہے تو کیا تم کیتھولک رہ کر اس سے محبّت نہیں کر سکتے' جو پروٹسٹنٹ بن کر اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہو؟"

"میری ننھی گڑیا ——" اس کے چہرہ کو سہلاتے ہوئے بولا "شعلوں میں انسانوں کو زندہ جلتے دیکھ کر تم بھی فلسفی ہو گئی ہو۔ اور وہ بھی غلط قسم کی۔ شادی کی خاطر تم مجھے کیتھولک ہونے کی دعوت دیتی ہو۔ لیکن خُود پروٹسٹنٹ کیوں نہیں ہو جاتیں؟ کیوں نہ تم بھی میرا ساتھ دو۔ اور ہم کسی دُوسرے مُلک میں بھاگ چلیں۔"

"کاش تم نے میری بات سمجھی ہوتی۔" لڑکی نے تھکے ہوئے انداز میں کہا اور سر جُھکا کر تنکے سے زمین کی مٹّی کریدنے لگی۔ چارلس بھی سوچ میں ڈُوبا رہا۔ غار میں اندھیرا گہرا ہو رہا تھا اور مغموم سی خاموشی طاری تھی۔ کونے میں کوئی جھینگرا اپنے

لگ گیا۔

تھوڑی دیر بعد لڑکی نے سر اُٹھایا " چارلس !"

لڑکے نے اُس طرف دیکھا۔

" میں چلوں گی ـــــ تمھارے ساتھ چلوں گی ـــــ جہاں لے جاؤ گے چلوں گی ـــــ لیکن بحیثیت ایک انسان کے ـــــ اِنسان کو خدا نے اپنا عکس بنایا ہے اس کا صحیح مسلک محبّت ہے۔ نفرت نہیں۔ میں اس محبّت کی آواز پر تمھارے ساتھ جاؤں گی۔ مذہبی فِرقوں کے تقاضوں پر نہیں۔ وُہ صرف نفرت دیتے ہیں۔ تمھارے مذہبی فِرقے خُدا کے پُر محبت نام پر ایک بھیانک تہمت ہیں۔ وہ خدا کو بدنام کرتے ہیں۔ اس کے نام پر نفرت کی دُکان چلاتے ہیں۔ خُدا تو خالص محبّت ہے اور میں اسی کی بندی بن کر تمھارے ساتھ چلوں گی۔ کیتھولک کا پروٹسٹنٹ سے پیار۔ اِنسان کا اِنسان سے پیار۔"

اور نوجوان بے اِختیار اُس سے لپٹ گیا۔

"میری روزی" وُہ آنسو بھری سرگوشی میں کہے جا رہا تھا۔ "تم میری زندگی ہو۔ مجھے اِتنے کڑے اِمتحان میں نہ ڈالو کہ میں تمھارے اور خدا کے تصادم میں کچلا جاؤں۔ تم میرے ساتھ چلو۔ خُدارا میرا ساتھ نہ چھوڑو۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے پروگرام طے کر لیا۔ روزی یہ وعدہ کر کے رُخصت ہُوئی کہ اگلی دوپہر کو وُہاں آئے گی۔ اور دونوں جرمنی کی طرف روانہ ہو جائیں گے نوجوان خُوشی سے مسرور غار میں ٹہلنے لگا۔

اگلی دوپہر روزی غار میں پہنچی۔ بھاگنے کی گھبراہٹ اور چھٹکارے کی خُوشی سے اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ چہرے پر سُرخی اور پیلاہٹ کی دُھوپ چھاؤں تھی۔ چھوٹی سی گٹھڑی بغل میں دابے وُہ غار میں داخل ہُوئی۔ لیکن چارلس وہاں نہ تھا۔ اس نے غار میں ڈھونڈا، باہر نِکل کر تلاش کیا۔ بالآخر احتیاط کو بالائے طاق رکھتے

ہوئے آوازیں دیں۔ لیکن سوائے اپنی بازگشت کے اور کوئی صدا نہ آئی۔

ناگاہ اُس کی نظر ایک جگہ چارلس کی چادر پر پڑی۔ لپک کر پہنچی تو دھینگا مشتی کے نشان بھی نظر آئے۔ چارلس کی قمیص کا بٹن، جس سے وُہ کھیلا کرتی تھی۔ سع دھاگے کی مُونچھ کے مِل گیا۔ وُہ نوچ کے چھینا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ اور جا بجا خُون کے قطروں کے نشان تھے۔ جو کافی دُور تک چلے گئے تھے۔

وُہ سب کچھ جان گئی اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔

اُسی شام کو شہر کے بڑے چوراہے میں بڑا الاؤ روشن تھا۔ بے شمار تماشائی جمع تھے۔ ایک طرف دو درجن پروٹسٹنٹ مرد، عورتیں، بچّے اور بُوڑھے قطار میں کھڑے تھے۔ ان کے پاس کئی پادری بائبل ہاتھوں میں تھامے دفعِ شر کے لیے بلند آواز میں دُعائیں پڑھ رہے تھے۔

سپاہی ایک ایک کر کے پروٹسٹنٹ لوگوں کو آگ میں ڈالنے لگے۔

ایک اُونچے پلیٹ فارم پر چار آدمی کھڑے تھے۔ وُہ مرنے والوں کو ٹانگوں اور بازوؤں سے پکڑ کر جھولے کی طرح جھلاتے رہتے اور پھر چھوڑ دیتے۔ وہ فضا میں اُچھل کر ڈھلان سطح پہ گرتا اور پھسلتا ہُوا آگ کے الاؤ میں غائب ہو جاتا۔

ہر آدمی کے ڈالے جانے پر مسرّت کے نعرے بلند ہوتے اور لوگ باوازِ بلند خُدا کی حمد کرتے۔ مرنے والے خُدا کی رضا کے لیے بڑے اِستقلال سے مر رہے تھے اور مارنے والے خُدا کی رضا کے لیے بڑے خلُوص اور عجز سے مار رہے تھے۔

چارلس کا نمبر بھی آ گیا۔ جب وُہ چبوترے پر چڑھا تو اُس نے چاروں طرف دیکھا، جیسے کسی کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ اور پھر اپنے آپ کو جلادوں کے حوالے کر دیا۔

جھولا جھولنے لگا۔

ایک۔

دو۔

تین۔

اور اِتنے میں مجمعے کے ایک طرف سے روزی چیخیں مارتی نکلی۔ اور ابھی چارلس شعلوں کے اُوپر فضا میں مُعلّق ہی تھا کہ وُہ دوڑ کر آگ میں کُود گئی۔

..... مُسافر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے رات بھر کی نیند میں پچھلے دو ہزار سال کے خوفناک حادثات خواب کی صُورت میں دیکھے، جو اس غار میں ہوتے رہے تھے۔ جس جگہ وہ لیٹا رہا تھا وہاں کسی کا خُون جذب ہُوا تھا۔ کسی کی ہڈیاں دبی تھیں۔ کسی کی تڑپ کے نشان تھے۔ اور مرنے والوں کی بیتاب رُوحیں، جو اس غار میں بھٹک رہی تھیں۔ بار بار خواب میں آکر اپنی اذیّت ناک کہانی دُہراتی تھیں۔ جب مُسافر اُٹھا تو وُہ خوف سے کپکپا رہا تھا۔ اُس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ اور وُہ ٹھنڈے پسینے میں شرابور تھا۔ باہر پو پھٹ رہی تھی۔ غار کے درمیانی حِصّے میں ہلکی سی روشنی تھی۔ باقی کونوں میں ابھی گہری سیاہی تھی۔ گھبراہٹ میں جب وہ اِدھر اُدھر دیکھتا تو اسے یوں لگتا جیسے اندھیرے میں فوزیہ کا ننّھا ہاتھ تیزی پکڑے اسے اپنی طرف بُلا رہا ہے کہیں شکیل کی لاش پر کوّے ٹھونگیں مار رہے ہیں کسی کونے میں گھوڑا سوار نیزے تانے اس پر حملہ آور ہونے کو ہیں۔ اس کا ہاتھ اپنے گھٹنے کے پاس کسی نرم شے سے ٹکرایا، جیسے جما ہُوا خُون ہو، تو وُہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ مگر اُس نے دیکھا تو وہ اُس کا اپنا کمبل تھا۔ اچانک کوئی روڑا گرا تو وہ سہم کر پیچھے ہٹا کہ شاید شکاری کُتّے اُس کی ٹانگوں پر دانت گاڑنے کو ہیں۔ اس کے کانوں میں روزی اور چارلس کی آواز۔ سپاہیوں کے للکارے اور موت کی چیخیں گُونجتی تھیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اپنے اِرد گرد کے خاموش، نیم تاریک اور پُراسرار ماحول کو دیکھتا اور اپنی لرزتی ہُوئی ٹانگوں کو سمیٹ لیتا۔ پھر وُہ ایک دم سجدے میں گر پڑا اور پکار اُٹھا۔

"یا خدا تو کون ہے؟ تو کیا ہے؟ تو کِدھر ہے؟ ہزاروں برس سے اپنے نام پر انسان کے خُون سے ہولی کھیل رہا ہے۔ تو کیوں نہیں ایک ہی دفعہ اپنا اصل

رُوپ ظاہر کر دیتا تاکہ یہ سب جھگڑے رُک جائیں ......یا خُدا.......
یا خُدا......"

غار کے گہرے سکوت میں اُس کی اپنی آواز کسی بدرُوح کی چنگھاڑ معلوم ہوئی۔ وُہ ایک دم چُپ ہوگیا تو باقی ماندہ گُونج غرائی، جیسے خُدا کا غضب ناک ہاتھ اسے پیچھے سے دبوچنے کو ہے۔ اور وُہ ہیبت زدہ ہو کر غار سے باہر بھاگ آیا۔

صُبح کی تازہ ہوا نے اُس کی طبیعت میں تھوڑا ٹھہراؤ پیدا کیا اور وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا، گو جسم کے اندر اب بھی لرزہ طاری تھا۔ سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر وُہ سوچنے لگا کہ کیا خُدا واقعی وُہ سب کچھ چاہتا ہے جو اس کے تعلّق سے کیا جاتا ہے؟ کیا واقعی اُسے خُوش ہونے کے لیے خُون کے فوّاروں اور آہوں کی جھنکار کی ضرورت ہے؟ "نہیں۔ نہیں۔" وُہ پُکارا، "خدا تو تخلیق کا منبع ہے۔ کائنات کا سرچشمہ ہے۔ مخلوق کا رازق ہے۔ تو پھر یہ سب کچھ کیوں ہے؟ کیا ہے؟"

وُہ کافی دیر سر جھکا کر سوچتا رہا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ تھک کر اس نے چلنے کا ارادہ کیا۔ وُہ ہولے ہولے اُٹھا تاکہ اپنی چیزیں سمیٹ لے۔ اسے غار میں جاتے ہُوئے خوف معلوم ہوتا تھا۔ اور قدم بھی غیر ہموار سے تھے اس لیے اُسے ایک چھوٹے سے پتھّر سے ٹھوکر لگی۔ جو اپنی جگہ سے اُکھڑ گیا۔ وُہ اُچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ اور ڈر کر پتھّر کو دیکھنے لگا۔ اس کے نچلے حِصّے میں ایک کاغذ چپکا ہُوا تھا۔ مُسافر نے حیران ہو کر مٹی ہٹائی تو نیچے سے کچھ اوراق برآمد ہُوئے۔ کھودا تو ایک کتاب برآمد ہُوئی۔ جس کے صفحے خستہ تھے اور لکھائی جگہ جگہ سے مِٹ چُکی تھی۔ خوف کے باوجود اُسے غار کے اسراروں سے دِلچسپی سی ہو گئی تھی۔ اس لیے وُہ دیکھنے لگا۔ غور کرنے پر معلوم ہُوا کہ وُہ ایک مذہبی کتاب تھی۔ اس کی نظر اپنی مذہبی کتاب پر پڑی۔ جو اس کے کپڑوں پر پڑی تھی۔ اس نے وُہ بھی اُٹھالی اور دونوں کو دیکھنے لگا۔ وُہ ایک دُوسری سے کتنی مُختلف تھیں۔ اور مقصد؟ اُس نے سوچا — مقصد ایک ہی تھا کہ خُدا اور

بندے کا رابطہ قائم ہو جاتے۔

اور وُہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ دونوں کتابیں اس نے ایسے پھینک دیں جیسے وُہ اسے ڈسنے لگی تھیں۔ اسے اپنے سوال کا جواب مِل گیا تھا۔ خُدا کے نام پر انسان کا خون بہانا خُدا کا منشا نہ تھا۔ ان کتابوں کا منشا تھا۔ اُن مذاہب کا منشا تھا جو اُن کتابوں پر تعمیر ہوتے ہیں۔ اور ایک ہی خُدا کے گرد مختلف رنگ کے شیشے کے شوکیس تعمیر کر کے اس میں نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے خُدا پر ترس آنے لگا۔ جو اُس کٹھ پتلی کی مانند ہے۔ جس کی اصلی شکل اِس لیے بگڑ گئی ہے کہ ہر شخص اُسے اپنے انداز میں پہننے کی کوشش کرتا ہے۔

مسافر نے جلدی سے اپنی چیزیں سمیٹ لیں اور کتابیں وہیں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ اور کافی دُور تک بھاگتا چلا گیا۔ پھر ایک دم کچھ خیال آیا اور واپس لوٹا۔ اِرد گرد سے بڑے بڑے پتھر اُٹھا کر وہ اُس غار کا منہ بند کرنے لگا۔ وہ اُن کتابوں کو ہمیشہ کے لیے اندر دفن کرنا چاہتا تھا اور ساتھ ساتھ بڑبڑا رہا تھا " خُدا نے انسان کو اپنے عکس میں پیدا کیا ہے۔ میں خُدا کو سمجھنے کے لیے کتاب کی بجائے اِنسان کو سمجھوں گا۔ "
اور وُہ اپنے کام میں مصروف رہا۔

کافی دُور سے وُہ بڑے بڑے پتھر لُڑھکا کر لاتا رہا۔ بڑی مُشکل سے اُٹھا کر ایک کے اُوپر دُوسرا رکھتا۔ غار کا دہانہ قریباً بند ہو چکا تھا۔ صرف ایک پتّھر کی کسر باقی تھی۔ دوپہر ہو چلی تھی اور دُھوپ کی تمازت اور مشقّت سے وُہ پسینے سے شرابور تھا۔ آخری پتّھر اُٹھائے وہ سنبھل سنبھل کر پتھروں پہ پاؤں اٹکاتا اوپر چڑھ رہا تھا کہ نیچے سے پاؤں پھسلا اور ایک پتّھر ہِل گیا۔ وُہ نیچے آ گرا اور بنیادی پتّھر ہلنے سے ساری دیوار اس پر آ پڑی۔

اس کے سر سے خُون کے فوارے نکلنے لگے اور وہ فوراً مر گیا۔ دیوار کے ایک دم گِرنے سے ہوا کا تیز جھونکا غار کے اندر گیا اور مذہبی کتابوں کے اوراق

پھڑپھڑائے، جن کی آواز غار کے اندر ایسے گونجی جیسے کروڑوں لوگ مسرت سے بے خود ہو کر تالیاں پیٹ رہے ہیں۔

(۱۹۶۰ء)

اَداکار

"شادی تو کرلی ہوگی آپ نے؟"

"جی نہیں۔ ابھی تو اِس میٹھے عذاب سے بچا ہُوا ہُوں۔"

"ہاہاہا۔" وُہ صاحب کھِل کر ہنسے۔ ایک دم اُن کا مُوڈ بے تحاشا خوشگوار ہوگیا اور تھوڑی ہی دیر میں وُہ بڑے گھُل مِل گئے۔

اختر کا ماتھا ٹھنکا۔ ان صاحب کی ضرور کوئی صاحبزادی ہوں گی۔ جو خوبیوں کی پوٹلی ہونے کے باوجود ابھی تک لنڈوری ہوں گی اور آبا میاں جال ہاتھ میں پکڑے کسی داماد کی فکر میں ہوں گے۔ جب سے اختر کو آئل کمپنی میں ملازمت مِلی تھی اور اس نے ایرکنڈیشنڈ کوچ اور ہوائی جہاز میں سفر کرنا شروع کیا تھا اس کی ایک اور حِس بیدار ہوگئی تھی۔ جو اسے خطرے کا پتا دیتی تھی۔ اور وُہ فوراً لڑکیوں کے باپ پہچان جاتا تھا۔

بچپن میں اُس نے بستوں میں پڑھا "جیب کتروں سے بچو" اور وہ ہمیشہ اُن سے بچتا رہا۔ لڑکپن میں اُس نے ترمیم کر کے "بزرگوں سے بچو" بنا لیا۔ اور وُہ اُن سے بھی بچتا رہا۔ آئیل کمپنی میں ملازم ہونے کے بعد اِس ہدایت نے یوں رنگ بدلا کہ "لڑکیوں کے باپوں سے بچو"۔ لیکن باوجود کوشش کے وہ ان سے نہ بچ سکا اور قدم قدم پر ان سے ٹکراؤ ہو جاتا۔

کئی گھنٹے کے سفر کے بعد اختر کا خیال بھی نہ تھا کہ موجودہ ہم سفر شریف آدمی کے رُوپ میں لڑکی کا باپ ہوگا۔ یعنی جو پیشہ وَر باپ ہو۔ اس کا سفر مزے میں کٹ رہا تھا۔ ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں سفر کرنے والے ویسے بھی ذرا الگ تھلگ رہتے ہیں۔ تھرڈ کلاس والی بات تو ہوتی نہیں۔ کہ رومال سے جگہ صاف کرنے تک ہی چچا ماموں کی ملاقاتیں نکل آتی ہیں۔ یہاں تو لوگ خاموش بیٹھے کنکھیوں سے ایک دُوسرے کا سامان دیکھ کر اس کی حیثیت کا اندازہ لگاتے رہتے ہیں۔ اور بس۔ باتیں کرنے کا اِشتیاق صرف دو ہی حالتوں میں ہوتا ہے۔ اگر کسی تاجر کو پتہ چل جائے کہ اس کا ہم سفر سرکاری افسر ہے یا سرکاری افسر کو پتہ چل جائے کہ اس کا ہم سفر اکونٹنٹ جنرل کے دفتر میں ہے۔ ان کے علاوہ تو بات چیت کا امکان کم ہی ہے۔ مسکین طبع آدمی اخبار یا رسالوں کے پیچھے اپنا مُنہ چھپائے رکھتے ہیں۔ اور ذرا اَنک والے بار بار گھنٹی بجا کر بیرے کو اُلٹی سیدھی ڈانٹ سے دُوسروں پر رُعب جماتے رہتے ہیں۔ اس لیے اختر کی بھی ہم سفر سے سارے دن میں ٹائیلٹ جاتے ہُوئے "معاف کریں"۔ یا "آیئے چائے پیجیے"۔ اور "شکریہ" وغیرہ سے زیادہ کوئی بات چیت نہ ہُوئی تھی —— لیکن اب جو اُن کا موڈ ایک دم بدلا تو اختر کے اندر سے ہوشیار باش کی صدائیں اُٹھنے لگیں کیونکہ موجودہ ملازمت کے بعد پُرجوش مصانقوں، پُرتکلف دعوتوں، مُشفقانہ مسکراہٹوں اور قرابت کے دعووں کے پیچھے اُس نے ہمیشہ باپ کی لڑکی کارفرما دیکھی۔ رشتے دار اب پچھلی عداوتوں سے بے خبری ظاہر کر کے اُس کے گلے سے لٹکنے لگے تھے۔ چاچی

قسم کے باپ اُس کی لامذہبیت کا بُرا نہیں مناتے تھے۔ سنجیدہ باپ اُس کے معمولی سے مذاق پر بھی خوب ہنستے تھے۔ عیال دار باپ اُسے بار بار یقین دلاتے تھے۔ کہ اُس کے بچّوں کو اس کی طبیعت بہت پسند ہے۔

وہ صاحب بھی بڑے اٹک اٹک کر باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے دو اُنگلیاں کھولیں۔ اُن سے جیب کا دہانہ کھولا۔ بٹوا نکال کر کھولا۔ اس میں سے چابی لے کر صندوق کھولا۔ کپڑے ہٹا کر ایک کونہ کھولا۔ وہاں سے ڈبہ برآمد کر کے کھولا جس میں سے سالٹ میٹ نکلا۔ گھنٹی دبا کر انھوں نے بیرے کو بُلایا اور ڈائننگ کار سے بڑی عمدہ چائے منگوائی۔ پھر بڑے اصرار سے اختر کو سب کچھ کھلا ڈالا۔ اختر نے سالٹ میٹ کی تعریف کی تو کہنے لگے:

"میں تو بہت کھاتا ہوں درصل میری لڑکی نے اپنے شوق سے مجھے بھی یہ عادت ڈال دی ہے......"

اختر دل ہی دل میں لڑکی کا ذکر سُن کر مُسکرایا کہ اُس کا اندیشہ درست نکلا تھا۔ وہ کہے جا رہے تھے۔ "دُنیا میں تین چیزیں ایسی تھیں جن سے مجھے نفرت تھی........ لیکن اپنی لڑکی کے شوق کی وجہ سے اب میری مرغوب عادتیں ہیں۔ پینٹنگ، ادبی رسائل کا مطالعہ اور خوبصورت پھول اکٹھے کرنا ——— رُوحی انہی چیزوں کی وجہ سے کالج میں اِنعام پاتی رہی ہے۔"

اختر ان فقروں کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔ اُس نے سابقہ تجربوں سے سیکھا تھا کہ باہنر باپ کن طریقوں سے اپنی لڑکیوں کا تعارف کراتے ہیں۔ لیکن یہ صاحب ذرا بہتر سیلزمین معلوم ہوتے تھے۔ دو تین جملوں میں انھوں نے رُوحی کی عُمر اور اختر کے مزاج سے اُس کی مُطابقت کا اِشارہ دے دیا تھا کیونکہ گُفتگو کے دوران میں اختر بتا چکا تھا کہ وہ شاعر ہے اور شوقیہ تصویریں بھی بناتا ہے۔ بہر حال اُس نے اِنکشاف میں خُوشی کا اِظہار کیا اور باتیں کرتا رہا۔ موضوع بار بار بدلتا رہا جیسا کہ سفر میں ہوتا ہے۔ اخبار

پر نظر پڑی تو سیاست پر تھوڑی سی بحث ہولی۔ کوئی ٹوٹا ہُوا درخت نظر آیا تو محکمہ جنگلات کی ساتُ پشتیں اکھیڑ ڈالیں۔ کوئی عورت ایک ہی سائز کے دس بارہ بچّوں میں گھری نظر آئی تو خاندانی منصوبہ بندی پر بات چل نکلی۔ وہاں سے معاشرے کو پلیٹ ڈالا۔ کروٹ بدلی تو پلاؤ ضومذہب کو لتاڑ ڈالا۔ علیٰ ھٰذا القیاس باتوں کے باوجود صاحب کھانے کا آرڈر نہیں بھولے تھے۔ اور وُہ بھی دو آدمیوں کا۔ اس لیے دوپہر ہونے پر ڈائیننگ کار میں چلے گئے۔

ریلوے کی ڈائیننگ کار ابھی تجرباتی دَور میں ہے۔ جہاں تحقیق کی جارہی ہے کہ کہ زیادہ سے زیادہ دام میں خراب سے خراب کھانا مسافروں کی طبیعتوں پر کیا اثر ڈالتا ہے۔ اس لیے جب ایک کوفتے میں سے کالی مرچ کی بجائے ایک مکھی محوِ خواب برآمد ہُوئی تو ان صاحب کے چیخنے کے باوجود بیرے اور منیجر نے پُر اسرار خاموشی سادھے رکھی۔ دُوسرا ڈونگہ لایا گیا اور وہ صاحب چیخنے کے علاوہ کھانے بھی لگے۔

"کاش کہ میرے ساتھ رُوحی ہوتی۔ ایک دفعہ ایک ہوٹل میں ہم کھانا کھانے گئے۔ ابھی بیرا ڈونگہ اُٹھائے ہماری طرف آہی رہا تھا کہ اُسے اُس نے دُور ہی روک دیا کہ اس میں سے مکھی کی بُو آرہی ہے۔ بیرا تو واپس لے چلا تھا کہ میں نے اُسے روک کر ڈونگا دیکھا تو واقعی اُس میں مکھی تھی۔

"بہت عمدہ ناک ہوگی اُن کی۔" اختر نے استہزا آمیز سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں ناک کی بات نہیں۔" وُہ بات سمجھے بغیر بولے۔ "یہ تو کھانے کے ذوق کی بات ہے اور کھانے کا صحیح سلیقہ میں نے رُوحی میں ہی دیکھا ہے۔"

اختر دُنیا بھر کے باپوں پر ترس کھانے لگا جو سمجھتے ہیں کہ اُمیدوار کنواروں کو وُہ کامیابی سے بیوقوف بنا سکتے ہیں۔ اگر کوئی لڑکی بیوقوف بنائے تو بہ قائمی ہوش وحواس بیوقوف بننا ثواب کا کام ہے لیکن لڑکی کا باپ اگر یہ کوشش کرے تو عذاب بن جاتا ہے اور اختر کافی دیر تک یہ عذاب اپنی کنواری جان پر سہتا رہا۔ وُہ صاحب

ہر بات میں ہیر پھیر کر اپنی لڑکی کی تعریف کرتے اور اختر کھڑکی کے ہلکے سبز شیشوں سے باہر بھاگتے ہوئے نظاروں اور ٹیلیگراف کے تاروں کے جھٹکے سے ٹوٹنے والی لہروں پر نظریں گاڑے بور ہوتا رہا۔ کافی پلینے کے بعد اپنے کیبن میں واپس آتے تو سفر تھوڑا سا رہ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد گاڑی رکی۔ اختر کار یڈور میں سے قلیوں اور مسافروں سے ٹکریں کھاتا جب باہر نکلا تو اُن صاحب نے پلیٹ فارم پر اُسے گلے لگا لیا اور بڑی شفقت سے اگلے روز شام کو چائے پر دعوت دی۔ یہ شفقت اور دعوت اختر کے لیے نئی نہیں تھی اور عام طور پر وہ طبعاً ایسے آدمی سے بیزار ہو جایا کرتا تھا جو اتنے جارحانہ انداز میں اُسے اپنی لڑکی کے لیے قابو کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن اس وقت اُس نے یہ دعوت فوراً قبول کر لی۔ کیونکہ اُس کے دل میں تجسّس نے جڑ پکڑلی تھی کہ کیا واقعی وہ لڑکی اتنی خوبیوں کی مالک ہے جتنی اُس کا باپ بتا رہا ہے۔ لڑکی سے زیادہ وہ باپ کی سیلز مین شپ کی حقیقت جانچنا چاہتا تھا۔

اگلی شام بڑی حسین تھی۔ ابر آلودہ آسمان، ہلکی ہلکی پھوار۔ فضا میں خنک سی نمدار مہک۔ درختوں پر نکھار اور لوگوں کے چہروں پر تازگی۔ اختر کار میں بیٹھے بیٹھے گنگنانے لگا "اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے۔" دراصل وہ ان دِنوں قدرے سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا۔ کہ اب اسے مناسب لڑکی ملنے پر شادی کر لینا چاہیے۔ اس سے پیشتر تو اس کے حالات نے اجازت ہی نہ دی تھی۔ اِس لیے وہ ہر پیشکش کو ہنس کر ٹال دیا کرتا تھا اور جو باپ اس پر جارحانہ شفقت بکھیرتے تھے، اُن کی حرکتوں سے وہ لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ کار موڑی تو لائٹر سے سگرٹ سلگاتے ہوئے وہ ایک سفید کوٹھی دیکھ کر مسکرایا جہاں وہ ایک دفعہ کھانے پر مدعو تھا اور صاحبِ خانہ کھانے کی میز سے پہلے تو خود ٹیلیفون کال کا بہانہ کر کے کھسک گئے اور بعد میں اُن کی اہلیہ بھی لڑکی کو اس کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر باورچی کو زیادہ نمک ڈالنے پر ڈانٹنے چلی گئیں۔ واپسی میں کافی دیر کی وجہ یہ ہوئی کہ صاحبِ خانہ کو نمبر نہ ملا اور بیگم صاحبہ کو باورچی نہ

بلا —— پھر اُسے سفید داڑھی اور حنا آلود سر والے حاجی صاحب یاد آ گئے جنھوں نے بڑے اصرار سے اُسے "اسلامی اخلاق" کتاب پڑھنے کو دی تھی۔ گھر آ کر اُس نے کھولی تو اُس میں سے بیس سالہ لڑکی کی ایک تصویر برآمد ہوئی۔ چند دن بعد اختر نے وہ کتاب ان کو خاموشی سے واپس دے دی۔ تو وہ اس پر تبصرہ کرنے لگے اختر بھی رائے دیتا رہا لیکن تصویر کا اخلاقاً ذکر نہیں کیا۔ بالآخر وہ ہنس کر بولے "آپ کو کتاب دے کر میرے لیے تو مصیبت بن گئی۔ میری لڑکی اتنے روز مجھ سے جھگڑتی رہی کیونکہ اُس میں اُس کی تصویر تھی۔ بڑی شرمیلی ہے وہ۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں۔ اختر میاں سے کیا شرم ہے۔" پھر اختر کو کلب والے مسٹر صدیقی یاد آ گئے۔ جو ہر شام اتنا ڈرنک کر جاتے ہیں کہ رات کو مجبوراً اختر سے درخواست کرنا پڑتی کہ وہ کار خود چلا نہیں سکتے اس لیے اختر انھیں گھر چھوڑ آئے اور وہاں جا کر اُسے زبردستی سب گھر والوں کے ساتھ کھانے پر بٹھا لیتے۔

اتنے میں کار ایک عالیشان کوٹھی میں داخل ہوئی۔ لان کے گرد گھوم کر ڈرائیور نے پورچ میں گاڑی کھڑی کی تو ایک باوردی ملازم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اتنے میں وہ صاحب مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے اور بڑی شفقت سے اختر کو پکڑ کر قریباً گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے۔ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ قابلِ داد تھی۔ ہر چیز کے چناؤ میں کلر سکیم اور ڈیزائن کی ہم آہنگی کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ اختر نے بے ساختہ تعریف کی۔

"شکریہ بیٹا۔" وہ بولے۔ "لیکن یہ سب سجاوٹ روحی نے کی ہے۔ فرنیچر کا ڈیزائن تک اُس نے خود بنایا تھا۔ اور میں نے بازار سے ویسا ہی بنوا لیا۔ دیواروں پر سب تصاویر اُس کے اپنے ہاتھ کی ہیں ...... بیٹھو بیٹھو ...... کھڑے کیوں ہو ..... اپنا ہی گھر سمجھو۔"

اور وہ "شبراتی ... ارے شبراتی" پکارتے ہوئے اندر چلے گئے۔ اختر نے

دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں کو اب ذرا دلچسپی سے دیکھنا شروع کیا اور جیسے جیسے وہ کمرے کی مختلف چیزوں کو دیکھتا جاتا رُوحی کے ذوق کا قائل ہوتا جاتا۔ بشرطیکہ یہ سب کچھ بقول ان صاحب کے رُوحی کے ذوق کا نتیجہ ہو۔ وہ خُود روحی کو دیکھنے کا مُنتظر سا ہو گیا۔ کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا لیکن اُس کی اپنی کوئی فوٹو نظر نہ آئی۔ اِتنے میں وہ صاحب پھر واپس آ گئے۔ اختر صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ "ارے تم یہاں کیوں بیٹھ گئے؟ —— اِدھر آؤ۔ اِس کرسی پر بیٹھو۔ . . . یہ ذرا بہتر ہے۔" اختر نے بہتیرا کہا کہ وہ ٹھیک ہے لیکن وہ نہ مانے اور پکڑ کر کونے والی کرسی میں بٹھا دیا وہاں بیٹھ کر اُس نے کوئی خاص فرق تو محسوس نہ کیا لیکن میزبان کی خُوشنودی کے لیے اُس نے نسبتاً زیادہ آرام کا اظہار کیا۔

"مِس رُوحی تو واقعی آرٹِسٹ ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر تصویر ہے —— لیکن یہ جھیل کے منظر والی بہت ہی خُوبصورت ہے۔"

"جی ہاں، جواب نہیں اس کا . . . . . مجھے بھی بڑی پسند ہے دراصل میری فرمائش پر ہی رُوحی نے بنائی تھی۔ یہ سوئیٹزرلینڈ میں جھیل جینوا کے کنارے پر بنائی تھی۔ بیچاری کو سردی میں تین دن بیٹھنا پڑا۔"

"جی بڑی محنت کی ہُوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور پھر رنگوں کا اِمتزاج تو بہت ہی عُمدہ ہے، بڑا بھرپور تأثر پیدا کیا ہے۔" اختر بولا اور دِل ہی دِل میں ان صاحب کا قائل ہو گیا جو بڑے خُوبصورت انداز میں سے اپنی لڑکی کے بارے میں ہر اطلاع بہم پہنچا رہے تھے۔ کہ وہ بیرونی ممالک کا چکر بھی لگا آئی ہے۔

"ہاں، اور یہ ابھی بہت پُرانی بھی تو نہیں ہُوئی۔ بمشکل تین برس پہلے بنائی تھی رُوحی وہاں کی اور بھی تصویریں بناتی لیکن واپسی کی جلدی تھی۔ کیونکہ ایم اے کا داخلہ لینا تھا اور تم جانتے ہو بیٹا کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے میں داخلہ مشکل سے ہی ملتا ہے۔ اِس لیے ہمیں جلدی واپس آنا پڑا۔"

"لیکن آپ انگلش کی ایم اے کے لیے وہیں کسی یونیورسٹی میں داخل کرادیتے۔"

"ہاں ہاں بیٹا۔ میں نے تو بہتیرا مجبور کیا لیکن وُہ نہ مانی۔ کہتی تھی، ڈیڈی میں آپ کو اکیلا نہ چھوڑوں گی۔ یا تو آپ بھی انگلینڈ میں رہیں یا میں بھی پاکستان میں پڑھوں گی۔ اب بھلا میں کاروبار کو چھوڑ کر کیسے جاسکتا تھا۔"

"جی بجا ہے۔" اختر بولا "بڑا مشکل ہوتا ہے لیکن آپ ان کی والدہ کو ساتھ بھیج دیتے۔"

"بس یہی تو مجبوری تھی۔ میری بیوی کو فوت ہوئے پندرہ برس گزر چکے تھے اور رُوحی کے علاوہ میرا کوئی اور بچہ نہ تھا اِسی لیے وُہ مجھ سے جُدا نہیں رہنا چاہتی تھی۔ کیونکہ ہم دونوں اکیلے ہو جاتے اس لیے ہمیں واپس آنا پڑا۔ .... یہ ساری کتابیں وُہ اپنے ساتھ لاتی تھی۔"

"خُوب۔" اختر اُٹھ کر کتابیں دیکھنے لگا۔ ان میں آرٹ، میوزک اور ادب پر کتابیں تھیں۔ وہ تھوڑی دیر اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر بولا:

"مس روحی کو ڈرامہ میں کافی دلچسپی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اسٹیج اور ڈرامہ کے بارہ میں کافی کتابیں ہیں۔"

"ہاں بیٹا بہت ٹھیک جانچا تم نے۔ اُسے کالج میں کئی دفعہ بہترین اداکاری پر انعامات ملے۔ اور یہ چیز تو ورثہ میں ملی تھی۔ میں بھی اپنے زمانے میں ڈراموں میں بہت حصہ لیا کرتا تھا۔ ...... یہ کپ جو تم دیکھ رہے ہو۔ ان میں سے بیشتر مجھے انعام میں ملے تھے۔ میرے بارہ میں یہ مشہور تھا کہ جو رول میں ایک دفعہ ادا کرتا ہوں اس سے کئی ماہ تک چھٹکارا نہیں حاصل کر سکتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ میں جو کردار پیش کرتا تھا اس میں اپنے آپ کو بھول کر گم ہو جایا کرتا تھا۔ ڈرامہ میرے لیے کبھی ڈرامہ نہیں ہوا۔ بلکہ حقیقت بن جاتا ہے۔"

"خُوب۔ بہت خُوب۔" اختر بڑا متاثر ہوا۔

"اسی وجہ سے مجھے عام طور پر رونے والے کِردار مِلا کرتے تھے کیونکہ میک اپ والوں کو مصنوعی آنسو نہ بنانا پڑتے۔ اور میں سچ مچ رویا کرتا تھا۔ سٹیج کو میں ہمیشہ حقیقی دُنیا سمجھتا تھا۔"

"واقعی؟" اختر کچھ اور زیادہ متاثر ہوا اور اُس نے نسبتاً زیادہ احترام سے کپوں کی لمبی قطار کی طرف دیکھا۔ ایک کپ ذرا ٹیڑھا نظر آیا۔ اُس نے انگلی لگا کر دیکھا تو وہ بولے:

"ہاں ہاں یہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ دراصل اسے ہاتھ میں پکڑ کر روحی سائیکل چلا رہی تھی تو گر پڑی اور یہ ٹیڑھا ہو گیا۔"

تو گویا وہ سائیکل بھی چلاتی ہیں۔ اختر نے سوچا۔ اور دِل ہی دِل میں محظوظ ہوا کہ صاحب بڑے صحیح قسم کے باپ ہیں۔ لڑکی کے تعارف کا کوئی موقعہ نہیں چھوڑتے اختر کے ذہن میں رُوحی کی عادات کا خاکہ بن چکا تھا۔ اور اب وہ اُسے دیکھنے کا متمنّی تھا۔

اتنے میں ملازم ٹی ٹرالی دھکیلتا ہُوا چائے لے آیا۔

"اوہو۔ قبلہ آپ نے تو بڑا تکلف کیا۔ بھلا اس کی کیا ضرورت تھی۔"

"نہیں بیٹا نہیں۔ تم کھاؤ گے تو مجھے خوشی ہو گی۔ تمہارا ہی گھر ہے۔ ہم بوڑھے تو چند دن کے اور مہمان ہیں۔"

اختر ایک دم چونکا۔ انھوں نے بڑا واضح اشارہ دے دیا تھا۔ وہ رُوحی کا کافی مدّاح ہو گیا تھا۔ لیکن اِس یک طرفہ اعلان سے اُس کی خودداری کو ٹھیس سی لگی۔ کہ رضامندی کے اظہار کے بغیر وہ صاحب اپنے طور پر جو چاہیں کر لیں۔ بہر حال مناسب الفاظ نہ ملنے کی وجہ سے وہ خاموشی سے کیک کا ایک ٹکڑا اُٹھا کر کھانے لگا۔ اس کے بعد صاحبِ خانہ نے روزمرّہ کی باتوں پر گفتگو شروع کر دی۔ سوسائٹی میں عورت کا حصّہ، پردے کا رواج، آزادیٔ تقریر، معاشرے میں نمود و نمائش کی زیادتی، ادب،

آرٹ، کلچر، مذہب، سیاست وغیرہ —— اب اختر کے سامنے دُوسرا رُخ تھا۔ اُس نے محسُوس کیا کہ اُس کا میزبان مُختلف موضُوع چھیڑ کر اُس کی شخصیت کو جانچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جیسے ہر باپ اپنے ہونے والے داماد کو پرکھا کرتے ہیں۔ اِس لیے وُہ بھی سنبھل کر جواب دیتا رہا۔ اور اپنی کامیابی کا اندازہ کرتا رہا۔ میزبان بار بار اس کے خیالات کی مُطابقت ظاہر کرتے رہے۔ پھر ایک دم اُنھوں نے پوچھا۔

"بیٹا شادی کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟"

"کیسی رائے؟" اختر اس حِملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ وہ تو صرف دعوت کھانے اور حالات کا جائزہ لینے کو آیا تھا۔

"میرا مطلب ہے کہ بچّوں کو اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہیے یا والدین کی رضامندی سے؟"

اختر نے قدرے توقّف کیا پھر بولا "دونوں ہی طریقے ٹھیک ہیں۔ اگر لڑکے کے چناؤ میں والدین کو اِعتراض نہ ہو تو ٹھیک ہے۔ اگر والدین کے چناؤ میں لڑکے کو اِعتراض نہ ہو تو بھی درست ہے۔ ہماری سوسائٹی میں یکسانیت تو ہے نہیں۔ کئی شیڈ ہیں۔ اور ان کے باہمی حالات میں کافی اِختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لیے کوئی قاعدہ کلیّہ نہیں بنایا جا سکتا۔"

"اگر والدین اور بچّوں کو ایک دُوسرے کے چناؤ پر اعتراض ہو تو؟؟؟" وُہ جواب طلب انداز میں اُسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ اور پھر خُود ہی بولے "نہیں بیٹے نہیں قاعدہ کلیّہ بنانا پڑے گا۔ اور وُہ یہ ہے کہ بچّوں کی مرضی کو بہر حال افضل سمجھنا چاہیے۔ جو والدین ایسا نہیں کرتے وُہ بڑا گناہ کرتے ہیں —— وُہ بچّوں کے ساتھ ظُلم کرتے ہیں۔"

ویسے تو اختر خُوب جانتا تھا کہ بعض باکمال بزرگوں نے اپنی لڑکیوں کی کھپت کا طریقہ یہ نکالا ہے کہ لڑکوں کو ورغلا کر ان کے والدین کے خلاف اکسایا جائے

اور ان کی خود مختاری کو اپیل کرتے ہوئے اپنی لڑکی کی ماتحتی میں لے آئیں۔ وہ خود بھی ایسے کچھ لوگوں کے دام سے بچ چکا تھا۔ لیکن یہ صاحب تو کھلم کھلا اس اوچھے ہتھیار پر اتر آتے تھے۔ حالانکہ شکل و صورت سے خاصے بھلے مانس نظر آتے تھے۔ وہ حیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں وہ صاحب اٹھے اور اس کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ ”میری بات مانو اور شادی کے معاملے میں والدین کی پرواہ نہ کرو۔ اگر والدین میں ذرا بھی عقل ہے تو تمھارا ساتھ دیں گے خواہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔“ نہ جانے وہ کیوں جذباتی سے ہو گئے اور ایک دم منہ پھیر کر اندر چلے گئے۔

اختر قدرے پریشان سا بیٹھا تھا۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن کا ذکر ہمیشہ اشاروں کنایوں میں ہوتا ہے اور اگر ان کو کھلے الفاظ میں بیان کیا جائے تو پریشانی لازمی ہے۔ اس لیے پُر تکلف ملاقات میں لڑکی اور شادی کا اس انداز میں ذکر اختر کے لیے پریشان کن بن گیا۔ اور اب وہ رُوحی کو دیکھنے سے پہلے بھاگنا چاہتا تھا تاکہ اسے کچھ سوچنے کا موقعہ مل سکے۔ اور دامادی کی اس جبری بھرتی سے چھٹکارا مل جائے لیکن میزبان تو اندر چلے گئے تھے اور ان سے اجازت لینے کے لیے انتظار لازمی تھا۔ اس لیے وہ بیٹھا رہا۔ لیکن اُسے یقین تھا کہ وہ اپنی مہم کے سارے ابتدائی مراحل طے کر چکے ہیں۔ اور اب آخری داؤ کے لیے رُوحی کو لے آئیں گے۔ اب وہ کچھ اور بھی بے چینی اور خجالت محسوس کر رہا تھا۔

جب کافی دیر ہو گئی تو اُسے کچھ تشویش ہوئی۔ اُس نے گھڑی دیکھی تو ان کو اندر گئے پون گھنٹہ گزر چکا تھا۔

”شاید رُوحی تیار ہو رہی ہوگی۔“ اُس نے سوچا۔

اور پھر اپنی موجودگی کی یاد دلانے کو اُس نے ریڈیو گرام کا سوئچ دبا دیا۔ ریڈیو سیلون سے ثریا اپنی جذبیت سے بھرپور آواز میں کوئی سہانا گیت گا رہی تھی۔ وہ

گانا سُنے بغیر پاؤں کو تال دیتا گیا۔ اور جب تین گانے اور بھی ختم ہو گئے تو اُس نے تنگ آکر ریڈیو بند کر دیا۔ اتنے میں شبراتی دروازے کے باہر آیا۔

"ارے شبراتی ...... سُنو۔"

"جی صاحب"۔ وہ بھاگا ہوا آیا۔

"تمھارے صاحب کافی دیر سے اندر گئے ہیں۔ اُن کو ذرا بُلا لاؤ۔ تو میں چلوں پھر"

"بہتر جناب" اُس نے کہا اور دروازے میں غائب ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد وُہ بے دلی کے ساتھ واپس آیا۔ اور دروازے میں رُک کر اختر کو سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے؟ —— صاحب کہاں ہیں؟"

وُہ ایک قدم آگے بڑھا۔ پھر ٹھہر گیا۔ اور رُک رُک کر پُوچھنے لگا۔ "صاحب... آپ ... کنوارے ہیں؟"

ایک دم اختر کا خُون کھول اُٹھا۔ کس قدر ذلیل ہیں یہ لوگ۔ اُنھیں وضع کا کوئی خیال نہیں۔ جو سوال یہ کم بخت بُوڑھا نہیں پُوچھ سکا۔ وہ اس نے نوکر سے کہلوا بھیجا۔ لیکن نہ معلوم اُس نے کیسے غُصّہ ضبط کر کے دھیمے انداز میں کہا۔

"ہاں۔"

"تو پھر بہتر ہوگا۔ اگر آپ تین چار روز بعد صاحب کو مِل لیں۔"

"کیا مطلب؟" اختر غُصّہ اور حیرت سے کھڑا ہو گیا۔

"جی میرا مطلب ہے کہ اِس وقت وہ مِل نہیں سکتے ان کی ......"

اب اختر سے ضبط نہ ہو سکا اور اس کی بات ختم ہونے سے پہلے وہ جست لگا کر آگے بڑھا اور اس کا گلا دبوچنے لگا۔ "اُلّو ... سُور ... تمیز نہیں ہے تم لوگوں میں۔"

"چھوڑ دیجیے بابو جی ... چھوڑ دیجیے"۔ وُہ خرخرانے لگا۔

اختر نے اُس کا گلا چھوڑ دیا۔ اور بے صبری سے ڈپٹ کر پُوچھنے لگا "کیا ہے؟ بول! بتاتا کیوں نہیں؟؟"

"آیئے میرے ساتھ آیئے . . . . " وہ اپنے گلے کو ملتا ہُوا بولا۔ "میں دکھاتا ہوں آپ کو۔"

اختر اُس کے ساتھ ہو لیا۔ ایک کُھلے کمرے میں سے گُزر کر وہ کاریڈور میں پہنچے اور مُلازم نے اگلے کمرے کے دروازے کا پردہ ذرا سا ہٹایا اور اختر کو اندر جھانکنے کا اشارہ کیا۔

اختر نے ذرا سا کونہ ہٹایا اور دیکھا تو اندر اس کے میزبان پلنگ پر اوندھے لیٹے بلک بلک کر رو رہے تھے۔ اُن کے سامنے ایک حسین عورت کی قدِ آدم تصویر تھی اختر ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ مُلازم نے اُسے پکڑ لیا اور تقریباً گھسیٹتا ہُوا باہر بیٹھک میں لے آیا۔

"یہ کیا قِصّہ ہے شبراتی؟ کیا ہُوا ان کو؟" اختر دم بخود تھا۔

شبراتی نے دروازہ کا دروازہ بند کر دیا۔

"کیا پُوچھتے ہیں جناب —— رُوحی بی بی نے ایم اے کا امتحان دیا تو صاحب ایک دن واجد میاں کو گھر لے آئے، جن سے بی بی کا رِشتہ طے کیا لیکن روحی نے اِنکار کر دیا۔ کیونکہ وُہ کالج میں سائیکل سٹینڈ کے چوکیدار سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ بڑا جھگڑا ہُوا۔ صاحب نے بہت ڈانٹا تو —— ایک رات بی بی نے دوائی کھا کر خُودکشی کر لی —— اُس کے بعد سے صاحب ہر دُوسرے چوتھے ہفتے کسی کنوارے لڑکے کو پکڑ لاتے ہیں —— اُسی کرسی پر بٹھاتے ہیں۔ جہاں واجد میاں بیٹھتے تھے —— ٹھیک اُسی روز کی طرح چائے پلاتے ہیں —— اس سے رُوحی بی بی اور شادی کی وُہی باتیں دُہراتے ہیں جو واجد میاں سے کی تھیں —— اور پھر —— بعد میں رُوحی بی بی کی تصویر کے سامنے

لیٹ کر کتنی کتنی دِن روتے رہتے ہیں۔"

شبراتی خود بھی زمین پر بیٹھ کر رونے لگا۔ اختر دم بخود کھڑا رہ گیا۔ پھر اُس نے شبراتی کو ہاتھ سے پکڑ کر اُٹھانا چاہا تو وُہ سسکیاں لیتا ہوئے بولا " نہ معلوم صاحب یہ ڈرامہ کر کے ہمیں کیوں رُلاتے ہیں حضور؟"

(۱۹۶۱ء)

لمحہ

نیلی، بھوری سبز آنکھیں مجھے ٹکر ٹکر دیکھنے لگیں۔

"ڈارک بوا تے!" گول مٹول معصوم چہرے آپس میں سرگوشی کرنے لگے۔

"آئیے اگلے کمرے میں چلیں۔" منیجر نے قدرے توقّف کے بعد کہا۔ منیجر مُڑا تو ایک بچّے نے آنکھیں سکوڑ کر میرا مُنہ چڑایا۔ دُوسرے نے زبان باہر نکال کر آنکھ ماری اور میں ہنس کر ہاتھ ہلاتے ہُوئے باہر آ گیا۔

"یہ عورتوں کا سیکشن ہے" ہم ایک بڑے ہال میں داخل ہُوتے۔ "جو عورتیں کوئی کام نہیں کرتیں وُہ یہاں آ کر کشیدہ کاری کرتی ہیں۔ بعض اپنے گھروں کی مُختلف چیزوں پر پینٹ کرتی ہیں بعض کرسیاں بُنتی ہیں۔ سارا سامان اسکول مہیّا کرتا ہے۔"

دو ایک عورتیں میری طرف دیکھ کر مُسکرائیں۔ باقی کام میں مصروف رہیں۔ گو

سر جھکے ہونے کے باوجود انھیں علم تھا کہ کون آیا ہے اور کدھر کھڑا ہے۔ چند ایک بُوڑھی عورتوں کے ہونٹ بے آواز ہل رہے تھے۔ کیا کرتیں بے چاریاں؟ بولنے کی عادت اور اسکول کے قواعد، دونوں سے مجبور تھیں۔

"دراصل اسکول کا مقصد یہ ہے کہ پنگوڑے سے قبر تک ہر عمر کے فارغ اوقات کا مفید استعمال کیا جائے۔" مینیجر عالی شان سیڑھیوں پر مجھے راستہ دکھا رہا تھا۔ "ہر عمر کے لوگ اسکول کے مختلف حصوں میں اپنی دلچسپی کے مطابق کام کرتے اور وقت گزارتے ہیں اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جو لڑکے اور لڑکیاں فارغ ہونے کی وجہ سے ٹیڈی لوائز اور گرلز بنتے، وہ اب سُدھر گئے ہیں۔ یہ یوتھ سیکشن ہے۔"

بہت بڑے حال کے چکنے فرش پر کئی لڑکے اور لڑکیاں اُوٹ پٹانگ سی موسیقی کے ساتھ رقص کر رہے تھے، دو ایک جوڑے اس ابتدائی مرحلے سے گزر کر دیواروں سے لگے بوس و کنار میں مصروف تھے۔ ہمیں آتا دیکھ کر دوسروں نے انھیں ٹھوکے دیے اور وہ بھی ڈانس میں شریک ہوگئے۔ راک این رول سے متاثر ہوتی ایک چنچل لڑکی نے مجھے لاوارث اجنبی سمجھا اور دیکھتے ہی دو انگلیاں چوم کر ہاتھ میری طرف لہرایا۔ لیکن مینیجر پر نظر پڑتے ہی دو جستوں میں دروازے سے باہر بھاگ گئی۔ مجھے جھینپتا دیکھ کر مینیجر میرا دل رکھنے کو بولا۔ "کاش آپ کی جگہ میں ہوتا مسٹر قریشی ۔ ۔ ۔ بشرطیکہ اس بچی کی جگہ کوئی بالغ لڑکی ہوتی۔"

"یہ تیرنے کے لیے تالاب ہے۔" چند ایک بچے غڑاپ غڑاپ چھلانگیں مار گئے۔ بلوری پانی میں ان کے دودھیا جسم ٹیڑھے بینکے اور چپٹے نظر آنے لگے۔

مینیجر اپنے ساتھ لیے مجھے سوہام کا اسکول دکھاتا رہا اور ساتھ ساتھ چٹکلے کہتا ہوا انگریز قوم کے مخصوص اور لاثانی ذوقِ مزاح کا مزہ دیتا رہا۔ قصبے کا یہ اسکول محض کہنے کو اسکول تھا۔ ورنہ دراصل ہر عمر کے لوگوں کے لیے نہایت عمدہ کلب تھی۔ جس کی چھوٹی سی دُنیا شام کے قریب آباد ہوتی تھی۔ انگلستان بھر میں ایسے کلب صرف درجن

بھر ہیں اور مفید کام کر رہے ہیں۔ لائبریری، کھیلیں، جمنیزیم، کینٹین، ٹیلی ویژن رُوم، سینما ہال، لاؤنج وغیرہ ہر چیز موجود تھی اور میں اس وسیع عمارت میں اتنی مکمل تفریح گاہ اور اسکول دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ جس میں سوہام کے علاوہ اِردگرد کے قصبوں سے بھی لوگ شرکت کرنے کے لیے آتے تھے۔ اور اپنے فارغ اوقات کو اِنتہائی مفید طریقے سے گزارتے تھے۔

"یہ ہمارا آرٹ سیکشن ہے۔" ایک بہت بڑے ہال میں مُختلف حصّے تھے۔ بُت تراشی، آئیل پینٹنگ، واٹر کلر پینٹنگ، سکیچنگ وغیرہ۔ اِدھر اُدھر کینوس، فریم، برش، پنسلیں وغیرہ پڑی تھیں۔ کسی کسی جگہ کوئی شوقین مرد عورت کام کر رہے تھے۔

"ہلو جان!" مینیجر ایک بُوڑھے کے پاس رُک گیا۔ "کس منزل پہ ہے تمھاری تصویر؟"

"اِس میں ہے مسٹر وائن۔" وُہ ردّی کی ٹوکری کی طرف اِشارہ کر کے خفگی سے بولا۔

"ارے! پھر پھاڑ ڈالی تم نے۔"

"تو کیا مجھے اپنی چیز پھاڑنے کا بھی حق نہیں؟" وُہ لمبے برُش کو تارپین کے تیل سے دھوتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ میری موجودگی سے مینیجر کچھ کھسیانا سا ہُوا۔ لیکن شکست کے لمحات میں جانا نہیں چاہتا تھا۔

"لیکن ہُوا کیا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مِس ٹیلر تو یہی کہے گی کہ کچھ نہیں ہُوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میری تصویر کا ستیاناس کر ڈالا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اسے کئی سالوں کا تجربہ ہے۔ تو ضروری ہے کہ وُہ سارا میری تصویروں میں ہی گھسیڑا جائے؟ وُہ لڑکی ہے اب تصویر اُدھر۔ ۔ ۔ جتنی چاہے اس میں تصحیح کر لے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

وُہ سخت غُصّہ میں تھا۔ اس کے بُوڑھے ہونٹ پھڑک رہے تھے اور بجلی کی روشنی

میں رال کی بوندیں ان کے کونوں میں چمک رہی تھیں ویسے بھی وہ کافی غلیظ تھا۔ ایک آنکھ سے پانی رس رہا تھا، چپٹے نتھنوں میں سے گچھا بھر بال باہر کو جھانک رہے تھے۔ ٹائی گلے میں ویسے ہی لٹکی ہوئی تھی جس کی گرہ خصوصیت سے میلی تھی۔ اسے غصہ میں دیکھ کر مینجر نے موضوع بدل دیا۔

"اچھا ان سے ملو۔ مسٹر قریشی۔ ہمارے نئے میڈیکل آفیسر۔"

اس نے میری طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ اور پھر اپنی تصویر کے ٹکڑوں میں دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد ایک دم سے "گڈ نائٹ" کہہ کر چل دیا۔

"یہ بھی عجیب آدمی ہے۔" مینجر ہنس کر کہنے لگا۔ "کہتا ہے تصویر خالص میری ہو۔ اس میں مس ٹیلہ بھی تصحیح نہ کرے جو اس سیکشن کی انچارج ہے۔ اور کام سکھاتی ہے۔ آج اس نے کوئی درستی کی ہوگی۔ تو اس نے تصویر پھاڑ ڈالی۔"

"یہ کیوں؟ بہت اچھا آرٹسٹ ہے؟"

"اچھا آرٹسٹ؟" مینجر ہنسنے لگا "برش تک پکڑنا تو آتا نہ تھا۔ جب یہ ہمارے پاس آیا۔ اس کی ہسٹری بھی خوب دلچسپ ہے۔ قریباً دو سال پہلے یہ ہماری کلب کا ممبر بنا۔ پہلے ہی دن سے اس سیکشن میں آنے لگا۔ اسکول کے باقی شعبوں سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ یہیں آتا ہے، سب سے پہلے آتا ہے اور سب سے آخر میں جاتا ہے سخت محنتی آدمی ہے۔ تعجب ہے ساٹھ برس کی عمر میں اتنا کام کیسے کر لیتا ہے، جان توڑ کر کام سیکھا ہے اس نے۔ اور جب سے آیا ہے حیرت انگیز ترقی کی ہے، اب بڑی عمدہ تصویر بنا لیتا ہے معلوم نہیں اس عمر میں اسے کیا جوش آیا ہے؟ اور پھر مزہ یہ کہ پچھلے چند دنوں سے اصرار کرتا ہے کہ اپنی تصویریں آپ ہی بنائے گا۔ اور کسی کو اس میں تصحیح نہ کرنے دے گا...... سگریٹ پئیں گے آپ؟"

"شکریہ" اور ہم آگے چل دیے۔

اگلے روز سے میں نے کام پر جانا شروع کر دیا۔ کام کچھ زیادہ نہ تھا۔ پارٹ ٹائم

ملازمت تھی، میں لندن سے ایم۔ آر۔ سی۔ پی کرنے کے بعد ایک آدھ ڈپلوما اور کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ فائدہ تھا کہ کچھ رقم مل جانے سے مُفت میں پڑھ جاؤں گا۔ اور پاکستان میں میرے والدین کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ وہ اپنے ملنے والوں میں چند ماہ اور ڈینگیں مار سکیں گے کہ اپنے بچے کو انگلینڈ میں بڑی مُشکل سے پڑھا رہے ہیں۔ یہاں ہفتے میں دو چار روز صرف دو گھنٹے کے لیے آنا ہوتا تھا۔ اور مریضوں کی معمولی تکالیف کے لیے دوائی تجویز کر دیتا تھا۔ گو اسکول کے ممبر کوئی اڑھائی سو کے قریب تھے۔ لیکن زیادہ تر نیشنل ہیلتھ اسکیم میں اپنے ڈاکٹروں سے دوائی لیتے تھے۔ مجھے تو اسکول نے محض سہولت کے لیے میڈیکل آفیسر رکھا ہوا ہے۔ تھوڑے کام کے لیے کافی رقم مل جاتی تھی۔ جو ہمیشہ سے پاکستانیوں کا آئیڈیل رہا ہے اور ساتھ ہی ان لوگوں کی زندگی دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ جس کا مجھے خصوصی طور پر بہت شوق تھا۔ اس لیے تھوڑی دیر اپنے کمرے میں مریض دیکھنے کے بعد میں اِدھر اُدھر مختلف شعبوں میں چکر لگاتا رہتا۔ کچھ دنوں بعد سبھی لوگ میرے دوست بن گئے۔

ایک روز جان میرے پاس آیا۔ گزشتہ تین روز سے سخت برف باری ہو رہی تھی۔ اور اس کے ہاتھوں کی انگلیاں سردی سے سوج گئی تھیں۔ وہ بڑی بے صبری سے دروازہ میں داخل ہوا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر میز پر رکھ دیں۔ اور بڑے تیز انداز میں پوچھنے لگا۔

"ڈاکٹر! میری ان انگلیوں کو جلد از جلد کب تک ٹھیک کر سکتے ہو؟"

"ایک ہفتے میں" اس کے پوچھنے کے انداز سے چڑ کر میں نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"نالائق ہو تم سب ڈاکٹر" اُس نے زور سے میز پر مکا مارا اور چیخنے لگا "نکمے ہو ــــــ بالکل نکمے۔ کچھ نہیں آتا تم لوگوں کو۔۔۔۔۔"

اس کے لال منہ اور رال بھرے ہونٹوں سے الفاظ بڑی تیزی سے نکل رہے تھے۔

"ابھی میں اپنے ڈاکٹر کے پاس گیا تو وہ بولا کہ علاج کے لیے کئی روز چاہئیں اور اب

تم کہتے ہو کہ ہفتہ چاہیئے۔ کیا یہی سیکھتے ہو تم لوگ کہ معمولی بیماری کو لمبا کر دو۔"

"مسٹر جان"! میں حیران بھی تھا اور غصّہ میں بھی۔" اگر تم ڈاکٹر سے علاج کی توقع رکھتے ہو تو ڈاکٹر بھی اپنے مریضوں سے باعزت برتاؤ چاہتا ہے۔"

"اپنے آپ کو ڈاکٹر مت کہو۔" وہ چِلّایا " اگر تم یہ انگلیاں شام تک ٹھیک نہیں کر سکتے تو تم ڈاکٹر نہیں ...... ہرگز نہیں"۔ اس کے تھوک کے چند قطرے میرے بازو پر گرے۔ آنکھ سے بہتا ہُوا پانی رُخسار کی جھرّیوں میں چمک رہا تھا۔ چپٹی ناک سے جھانکتے ہُوئے بال اسے اور بھی خشمگیں بنا رہے تھے اور گنجے سر کی چمک کے نیچے غیر ہموار شیو پر جھرّیاں مچل رہی تھیں۔ ٹویڈ کے بھاری کوٹ میں اس کا بُوڑھا جِسم اُچھلنے لگا" تمہارے لیے میں ایک مریض ہُوں محض ایک مریض۔ بالکل عام مریضوں کی طرح۔ لیکن تمھیں کیا پتہ میرا وقت قیمتی ہے —— بہت قیمتی ڈاکٹر۔ میں کوئی نالائق ڈاکٹر نہیں جو مریضوں کی بیماری کو کھلونا بنا کر وقت گزارتا ہے۔ مجھے کام کرنا ہے۔ ... ڈاکٹر سُن رہے ہو یا نہیں؟"

"میں خُوب سُن رہا ہُوں مسٹر جان۔ اور سوچ رہا ہُوں کہ پہلے تمہاری انگلیوں کا علاج کروں یا دماغ کا؟"

وُہ اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ مجھ پر نظریں گاڑ کر اُس نے میرا مُوڈ جانچا اور پھر گڑگڑایا:

"اوہ پلیز ڈاکٹر —— آئی ایم سوری —— ویری سوری۔ میرا مقصد گستاخی ہرگز نہ تھا۔ تمھیں میری دماغی حالت کا صحیح اندازہ نہیں —— بات دراصل یہ ہے کہ مجھے اپنی تصویریں ختم کرنا ہیں۔ اور اس کے لیے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں بوڑھا آدمی ہوں تم دیکھتے ہو۔ میری صحت بھی ٹھیک نہیں۔ نہ معلوم اس سال کی سردی میں کس وقت مر جاؤں ...... میں مرنے سے نہیں ڈرتا ڈاکٹر ... لیکن ...

لیکن مرنے سے پہلے تصویریں ختم کرنا چاہتا ہُوں .... پلیز ڈاکٹر ...." اس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے" مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

اس کے مُوڈ کی یہ تبدیلی کافی حیران کُن تھی۔ اور اس سے زیادہ تصویروں کا ذِکر۔

جس کا اندازہ چند روز پہلے مینیجر مجھے دے چکا تھا اس لیے مجھے دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ اور بولے اس لیے میں نے بظاہر بے زاری کا بھرم قائم رکھا۔

"دیکھو ڈاکٹر تم ابھی جوان ہو۔ ۔ ۔ ۔ فرض کرو۔ ۔ ۔ ۔ تم اپنی گرل فرینڈ کو بڑا پیارا خط لکھ رہے ہو اور قلم ٹوٹ جاتا ہے تو تمھیں قلم پر غصہ آئے گا یا نہیں؟"

"آئے گا۔" میں دل میں خوش ہوا کہ وہ صحیح لائن پر آ رہا ہے۔

وہ پھر غصے سے دھاڑ اٹھا "تو پھر تم میرے ہاتھ کیوں نہیں ٹھیک کر سکتے؟؟ تم مجھے کیوں نہیں سمجھ سکتے؟؟ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اوہ معاف کرنا ڈاکٹر ۔ ۔ ۔ ۔ سوری۔سوری ۔ ۔ ۔ ۔" وہ خجالت سے ہاتھ ملنے لگا۔ غصے کی لالی شرم سے بدل گئی۔

وہ محجوب سا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"ڈاکٹر اگر میرا قیاس درست ہے تو تم مذہبی خیالات والے آدمی نظر آتے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمھیں دعا پر اعتبار ہے نا؟ ہے نا؟؟ اور دعا بھی ایک دکھے ہوئے دل کی! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر میں تمھارے لیے دعا کروں گا ۔ ۔ ۔ ۔ بڑی دعا کروں گا۔"

وہ مجسم التجا تھا۔ اس کے چہرے کی جھریاں لجاجت سے پھڑکیں۔ اور اس کی دوسری آنکھ کو بھی بتدریج گیلا ہوتا دیکھ کر میں اپنی ساری انانیت بھول گیا۔ آگے بڑھ کر میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور دلاسہ دیتے ہوئے کہا "جان! میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔ انشاءاللہ تم کل صبح تک بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"تھینک یو ۔ ۔ ۔ ۔ سر!" اس کے روندھے ہوئے گلے سے آواز پھنس کر نکلی اور بازو اُٹھا کر وہ آستین سے آنکھ کا پانی پونچھنے لگا۔

میں نے اسے ایک مرہم لگانے کو دی۔ ایک انجکشن لگایا اور ساتھ ہی اپنا تیر بہدف دیسی علاج آزمایا۔ میں نے کہا کہ رات کو پانی میں شلغم اُبال کر سوتے وقت اس میں گھنٹہ بھر انگلیاں ڈبوئے رکھے اور پھر ہوا سے بچاتے ہوئے سو جائے۔ وہ دل ہی دل میں اس علاج پر تعجب کرتا چلا گیا۔

دُوسرے روز وُہ بھاگا ہُوا میرے کمرے میں گھُس آیا، بچّوں کی طرح اُنگلیاں پھیلاتے ہُوئے وُہ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ "میری انگلیاں ٹھیک ہو گئی ہیں ڈاکٹر، بالکل ٹھیک...... دیکھو۔" وہ بار بار مُٹھی بند کرنے اور کھولنے لگا۔

"بالکل ٹھیک...... میں برش بالکل ٹھیک چلا سکتا ہُوں۔" جھٹ سے اس نے سگریٹ نکال کر مجھے پیش کیا اور جب میں جھک کر اس کے ہاتھوں کے ہالے میں سے سگریٹ سُلگا رہا تھا تو وہ بولا۔

"میں حیران ہوں ڈاکٹر۔ تم لوگ یہاں طِب پڑھنے کیوں آتے ہو۔ جب تمھارے اپنے مُلک میں اتنے اچھے علاج موجود ہیں۔ میرا ہونق ڈاکٹر کہتا تھا۔ کہ سب کام چھوڑ دو اور بند کمرے میں بارہ روز بیٹھے رہو...... میں اسے آج ہی کہوں گا کہ وُہ اعلیٰ تعلیم کے لیے پاکستان جائے۔"

انگلستان میں دُھوپ بارانی نالوں کے طوفان کی طرح ہے، کبھی کبھار ایک دم سُورج دانت نکال دیتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دبیز دھند اسے نگل جاتی ہے۔ ایک شام خلافِ توقع دِن نسبتاً چمکیلا تھا اور میں مینیجر کے کمرے کے سامنے بالکونی میں اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سُورج کی کرنیں ہلکے کہرے سے لڑتی جھگڑتی ہم تک پہنچ ہی جاتی تھیں اور ہم ہاتھوں سے دستانے اُتار کر انگلیوں پر خوشگوار حدّت محسُوس کر رہے تھے۔ بالکونی کے نیچے گھاس سے بھرپُور دالان روشنی کی وجہ سے بہت نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ اور اس کے پرے شیشے کی بڑی کھڑکی میں سے سونی نظر آ رہی تھی۔ جو ڈانسنگ ہال میں سے کسی "بلے لے" (BALLET) کی پریکٹس کر رہی تھی۔ اٹھارہ سالہ سونی بہت حسین لڑکی تھی۔ اور کمر سے نیچے پھیلے ہُوئے لباس میں کسی پری کی مانند لہرا رہی تھی۔ بوڑھے مینیجر کے ساتھ مشرق اور مغرب کے تضاد کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ جو کہ اس کا محبوب موضوع تھا۔ کیونکہ اس نے اپنی ساری زندگی ہندوستان میں بطور

آئی۔سی۔ایس کے گزاری تھی۔

"میرے خیال میں مسٹر قریشی مشرق کی پسماندگی کی تین وجوہ ہیں۔ ویسے تو وجہ ایک ہی ہے۔ میرا مطلب ہے غیر ضروری پابندیاں لیکن اس کی تین شکلیں ہیں۔ ایک تو ہیں۔ سوشل اقدار کی پابندیاں۔ آپ کی زیادہ تر قدریں منفی ہیں۔ آپ کے معاشرے میں لفظ "نہ" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ نہ کرو۔ وُہ نہ کرو۔ ایسا نہ کرو وغیرہ ___ دُوسری چیز ہے فیملی سسٹم کی پابندیاں وہاں کے گھریلو نظام میں بلاشُبہ اچھی باتیں بھی ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر یہ اِتنا سخت گیر ہے کہ بیشتر بچّوں کی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے۔ اور تیسری ہے مذہب کی بگڑی ہُوئی شکل اور اس پر بنائی ہُوئی اقدار جو اتنی سخت گیر ہیں کہ فرد کچل جاتا ہے...... یعنی یہ میرے اپنے مشاہدات ہیں ممکن ہے آپ متفق نہ ہوں۔ میرا خیال ہے......"

"معاف کرنا مسٹر وائن...." میں نے چور نظروں سے سونی کی پتلی کمر اور گداز سینے کی طرف دیکھتے ہُوئے بات کاٹی "مجھے آپ کی بات سے سو فی صدی اِتفاق ہے لیکن.... اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جو آپ بھول رہے ہیں..... اور وُہ ہے مغرب کی ریشہ دوانیاں جس نے مشرق کو ادھ موا کر دیا ہے اور ہماری خوبیوں کو ہماری ہی نظروں میں مشکوک بنا دیا ہے۔"

مینجر ہر انگریز کی طرح اِس بات پر جذباتی ہو جاتا تھا۔ اس لیے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ وہ خفگی سے کچھ کہنے کو ہی تھا کہ ایک دم مِس ٹیلر پاؤں پٹختی کمرے میں آئی اور بالکونی میں آکر تیزی سے بولی۔

"مسٹر وائن۔ اِس بُوڑھے پاگل کو میرے سیکشن سے ہٹا لو۔ میں ایک منٹ بھی اس کے ساتھ کام نہیں کر سکتی...... اِیڈیٹ کہیں کا۔" وُہ غصّے میں بھول گئی کہ مینجر سے بات کر رہی ہے۔

"کیا قصّہ ہے مِس ٹیلر؟ کس بُوڑھے کا ذِکر ہے؟" مینجر حسبِ معمول بڑے ٹھنڈے

انداز میں بولا اور بجلی کے ہیٹر پر اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔
"میں جان کی بات کر رہی ہوں مسٹر وائن ..... وہ میرے ساتھ بالکل تعاون نہیں کرتا ـــــ بلکہ صریحاً گستاخ ہے، سب کے سامنے میری بے عزّتی کرتا ہے۔ میرا سارا ڈسپلن خراب کرتا ہے۔ میں اب اسے برداشت نہیں کر سکتی یا آپ اسے اسکول سے نکال دیں، ورنہ میں مُلازمت چھوڑ دوں گی۔"
مس ٹیلر مغرب کی ان مظلوم عورتوں میں سے تھی جنھیں وہاں کی نکتہ چین سوسائٹی قدرت کی لاپرواہی کی سزا عمر بھر دیتی رہتی ہے۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ بدصورت اور لاغر پیدا ہوئی تھی جو کہ وہاں کے کورٹ شِپ والے نظام میں ایک ناقابلِ معافی جُرم ہے۔ بھڑکیلے اور سبک تراش والے لباس اور میک اپ کے سائنٹفک طریقے اس جرم کی تلافی نہ کر سکے۔ ڈامن کے انجکشن اس کی نوکدار ہڈیوں پر گوشت نہ چڑھا سکے۔ اور ربڑ کی چھاتیاں اور پلاسٹک کے کولھے اس کے حسن کو وہ بلندیاں نہ دے سکے جن پر سے ملاقاتی مرد پھسل کر خاوند بن جاتے ہیں۔ اس کی زندگی میں تو ہر پھل کا مزہ چکھ کر آگے بڑھ جانے والے مرد آئے تھے اور یا پھر وہ جو ڈانسنگ ہال میں عورتوں کی کمی کی وجہ سے اس کے ساتھ ڈانس کرنے اور ایک آدھ ڈرنک زہر مار کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ خاوند کی تلاش اس کا مسلسل روگ بنی رہی تھی۔ اور اب بالکل ناامید ہو کر چالیس برس میں وہ کسی چھوٹے قصبے کے ریلوے اسٹیشن کی طرح تھی۔ جہاں سے تھوڑی دیر پہلے میل ٹرین دنادن کر کے گزر چکی ہو اور اب جھنڈی ہلانے والا بھی کوئی نہ ہو۔ اب وہ چڑچڑی تھی اور جذبات کے مسلسل ہیجان کے بعد جو ٹھہراؤ اس کی طبیعت میں آیا تھا۔ وہ مردوں سے نفرت کی صورت اختیار کر گیا تھا اِس لیے بےچارے جان پر وہ اس کی خطا سے بہت زیادہ برستی رہتی تھی۔ اور مینیجر اس بات کو خوب سمجھتا تھا۔
"آخر ہُوا کیا ہے؟" مینیجر سگریٹ سلگانے لگا۔
"وہ بدتمیز ہے۔ جاہل۔ گدھا ہے ....."

"وہ تو میں جانتا ہوں۔ مس ٹیلر کہ آپ کافی گدھا شناس ہیں۔ لیکن آج کیا ہوا؟"

"اسے تمیز نہیں کہ عورتوں سے بات کیسے کرتے ہیں۔" مس ٹیلر نسوانی غصے کے اس نقطے پر پہنچ گئی تھی جہاں کان بند ہو جاتے ہیں۔ اور زبان کھل جاتی ہے۔ "میں کوئی گری پڑی عورت نہیں۔ اس سیکشن کی انچارج ہوں۔ اور دس سال سے اسی اسکول میں کام کر رہی ہوں۔"

مینیجر نے غصیلی عورت سے نپٹنے کا آخری حربہ استعمال کیا اور اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔

میں نے موقع غنیمت جان کر ڈائننگ ہال کی طرف نگاہ ماری۔ سونی ایک ٹانگ فضا میں اٹھائے جسم کو زمین کے متوازی پھیلائے دوسرے پنجے پر لٹو کی طرح گھوم رہی تھی۔ . . . "بات یہ ہے مسٹر وائن کہ آج وہ تصویر بنا رہا تھا۔ اور آسمان پر نیلا رنگ چڑھانے لگا تو میں نے کہا کہ یہاں ہلکے سبز رنگ میں اودا رنگ ملا کر لگاؤ تو نیچے کی زمین زیادہ نکھری ہوئی معلوم ہوگی۔ لیکن کہنے لگا کہ جب تم اپنی تصویر بناؤ گی تو جو چاہے کرلینا مجھے اپنی مرضی کا رنگ لگانے دو۔ جب میں نے سمجھانا چاہا تو کہتا ہے . . . . . بوڑھی چڑیل . . . . . میں یہ ہرگز . . . . ."

"اوہ! یہ بات ہے۔" مینیجر نے اخبار ایک طرف رکھ کر سگریٹ کا لمبا کش لیا۔ "تشریف رکھیے مس ٹیلر . . . . . بیٹھیے . . . . . بیٹھیے بھی۔"

مس ٹیلر کا سپاٹ سینہ غصے سے ہانپ رہا تھا۔ اور وہ بیٹھنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ مینیجر نے سگریٹ بجھا کر ایش ٹرے میں ڈال دیا اور مس ٹیلر کو ابھی تک کھڑے دیکھ کر کہنے لگا۔

"یہ واقعی اس کی حماقت ہے کہ ایک جوان حسین لڑکی کو بوڑھی چڑیل کہہ رہا ہے۔"

مس ٹیلر کے ناراض چہرے پر خفیف مسکراہٹ اور سرخی کی ہلکی سی لہر لمحہ بھر کو دوڑی اور وہ قدرے نرم ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"دیکھیے مس ٹیلر" مینیجر سمجھانے لگا۔ "میں جانتا ہوں۔ جانی بدتمیز بھی ہے اور جذباتی بھی ہے۔ لیکن آپ کو پتہ ہونا چاہیے کہ ساٹھ برس کا بوڑھا بالکل بچے کی مانند ہوتا ہے فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ بچہ جسمانی آرام مانگتا ہے۔ اور بوڑھا ذہنی سکون لیکن اس

کے مانگنے کا طریقہ دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔ یعنی ضد۔ جذباتی پن اور غصّہ۔ اور بحیثیت اِس سیکشن کے انچارج کے تمھارا فرض ہے کہ ہر آدمی سے اسی کے مزاج کے مطابق برتاؤ کرو......"

"وہ تو میں کرتی ہوں لیکن......"

"میری بات سُن لو مِس ٹیلر" وہ اپنی جیب ٹٹولنے لگا "ہمیں ویسے بھی اس کے شوق کی قدر کرنی چاہیے۔ ساٹھ سال کا بوڑھا جس کی ایک آنکھ پتھر کی ہے۔ اس تندہی سے کام کرتا ہے۔ یہ ہمارے سائنٹفک میڈیکل آفیسر بیٹھے ہیں ان سے پُوچھ لو اس قسم کے آدمی کے لیے ایک آنکھ سے کام کرنا کتنا تکلیف دہ ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ جان توڑ کام کرتا ہے۔"

مینجر نے پائپ نکالا اور اس میں تمباکو جمانے لگا۔

"ویسے بھی مِس ٹیلر۔ ہمارے اس اسکول کا مقصد لوگوں کے فارغ اوقات کا مفید استعمال کرنا ہے اس لیے جب لوگ یہاں آئیں تو ان کو یہ محسوس نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کوئی کام خلافِ مرضی کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ اُن کے لیے ایک تفریح ہونی چاہیے...... بائی دی وے مِس ٹیلر! آپ اس بوڑھے کے ماضی کے بارے میں کچھ جانتی ہیں؟"

"نہیں مسٹر وائٹ...... اور نہ ہی میرا خیال ہے اس کے ماضی کا علم میری عقل میں کچھ اضافہ کرے گا۔"

"ضرور کرے گا مِس ٹیلر۔" مینجر نے پائپ میں دیا سلائی لگا کر سانس اندر کھینچا۔ تو دیا سلائی کا شعلہ تمباکو پر جا چکا۔ اُس نے دھوئیں کے دو تین بھبکے چھوڑے "شاید تمھیں معلوم نہیں کہ یہ انڈین فوج میں افسر تھا وہاں سے میجر ریٹائر ہوا تھا۔ اور یہ بہت عمدہ افسر تھا۔ دُوسری جنگِ عظیم میں اس بے جگری سے لڑا کہ اسے تین بار بہادری کے تمغے ملے اور سب سے بڑا تمغہ تو اس کی پتھر کی آنکھ ہے جو اس نے اٹلی کے مورچے پر لڑتے ہوئے گنوائی...... یہ تمباکو بہت عمدہ ہے مسٹر فرینٹی۔ اگر پائپ پیتے ہو تو

ضرور استعمال کرنا...... لڑائی کے میدان میں اس نے کبھی اپنی جان کی پرواہ نہیں کی اسی لیے یہ کمانڈو دستوں کا انچارج ہوتا تھا۔ جو بہت مشکل کام ہوتا ہے ...... یہ ہماری فوج کی ناک تھا۔ اور ایسے لوگوں کا اسکول میں آنا باعثِ عزت ہے ...... یہ ... یہ پائپ بھی عجیب مصیبت ہوتا ہے بار بار بجھ جاتا ہے۔"

وہ ماچس ڈھونڈنے لگا۔ میں نے لائٹر جلا کر آگے کیا۔

"تھینک یو ڈاکٹر۔" دھوئیں کے غلاف میں سے میری طرف کنکھیوں سے دیکھتا ہوا بولا "ہمیں ایسے لوگوں پر فخر ہے مسٹر قریشی جس کی وجہ سے انگریزی سلطنت دنیا بھر میں پھیلی رہی۔" وہ میری گزشتہ دلیل کا بدلہ لے رہا تھا۔

"آپ کو اپنے سیکشن میں کام ہوگا مس ٹیلر.... آپ جان کو دو بجے میرے پاس بھیج دیں تو میں اسے سمجھا دوں گا کہ آئندہ آپ کے ساتھ عزت سے پیش آیا کرے اور بدتمیزی نہ کرے۔"

مس ٹیلر ڈھیلے قدموں سے دروازے کی طرف ایسے چلی جیسے ایک تجربہ قلفی والے کو بتا کہ باپ سے پیسہ مانگنے آتا ہے تو باپ پیسہ دینے کی بجائے گھڑک دیتا ہے۔

جونہی دروازہ کھول کر میں اسکول میں داخل ہوا گرم فضا نے میرے منجمد چہرے کو خوشگوار لپیٹ میں لے لیا۔ سردی سے سُن ہوتے ناک میں کوئی یخ بستہ رگ گرم ہو کر نرمی سے پھیلی اور میں بے اختیار چھینک دیا۔ ٹھنڈے چہرے پر گرم سکون ہولے ہولے چھٹنے لگا۔ اور میں سینٹرل ہیٹنگ سسٹم کو دعائیں دیتا ہوا ڈفل کوٹ پر سے برف جھاڑنے لگا۔ کلوک روم میں جا کر کوٹ اور ٹوپی اتار کر ٹانگے اور لاؤنج کی طرف لپکا جس کے کونے میں کینٹین تھی اور مجھے گرم گرم کافی کی سخت طلب تھی۔

لاؤنج کا دروازہ سارا شیشے کا تھا اور داخل ہونے سے پہلے میں نے دیکھا کہ ایک گول میز پر سوزی ٹانگیں لٹکا کر بیٹھی ہے۔ اور لڑکے لڑکیاں مرد عورتیں، اس کے گرد کرسی،

اسٹول، صوفے، فرش وغیرہ پر بیٹھے ہیں۔ دروازے سے باہر آواز تو نہ آتی تھی گو یہ پتہ چلتا تھا کہ سب مل کر گا رہے ہیں۔ سونی سر کے ساتھ ٹانگیں ہلا رہی تھی اور اپنے ٹھنڈے چہرے کو چھوتا ہوا میں ایک دفعہ پھر حیران ہوا کہ یورپی عورتیں اتنی ٹھنڈک میں صرف نائیلون کی پتلی جرابوں سے ٹانگیں ڈھانپ کر نہ معلوم کیسے گرم رہتی ہیں۔ سونی میرے اس خیال سے بے خبر گانے میں مصروف تھی پہلے وہ بازو ہلا کر مصرعہ اٹھاتی اور پھر سب مل کر کورس گاتے۔ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا۔ سب کا کورس فضا میں ابھرا۔

IT IS A JOLLY SATURDAY EVENING ; AND I HAVE NO GIRL

WITH ME !

میں کافی کی پیالی ہاتھ میں لیے آتشدان کے قریب چلا گیا، اور کافی کی چسکیاں لیتا ان کے گانے سنتا رہا۔ بوڑھے بچے جوان سبھی بے خود ہو کر گا رہے تھے۔ بیبڑ اپنا باجہ منہ سے بجا رہا تھا۔ سونی آج سرخ رنگ کا فراک پہنے تھی۔ اور گلے میں پیلی دھاری والا کالا مفلر تھا۔ سر کی تال پہ جھٹکنے سے بھورے بال خوبصورتی سے لہراتی ہوئی چٹک کے ساتھ ہلتے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اس علاقے میں سونی یقیناً سب سے زیادہ حسین لڑکی ہو گی۔ کافی ختم کر کے میں ان کے گانے سنتا رہا۔ میرا دل بھی چاہا کہ ان کی طرح گاؤں اور خوشی میں بھول جاؤں لیکن مشرقی شرم مانع رہی۔ جب میں باہر نکلنے لگا تو جان کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر "ہلو ڈاکٹر" کہا اور ٹھٹھک کر سونی کو دیکھنے لگا۔ خوبصورتی میں کتنی کشش ہے۔ میں نے سوچا۔ سوکھے دھانوں میں بھی پانی پڑ جاتا ہے۔ لیکن دروازے سے نکلنے سے پہلے میں بھی مڑ کر سونی کو دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اب صوفے کی ٹیک کا سہارا لیے کسی یونانی دیوی کی طرح دونوں ہاتھ فضا میں اٹھا کر گا رہی تھی اور باقی سب لوگ آواز ملا رہے تھے۔

SUGAR IN THE MORNING, SUGAR IN THE EVENING,

SUGAR AT SUPPER TIME. BE MY LITTLE SUGAR,

AND LOVE ME ALL THE TIME.

میں نے دروازہ بند کیا تو ان کی آواز لوری کے بول کی طرح نیند میں ڈوب گئی۔

اپنے کمرے میں جا کر میں نے دو ایک بوڑھی عورتوں کو انجکشن لگایا اور پھر کوئی نصف درجن مریض دانتوں کے دیکھے۔ وہاں ٹافی کھا کھا کر لوگوں کے دانت بچپن میں ہی خراب ہو جاتے ہیں اس لیے زیادہ تر لوگ دانت کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ایک بوڑھی عورت کو بیٹھ کر یہ یقین دلاتا رہا کہ اسے کوئی بیماری نہیں۔ اور جس خارش کی وہ شکایت کرتی ہے وہ باتھ ٹب میں بہت زیادہ دوائیاں ملانے سے ہوتی ہے۔ لیکن وہ چاہتی تھی کہ اسے کوئی بیماری ہو تاکہ وہ ہر راہ چلتے سے اس کا دکھڑا رو سکے۔

کافی دیر بعد جب میں نیچے اُتر رہا تھا تو جھگڑے کا شور کان میں پڑا نیچے پہنچا تو لاؤنج میں ہنگامہ برپا تھا مس ٹیلر کی آواز سب سے پہلے کان میں پڑی۔ "یو سواتن ... ... اڈیٹ ......" الیگزینڈر اور ہیٹریل کر جان کو دھمکا رہے تھے۔ کبھی بازو کھینچتے کبھی وہاں سے چلے جانے کو کہتے۔ میں جانتا تھا۔ یہ دونوں سونی کے چاہنے والے ہیں۔ اس لیے ضرور کوئی بات ایسی ہوتی ہے۔ جس سے سونی کا تعلق ہے۔ ادھر اُدھر دیکھا تو وہ دور صوفے پہ بیٹھی تماشہ دیکھ رہی ہے۔

جان اپنے چہرے سے آنکھ کا پانی پونچھتا ہوا اونچے اونچے بول رہا تھا۔ "تم سب خود غرض ہو۔ تمھیں میری ضرورت کا احساس نہیں" اس نے غصے میں زور سے میز پر مکا مارا۔ اور پھر چوٹ لگنے سے ہاتھ ملنے لگا۔ سب بچے تالیاں بجا کر اس کا مذاق اُڑانے لگے اور جان کی باتیں شور میں دب گئیں۔ ایک بات صاف تھی کہ سب لوگ جان کے خلاف ہو رہے تھے۔

شور کے بتدریج کم ہونے سے مس ٹیلر کی آواز اُبھرتی چلی گئی ... "جانتی ... ... بے شرم ...... تنگ کرتے تھے .... تنگ ... تمھارا پاگل پن میرے سیکشن تک محدود تھا۔ تم یہاں گزر کرتے تھے۔ اب اگر تم نے دوسروں کو بھی تنگ کرنا شروع

کر دیا تو یاد رکھنا اسکول سے نکال دیے جاؤ گے۔"

"ختم کرو یہ بک بک"۔ جان چلایا "میں کسی کو تنگ نہیں کر رہا۔ میں تو صرف سونی کی تصویر بنانا چاہتا تھا۔"

"اگر وہ نہیں چاہتی تو تمہیں کوئی حق نہیں کہ اسے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دو"۔ مس ٹیلر حسبِ معمول جان پر برس رہی تھی۔

سونی دھیرے دھیرے آگے آئی اور جان کے قریب پیٹر اور الیگزینڈر کے درمیان کھڑی ہو گئی۔ پھر ایک ایک ہاتھ دونوں کے کندھوں پر رکھ کر الفاظ چبا چبا کر بولی۔

"میری جوانی اتنی ناکارہ نہیں ہے کہ اس کے حسین لمحات ایک بدصورت اور غلیظ بوڑھے کے سامنے بیٹھ کر گزار دوں"۔ اس نے اپنا رخسار پیٹر کے کندھے پر ٹکا دیا اور ہاتھ الیگزینڈر کی کمر میں ڈال دیا۔

"ہپ ہپ ہرے" الیگزینڈر نے تالی بجائی اور سونی کا ہاتھ پکڑ کر راک این رول کرنے لگا۔ پیٹر نے جھٹ سے جیب سے منہ کا باجا نکالا۔ اور میوزک بجانا شروع کی۔ اگلے لمحے سب لوگ کرسیوں کے درمیان ڈانس کر رہے تھے اور اچھل کود رہے تھے۔

لیکن جان جیسے سُن ہو گیا۔ بے جان بُت بنے اس نے غصے کا ایک گھونٹ کوشش کر کے نگلا اور پھر انگلی سے آنکھ کا پانی صاف کرنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "آؤ جان ہم باہر چلیں" اِدھر اُدھر ناچتے ہوئے لوگوں میں سے جب میں اسے نکال رہا تھا۔ تو وہ رستے سے کھینچی جانے والی خراب موٹر کی طرح بلا وقت میرے ساتھ کھنچا چلا آیا۔ اس کے مجروح جذبات دیکھ کر میں نے پوری بات پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ فقط اتنا کہا "جان سونی بہت مغرور ہے اسکول میں اور بہت سی حسین لڑکیاں ہیں۔ تم ان میں سے کسی کی تصویر بنا لو۔"

"خوبصورت لڑکیاں؟؟ ...... ہاں ...... ہیں تو ...... لیکن ... لیکن اُس جیسی کوئی نہیں"۔ بات اس نے میرے دل کی کہی تھی اس لیے میں خاموش ہو گیا۔

جان اسی طرح سوچنے کے انداز میں بول رہا تھا۔
"اُس جیسی کوئی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ سونی بالکل اس کی طرح ہے۔"
تو یہ کسی اور کا سوچ رہا ہے۔ بہرحال میں خاموش رہا۔
"ڈاکٹر!!" اس نے میرے کندھے پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔ "یہ لوگ میری بات نہیں سمجھ سکیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی بھی نہیں سمجھ سکیں گے۔ تم ذرا آؤ میرے ساتھ آرٹ سیکشن تک۔"
میں خاموشی سے ساتھ ہو لیا۔ مجھے دیر ہو رہی تھی۔ لیکن اِس واقعہ کے بعد اس کے چہرے پر ایسی بے بسی برس رہی تھی کہ میں مزید صدمہ نہ پہنچانا چاہتا تھا۔ ہم نے پہلے برآمدے کو پار کیا۔ پھر وُہ سیڑھیوں پر میرے آگے آگے نیند میں چلنے والے مریض کی طرح چڑھتا گیا۔ اُوپر والا برآمدہ چل کر ہم آرٹ سیکشن میں چلے گئے۔ کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ مِس ٹیلہ نیچے اپنی فتح منا رہی تھی۔ ڈسکوں اور بورڈوں کی قطاروں میں سے گزر کر ہم وہاں پہنچے جہاں بورڈ پر جان کا کینوس چسپاں تھا اور اس پر ایک نامکمل تصویر تھی۔
اس نے اپنے سامان والا دروازہ باہر کھینچا اور ایک تصویر نکال کر مجھے دی جو وُہ مکمل کر چکا تھا۔ تصویر میں برف گرنے کا سماں تھا۔ اُوپر بادلوں بھرا اٹیالا ناہموار آسمان نیچے چکیلی سفیدی ہر چیز پر سفید چھت ـــــ منظر ایک پارک کا تھا۔ جس میں درخت بنچ پھولوں کے گرد جنگلوں وغیرہ ہر شئے پر سفید تہ تھی۔ فضا میں برف کے گالے اُڑ رہے تھے ـــ ایک درخت کے نیچے ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی بھاری کوٹ پہنے آپس میں چمٹے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے اِتنے قریب تھے کہ ایک کا سانس دُوسرے کے چہرے پر جم رہا تھا اور وُہ ٹکٹکی باندھے ایک دُوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے ہیں۔ تصویر کے کونے میں تاریخ لکھی تھی۔ ۱۷ فروری ۱۹۱۷ء
"بہت عمدہ تصویر ـــــ جان کب ختم کی تم نے۔" میں تصویر کی تعریف کیے بنا

نہ رہ سکا۔

جان تھکے ہوئے مسافر کی طرح اپنے اسٹول پر بیٹھ گیا اور نحیف آواز میں بولا۔

"یہ تمھارے لیے محض ایک تصویر ہے ڈاکٹر —— ایک منظر —— لیکن میرے لیے یہ ہسٹری ہے —— یہاں میں نے اسے پہلی دفعہ پیار کیا تھا —— ٹھنڈے ہونٹوں کا گرم پیار۔"

اس نے دوسری تصویر میرے ہاتھ میں دے دی —— یہ غروب آفتاب کا منظر تھا۔ اُفق پر سُورج کی سنہری ٹکیہ کا نچلا کنارہ سمندر سے چھُو رہا تھا —— آسمان پر مٹیالے بادل ارغوانی جھالروں میں گھرے تھے اور نیچے دو بڑی پہاڑیوں کے درمیان سمندر نظر آ رہا تھا۔ جس پر ایک کشتی میں دو سواروں کا سیاہ خاکہ سُورج کی روشنی کو کاٹ رہا تھا۔ کپڑوں اور بالوں کی تراش سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایک مرد اور ایک عورت ہے —— سمندر پر پرندے اُڑ رہے تھے اور سارے ماحول پر سُرخ رُومانیت چھائی ہُوئی تھی۔ تصویر کے کونے میں تاریخ درج تھی۔ ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء۔

"روم میں ہم پوپ سے دُعا لے کر کیپری کے جزیرے پر چلے گئے تھے ..... یہ میں بیٹھا ہُوں۔" اس نے کشتی کے مسافروں پر اُنگلی رکھ کر کہا "اور ساتھ ایلن ہے ......"

وہ دونوں پر اُنگلی پھیرنے لگا۔

....

"ڈاکٹر! تم کوئی آواز سُن رہے ہو؟"

"نہیں تو!" میں نے حیران ہو کر چاروں طرف دیکھا۔

وُہ زیرِ لب ہنسا "لیکن میں سُن رہا ہوں۔ ایلن مجھ سے کہہ رہی ہے کہ ہم لندن واپس جا کر شادی کر لیں گے۔"

اُس نے تصویر میرے ہاتھ سے لے لی اور چہرے کے قریب لے جا کر غور سے

دیکھتا رہا۔ پھر بڑے پیار سے دونوں تصویریں دراز میں رکھ دیں اور بورڈ والی نامکمل تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "اور یہ ہے لندن ——" نامکمل تصویر کے کچھ حصّے میں رنگ بھر دیا گیا تھا۔ درمیان میں خالی حصّہ تھا۔ یہ ایک ڈانسنگ ہال کا منظر تھا۔ موم بتیوں کی روشنی میں ہونے والا مدھم ڈانس، دو ایک جوڑے فرش پر ڈانس کر رہے تھے باقی دیوار کے قریب کرسی میزوں پہ بیٹھے ڈرنکس پی رہے تھے۔ ہر میز پر ایک موم بتی جل رہی تھی اور ایک میز پہ ایک لڑکا اکیلا بیٹھا تھا۔ موم بتی کی ناکافی روشنی میں اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ بہت اُبھر آئے تھے اور ٹھوڑی ہاتھ میں لیے کہنی میز پر ٹکائے وُہ بڑی حسرت سے ایک ناچنے والے جوڑے کو دیکھ رہا تھا۔ اس جوڑے کی ڈرائنگ ابھی مکمل نہ تھی۔ پنسل سے خاکہ بنایا گیا تھا اور اس میں بھی بار بار تصحیح کی گئی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ مصوّر لڑکی کا چہرہ اور لباس سب کچھ دکھانا چاہتا تھا۔ لیکن والز کا پوز ایسا تھا کہ اسے مشکل پیش آ رہی تھی اس لیے پنسل کے رف خاکے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ بار بار ربڑ لگنے سے کاغذ کھُردرا ہو گیا تھا اور مٹی ہُوئی لکیروں کے دھندلے نقوش باقی تھے۔

"یہ میں ہوں" اُس نے میز کے قریب بیٹھے ہُوئے آدمی پہ انگلی رکھی۔

"نوروز کے ڈانس میں۔"

وہ خاموشی سے تصویر دیکھنے لگا ——

. . . .

"یہ ایلین اور ڈیوڈ ہیں۔" اس نے نامکمل جوڑے کو چھُوا۔

"ایلین نے اِس رات سُرخ فراک اور کالا مفلر پہنا ہُوا تھا اور جب میں لاؤنج میں گیا تو میں نے دیکھا کہ ایلین صوفے کا سہارا لیے کھڑی گا رہی ہے۔ آج رات پہلی دفعہ میں نے سوفی کو غور سے دیکھا —— وُہ ایلین ہے ڈاکٹر —— بالکل ایلین —— اُس نے مجھے دھتکارا ابھی بالکل اِسی رات کی طرح ہے جب وُہ کافی

دیر ڈیوڈ کے ساتھ ڈانس کر چکی تھی۔"

"ڈیوڈ کون تھا جان ؟"

"جس نے ایلین سے شادی کر لی۔"

چند لمحے بے چین خاموشی رہی۔ جان کا سانس گونجتا رہا۔

"میں کئی روز سے ایلین کا وہ پوز بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب وہ بے خود سی ہو کر ڈیوڈ کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی لیکن مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ اگر آج سونی چند منٹ کے لیے وہ پوز بنا دیتی تو میری تصویر آج ہی مکمل ہو جاتی . . . . آج ہی مکمل ہو جاتی۔" وہ کھو گیا۔

"آؤ جان تمہیں کافی پلا لاؤں۔"

جان نے دونوں بازوؤں میں منہ چھپا کر سر میز پر ٹکا دیا اور بولا "ڈاکٹر خدا را مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

اگلے روز میں نے آرٹ سیکشن میں جھانکا تو جان کی سیٹ خالی تھی۔ دوسرے روز وہ پھر غیر حاضر تھا۔ تیسرے روز پتہ چلا کہ وہ بیمار ہے اور اسکول نہیں آ سکتا ہے میں نے مینجر سے کہا کہ وہ دفتر میں سے اس کے گھر کا پتہ نکلوا دے۔

"کیوں ؟" مینجر ایک لڑکی کے والدین کو شکایتی خط لکھتا ہوا رک گیا۔

"وہ بیمار ہے اور میں ذرا جا کے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے پاکستانیوں میں یہ فرض شناسی دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے ڈاکٹر۔" اس نے انگریز قوم کے مخصوص لہجے میں کہا جو بظاہر بہت میٹھا اور بے ضرر لیکن در اصل طنز سے بھرپور ہوتا ہے اور جس لہجے میں وہ دوسری قوموں سے بات کرتے وقت تعریفی الفاظ میں ان کی تضحیک کرتے ہیں۔

"اگر یہاں کے لوگ مغربی برتری کے تعصب کو بھول کر ہمیں دیکھیں مسٹر وائن تو

آپ کو پاکستانیوں میں اور بھی بہت سی خوبیاں نظر آجائیں گی۔" میں اس کی مسکراہٹ میں پوشیدہ طنز برداشت نہ کر سکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے پتہ مل گیا اور میں ڈفل کوٹ کو اپنے گرد لپیٹا، ہاتھوں کو دستانوں میں ٹھونستا اس کے گھر پہنچ گیا۔ گھنٹی بجائی تو ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔

"ایوننگ ... مسز جان!" میں نے جھجکتے جھجکتے اپنا قیاس لگایا۔

"کھی کھی ......" بڑھیا بے تحاشہ ہنسنے لگی "کھی کھی .... کھی۔"

میں پہلے تو کھسیانہ ہوا۔ پھر مجبوری کی ہنسی ہنسنے لگا۔

"کھی کھی .... کھی کھی .... مسز جان؟ .... کھی کھی کھی ...... مسز جان .... کھی کھی عجیب بات ہے کھی کھی؟"

"میں اِس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، جس کا مجھے علم نہیں۔"

وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی اور بے دم ہوتے ہوئے اس نے اس طرح ہاتھ ہلایا جس کا مطلب تھا کوئی گستاخی نہیں —— بالکل نہیں۔

بڑی مشکل سے پیٹ دبا کر اس نے ہنسی روکی اور کہنے لگی "میرا خیال تھا تم ایسی غلطی نہیں کرو گے، کیونکہ گزشتہ چار سال میں جب سے وہ میرے پاس رہ رہا ہے۔ تم پہلے انسان ہو جو اس سے ملنے آئے ہو۔ اِس لیے میرا قیاس تھا کہ اس کے گہرے دوست ہو گے اور جانتے ہو گے کہ میں اس کی بیوی نہیں۔"

"اوہ آئی ایم سوری میڈم .... ویری سوری۔"

"کوئی بات نہیں۔ جب پہلی گھنٹی بجی تو میں نے سمجھا کہ درزی آیا ہو گا۔ کیونکہ اس نے مجھے وقت دیا تھا۔ میں نے ٹونی کے کپڑے سلنے کو دیے تھے۔ اِس دفعہ کرسمس کے لیے خاص طور پر لال رنگ لائی تھی میں خود گئی تھی برٹن کے ہاں کپڑا دیکھنے ...... گڈ گاڈ ... بڑی بھیڑ تھی اس روز بارش میں بھیگی ہونے کی وجہ سے مجھے بار بار لوگوں

سے معافی مانگنی پڑتی ..... دیکھونا۔ میں بس ویسے ہی اپنی چھتری بھول گئی تھی۔ بات یہ ہوئی تھی کہ پڑوس سے مسز نورس آئی تھی اور میں بات کرتے کرتے باہر نکل گئی تھی اور چھتری کا خیال ہی نہ رہا۔ دراصل میں اس کے کوٹ کے سرخ رنگ کو ذہن میں بٹھا رہی تھی ....."

میں پہلے تو سنتا رہا۔ پھر خیال آیا کہ میری مخاطب ایک تو عورت ہے اور دوسرے بوڑھی۔ اور یہ دونوں چیزیں صبر سے سننے والوں کے حق میں بہت بُری ہیں۔ اِس لیے جلدی سے قدم بڑھاتے ہوئے میں نے کہا "معاف کرنا میڈم مجھے ذرا جلدی ہے میں جان سے چند لمحے کے لیے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ ضرور — ضرور — شوق سے آؤ بیٹا — " وہ آگے سے ہٹ گئی۔ میں اندر داخل ہو گیا۔

"سیدھے اُوپر چلے جاؤ۔ دائیں ہاتھ کا پہلا دروازہ اسی کا ہے۔ ... میں تو اِس لیے ہنس رہی تھی کہ تم مجھے ایسے خبطی کی بیوی بنا رہے ہو۔ جس نے ساری عُمر شادی نہیں کی ... کھی ... کھی کھی ......"

میں دامن سمیٹ کر سیڑھیاں چڑھا۔ چھوٹی سی گیلری سے گزرا اور جب جان کا دروازہ اُنگلی سے کھٹکھٹایا تو نیچے سے اس عورت کی ہنسی کی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔

"آجاؤ۔" جان نے گھُٹی ہوئی آواز آئی۔

"ہلو جان! کیا حال ہے تمھارا؟" میں نے داخل ہو کر پوچھا۔

"تم آگئے ..... مجھے یقین تھا۔ تم آؤ گے میرے بیٹے!" جان کمبلوں کے بھاری بوجھ میں سے سر نکالتا ہوا بولا۔ "میں تو بستر میں ہوں۔ تمھارے لیے کمرہ ٹھنڈا ہوگا۔ گیس جلا لو ..... یہ میز پر ماچس پڑی ہے۔"

میں نے دیا سلائی جلا کر گیس کی ٹونٹی کھولی تو بھپ سے ہیٹر جل گیا۔ میں قریب

ہی بیٹھ کر ہاتھ تاپنے لگا۔ تھوڑی دیر تک موسم کے بارے میں بات چیت کرتا رہا جو انگلستان کی ہر گفتگو کی تمہید ہوتی ہے۔ اس کے بعد کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن جان نے گزشتہ جھگڑے کے بارے میں کوئی بات چیت نہ کی حالانکہ وہی اس کی بیماری کی وجہ تھا اور میرے وہاں جانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ بات چیت سے اس کے دِل کا غبار دُھل جائے لیکن اس موضوع پر آنے کا کوئی موقع ہی نہ بنتا تھا اور میں عادتاً کسی شخص سے براہِ راست اُس کی ذات کے متعلق سوال کرنے سے ہمیشہ کتراتا ہوں۔

"تمہاری لینڈ لیڈی بہت خوش مزاج ہے جان۔" میں نے ویسے ہی بات کی۔

"وہ جو روایتی لینڈ لیڈی کا خوفناک تصور ہے۔ یہ اس کے بالکل اُلٹ ہے۔"

"ہاں یہ سچ ہے واقعی بہت عمدہ عورت ہے میری بڑا اسیوا کرتی ہے۔ کھانا، پینا، پہننا وغیرہ ہر چیز میں میرا خیال رکھتی ہے نہ صرف یہ بلکہ ایلین کی خبر بھی مجھے اُس نے لا دی تھی۔"

"تو ایلین یہاں ہے کیا؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہاں! وہ یہاں کے اولڈ پیپلز ہوم میں ہے۔"

"پھر تو تم اُسے اکثر ملتے ہوگے؟"

جان ہنسنے لگا۔ "میں تو اُسی روز ملوں گا جب میری تصویر مکمل ہوگی۔ نہ معلوم وہ کتنا عرصہ لے۔ یا شاید ہو ہی نہ سکے۔ ایلین بھی بوڑھی ہے میں بھی بوڑھا ہوں۔ کیا معلوم کس وقت زندگی ختم ہو جائے۔ اِسی لیے تو میں یہ تصویر جلد از جلد ختم کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ پوز مشکل ہے۔ سوفی اس روز راضی ہو جاتی تو شاید یہ اب تک ختم ہو چکی ہوتی۔"

یہ معمہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ بہر حال میں خاموش رہا کیونکہ جان اب خود ہی کھل رہا تھا اور میں اپنے کسی غلط سوال سے اس کے خیالات کا رُخ موڑنا نہیں چاہتا تھا۔

"ڈاکٹر باہر سے آئے ہو۔ کافی کی طلب ہوگی ہی۔ ذرا اس الماری میں سے سامان نکال لو۔ اور کافی بنا کر پی لو۔ معاف کرنا میں تو اُٹھ نہیں سکتا۔ ہاں ایک پیالی مجھے بھی دے دینا۔"

میں نے گیس جلا کر کیتلی میں پانی رکھا۔ پیالیوں میں کھانڈ، کافی اور دودھ ڈالنے تک پانی اُبلنے لگا۔ میں نے کافی بنا کر ایک پیالی اُسے دی اور دُوسری خود پینے لگا۔ پیالی میں سے اُٹھنے والی بھاپ کو دیکھتے ہوئے میں کافی کو کوس رہا تھا جس کی وجہ سے موضوع اپنی لائن سے ہٹ گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب دوبارہ بات کو کیسے اس طرف لایا جائے۔ لیکن ماحول نے میری مدد کی۔ نیم تاریک کمرے میں کافی کا گرم پیالہ ہونٹوں سے لگے تو خواہ مخواہ دماغ میں یادیں مچلنے لگتی ہیں۔ چنانچہ جان خود بول اُٹھا۔

"ڈاکٹر! ایلین سے ملے ہوئے مجھے چالیس برس ہو گئے ہیں۔ اِس عرصہ کا بہت سا حصّہ میں نے ہندوستان میں گزارا ہے۔ کیونکہ میں انگلینڈ سے دُور رہنا چاہتا تھا دو برس ہوئے مجھے پتہ چلا کہ ایلین یہاں ہے اور میں نے سوچا کہ اب بطور آرٹسٹ کے جا کر اسے ملوں گا۔ اور اپنی گزشتہ محبت کے متعلق تین تصویریں بنا کر لے جاؤں گا، اس دن سے میں اسکول میں کام سیکھ رہا ہوں۔"

"لیکن اسے ملنے کے لیے تم تصویریں کیوں بنانا چاہتے ہو؟"

جان نے گردن اُٹھا کر لمبا گھونٹ لیا۔ کافی ختم کر کے پیالی سٹول پر رکھی اور بستر میں لیٹتے ہوئے بولا۔ "ڈیوڈ آرٹسٹ تھا ڈاکٹر . . . . . بہت عمدہ آرٹسٹ . . . . اب تو بیچارہ مر چکا ہے۔" وہ کچھ سوچنے لگا۔ میں کافی کی چسکیاں لیتا رہا۔

"میری ایلین سے ٹوٹنے کی وجہ بھی یہی تھی ——— کیمبری کے جزیرے سے واپسی پر لنڈن میں جب وہ ڈیوڈ سے ملی تو اس کے رنگوں کی قوسِ قزح میں پھنس گئی اور مجھ سے کیے ہوئے سب وعدے بھول گئی ——— وہ کہتی تھی کہ آرٹسٹ کی

شخصیت ایک ایسا وسیع جہانِ رنگ و بُو ہے جس میں خلوص کی ہوائیں چلتی ہیں اور سچے جذبات کی برکھا ہوتی ہے۔ وُہ اِتنا وسیع القلب ہوتا ہے کہ اس میں ساری اِنسانیت سما سکتی ہے اور میں —— میں آرٹسٹ نہ تھا۔"

جان پھر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔" میں تصویریں بنا کر اس کے پاس لے جاؤں گا۔ جو خالص میرے ہاتھ سے بنی ہوئی ہیں۔ خالص میری۔ ان میں مس ٹیلر کا مشورہ بھی شامل نہیں۔ پھر ایلین کو پتہ چلے گا کہ میں آرٹسٹ بن سکتا ہوں۔" وہ نڈھال سا ہو کر بستر میں گر پڑا۔

"جان! کافی پیو گے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے اس سے پُوچھے بغیر ایک سگریٹ سلگا کر اُسے دے دیا۔

"جان ایک بات بتاؤ۔" میں نے ایش ٹرے میں راکھ جھاڑی" اگر اب تم ڈرائنگ سیکھ سکتے ہو تو اس وقت تم نے کیوں نہ سیکھی جب اس کا کوئی فائدہ بھی ہو سکتا تھا؟"

جان کچھ دیر خاموش لیٹا رہا۔ پھر بولا" تمہاری عُمر کیا ہے ڈاکٹر؟"

"۲۶ سال"میں ایسی اچانک انکوائری پر حیران ہو گیا۔

"میری عمر ساٹھ سال ہے —— سمجھے؟ دو ماہ اُوپر ساٹھ برس —— تم سے دُگنی —— بلکہ اس سے بھی زیادہ —— اور یہ سب ایک ایک لمحہ جوڑ کر بنی ہے —— کبھی تم نے سوچا ہے ڈاکٹر لمحے کی کتنی زیادہ اہمیت ہے؟ ہر لمحہ دُوسرے سے مُختلف ہوتا ہے اور ہر لمحے میں ہمارا طرزِ عمل ہماری اس وقت کی مخصُوص ذہنی کیفیت کے مطابق ہوتا ہے اِس لیے بعض لمحے چھوٹے ہوتے ہُوئے بھی اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ ان کے سائے ہماری ساری زندگی کو تاریک کر دیتے ہیں —— لیکن تم تو بہت چھوٹے ہو۔ تم اسے کیا سمجھو گے۔"

اور میں واقعی کچھ نہ سمجھ سکا۔ اگلی بات کے انتظار میں خاموش بیٹھا رہا۔

"میں ان لمحوں میں پیوریٹن (PURITAN) تھا ڈاکٹر۔ میں پیوریٹن گھرانے میں پیدا ہوا۔ اِس لیے تصویر کشی کو گناہ سمجھتا تھا۔ میں بڑا پکا مذہبی آدمی تھا۔ جیسے کہ آج کل تم ہو۔ میں نے اکثر تمہیں کمرے میں نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ مجھے پتہ ہے تم شراب بھی نہیں پیتے۔ اِسی طرح میں بھی پُورا مذہبی تھا۔ اور ہر قسم کے آرٹ کو گناہ سمجھتا تھا۔ اس وقت میری سوچ اپنی نہ تھی، بلکہ دھرم کی گھڑی ہُوئی تھی۔ وُہ لمحے میرے نہ تھے، اِن پادریوں کے تھے۔ جو خُدا کے نام پر خدا کی مخلوق کو اپنے تابع رکھتے ہیں۔ میں نے ایلین سے کئی بار کہا کہ میں بھی چاہوں تو آرٹسٹ بن سکتا ہوں۔ لیکن میں تمہارے لیے دُنیا چھوڑ سکتا ہوں دین نہیں۔ مگر وُہ کہنے لگی ڈینگ نہ مارو جان۔ مذہب کی پابندیوں کا کچلا ہُوا آدھ مؤا آدمی کبھی اس قابل نہیں ہو سکتا کہ آرٹسٹ کی سی ہمہ گیر شخصیت پیدا کر سکے۔ اس نے بالکل اسی انداز میں یہ کہا تھا جس طرح اس رات سونی نے مجھے غلیظ اور بوڑھا پکارا تھا۔ . . ."

جان خاموش ہو گیا۔ میں بھی چُپ تھا۔ کھینچے ہُوئے پردوں کی درزمیں سے شیشے پر پانی کے قطرے باری باری جھانک کر کمرے کی مسحُور فضا دیکھ رہے تھے۔ ایک دم دھاکہ سا ہُوا اور گیس کا ہیٹر بجھ گیا۔ جان نے میز سے مجھے شلنگ اٹھا کر دیا۔ میں نے مشین میں ڈالا اور گیس پھر سے جلنی شروع ہو گئی۔ جان میری طرف غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا:

"میں جانتا ہوں۔ تمہارے من میں کیا ہے ڈاکٹر۔ تم یہی پُوچھنا چاہتے ہو نا کہ میں اب کیوں تصویر بناتا ہُوں ——— بات سیدھی سی ہے۔ یہ چالیس سال بعد کے لمحے ہیں اور ان موجودہ لمحوں کے پیچھے کروڑوں لمحوں کی اخذ کردہ عقل ہے جو میں نے اُمیدوں، امنگوں، خوشیوں، غموں، مایوسیوں اور مصیبتوں کی گود میں سے چھینی ہے۔ اور اس عقل نے مجھے سکھایا ہے کہ دھرم پابندیوں کا نام نہیں۔ یہ تو بندے اور خُدا کے درمیان گیان اور دھیان کا ذاتی رشتہ ہے۔ جو شخص جیسے چاہے اُستوار کرے ——— فرد

کی ذات دھرم کے بغیر نامکمل ہے میرے بیٹے۔ اس کے بغیر اسے سکون نہیں مِل سکتا ــــ لیکن جب مذہب اپنی منفی قدروں کے CONCENTRATION CAMP میں ایک جماعتی نظام ٹھونستا ہے تو پابندیوں سے فرد مر جاتا ہے ــــ اس کے اندر کا انسان مر جاتا ہے اور حق ہُو کہنے والے کٹھ پُتلے رہ جاتے ہیں جو باٹا کے بوٹوں کی طرح ایک ہی سانچے پر کروڑوں کی تعداد میں بنے ہیں۔ ہر انسان کی زندگی دُوسرے انسان سے مختلف ہے۔ اور ایک ہی انسان کی زندگی کا ہر لمحہ دُوسرے سب لمحوں سے مختلف ہے اور مذہب کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ تمام لمحوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے ــــ نہ صرف ایک آدمی کی زندگی کے تمام لمحے بلکہ تمام آدمیوں کی زندگیوں کے تمام لمحوں کا ایک ہی معیار بناتا ہے ــــ یہ انسان کو فرشتہ بنانے کی کوشش میں نہ تو انسان ہی رہنے دیتا ہے اور نہ فرشتہ بنا سکتا ہے۔"

"جان تم جذباتی ہو رہے ہو۔ فی الحال اس موضوع کو چھوڑ دو۔ جب تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو کبھی بیٹھ کر بات کریں گے۔" میں نے اسے لِٹاتے ہُوئے کہا۔

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "ڈاکٹر تم تو مذہبی آدمی ہو، بھلا بتاؤ گے مذہب پابندیاں کیوں لگاتا ہے؟"

"نفس کو کچلنے کے لیے۔"

"نفس تو تمام انسانوں کا ایک ہی جیسا ہے لیکن ہر مذہب کی پابندیوں میں کیوں فرق ہے؟ تم مسلمان سوّر نہیں کھاتے ــــ نہیں کھاتے نا؟ لیکن ہم عیسائی کھاتے ہیں۔"

وُہ میری طرف جواب طلب نظروں سے گھورنے لگا۔

"تمھارے مذہب میں گانا بجانا حرام ہے نا؟ لیکن عیسائی اور ہندو میوزک سے عبادت کرتے ہیں۔ جس مسلمان نے ساری عمر نہیں گایا وُہ جنّت میں جائے گا۔ اور جس عیسائی نے گا گا کر عبادت کی ہے وہ بھی جنّت میں جائے گا۔ نہ معلوم وہاں کس کی

مانی جائے گی ــــــ جنّت میں تو پھر سے صلیبی جنگیں شروع ہو جائیں گی۔"

"جان چھوڑ دو اِس بات کو۔ . . . "میری یہ کوشش کبھی ناکام ہوئی۔

"اچھا یہ بتاؤ . . . . بے صبر نہ ہو . . . . . آگ کریدو گے تو آنچ تو لگے گی ہی . . . . ابھی کبود ہو گئے کیا؟ یہ بتاؤ مذہب کا بنیادی مقصد تو طبیعت کو سکون ہی دینا ہے نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر مذہب کیوں ہر اُس چیز پہ پابندی لگاتا ہے جس سے طبیعت کو سکون پہنچتا ہے آرٹ، میوزک، ڈانسنگ، ڈرامہ۔ اِن چیزوں سے زندگی میں نکھار آتا ہے۔ اِنسان کی انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ فطرت انگڑائیاں لے کر اُٹھتی ہے اور ان کا گرمایا ہُوا اِنسان دو عالم کی تسخیر پہ کمر باندھ لیتا ہے۔ میں نے مذہب کی ایک ہی پابندی کو مانا، تو گزشتہ چالیس برس سے سکون نہیں ملا۔"

"میں نے تو سُنا ہے جان کہ تم بہت بہادر سپاہی تھے اور بہت کامیاب افسر تھے۔ اور بغیر سکون کے تم دلجمعی سے کام کیسے کر سکتے تھے۔" میں نے بات کا رُخ موڑنے کی کوشش کی۔

"ہاہاہا۔" وہ ہنسنے لگا۔ پلنگ کی ٹیک سے سہارا لگا کر بیٹھ گیا اور ہاتھ کھینچ کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ ایک لمحے وہ میری طرف دیکھتا رہا پھر کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تم کیا سمجھتے ہو میرے بیٹے۔ محبّت میں ہارا ہُوا آدمی ہر وقت نوحہ کرتا رہتا ہے ــــ نہیں بالکل نہیں ــــ وہ دُوسروں کی طرح کھاتا ہے، پیتا ہے، خوشیاں مناتا ہے۔ مذاق سمجھتا ہے اور کرتا ہے، زندگی کے تمام اُمور میں حصّہ لیتا ہے ــــ بالکل دُوسروں کی طرح ــــ فرق صرف اِتنا ہوتا ہے کہ اس کے قہقہوں میں کھنک ہوتی ہے، خوشی نہیں ہوتی۔ اس کی مسکراہٹیں دوسروں کا من

موہ لیتی ہے، اس کے اپنے دِل کو بشاش نہیں کر پاتیں۔ اس کا چہرہ ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں ماحول کی خوشیوں کا عکس تو ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے دِل میں ان کی جڑ نہیں ہوتی اور جب وہ اکیلا ہوتا ہے تو اسی آئینہ پر ماضی کی ان گھڑیوں کا عکس بار بار گزرتا ہے —— بار بار گزرتا ہے جنھوں نے اسے دائمی کرب اور کسک دیا ہے۔ وہ اس عکس سے سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے —— میری بہادری سکون کا نتیجہ نہ تھی میرے بیٹے، بلکہ سکون کی تلاش تھی۔"

میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔" اگر تم سے یہ وعدہ کروں کہ سوفی تمھارے سامنے تصویر کے لیے بیٹھے گی تو تم کب تک ٹھیک ہو جاؤ گے؟"

وہ ایک دم کمبل پھینک کر اُٹھ کھڑا ہُوا" میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"ابھی تم آرام کرو جان۔ آج تو سوفی بھی جا چکی ہو گی۔ کل شام جب تُم آؤ تو اس کی تصویر بنانے کو تیار رہنا۔"

جان بالکل بچّوں کی طرح میرے ساتھ لپٹ گیا۔ میں نے اُسے احتیاط سے لٹا کر کمبل اُوپر ڈال دیا اور خود مُڑ کر دیکھے بغیر کمرے سے نکل آیا۔ اس اُمّید کے بعد اس کا اکیلا رہ جانا ہی اس کے لیے مفید تھا۔

اگلے روز میں نے نماز کے بعد دُعا مانگی کہ خُدا مجھے اس کوشش میں کامیاب کرے اور ذرا جلدی اسکول چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اِدھر اُدھر گھوم کر سوفی کو ڈھونڈنے لگا۔ وہ کینٹین میں تھی اور کاؤنٹر پر ٹیک لگائے کوکا کولا پی رہی تھی۔ اِرد گرد اور لڑکے لڑکیاں کھڑے تھے۔ میں نے بھی جا کر ایک ڈائیٹ کافی مانگی اور سوفی کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا۔

"ہلو ڈاکٹر!" بھلا خوبصورت لڑکیاں نظر انداز ہونا گوارا کر سکتی ہیں۔

"ہلو سونی۔ اس نئے لباس کی مبارک ہو۔"

"نیا کہاں! یہ تو پرانا ہی ہے۔"

"ارے میں تو سمجھا نیا ہے کیونکہ تم اس میں بہت سمارٹ نظر آرہی ہو۔" رکھائی کے بعد تعریف نے دُگنا اثر کیا اور وہ کھل گئی۔

"تھینک یُو ڈاکٹر۔ کیا میں واقعی بہت خوبصورت لگ رہی ہوں؟"

"اِتنی خُوبصورت ...... اِتنی خُوبصورت کہ جان اگر تمھیں دیکھ لے تو پھر سے تصویر بنانے پر آمادہ ہو جائے"۔ اِرد گرد والے سب لوگ ہنس پڑے۔

"اس کا ذِکر نہ کرو میرے سامنے ــــــ غلیظ بُوڑھا!" سونی پھر کوکا کولا کی بوتل پر جُھک گئی جیسے موضوع ختم کر چکی ہو۔

"ویسے سونی میری رائے میں تمھیں اس روز تصویر بنوا لینی چاہیئے تھی۔"

"ناممکن ــــــ جان اگر یسوع مسیح سے بھی سفارشی چِٹھی لے آئے تو میں اپنی تصویر نہیں بنواؤں گی۔" اس نے سر کے بال حقارت سے جھٹک دِیئے اور سگریٹ ہونٹوں میں لے لیا۔

"تمھیں اندازہ نہیں سونی۔ تم نے اپنے ساتھ اس روز کتنی دُشمنی کی ہے۔"

جواب دینے کی بجائے سونی کندھے جھٹک کر ماچس جلانے لگی۔ میں نے باہر چلنے کی تیاری کرتے ہُوئے کہا۔ "جان اِس تصویر کو نمائش میں بھجوانا چاہتا تھا۔ اگر وہ ہو جاتا تو اب تک تم یورپ کی گلیمر گرل بن چکی ہوتی ــــــ بہر حال میں تو چلا ـــ" میں اسٹول سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔

سونی کی ماچس کا شعلہ جلتا ہی رہ گیا اور اس کا ہاتھ سگریٹ تک نہ پہنچ سکا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"کون سی نمائش؟ جان نے تو نہیں بتایا۔" سگریٹ نیچے گر پڑا۔

"معلوم نہیں" میں نے اُٹھتے ہُوئے کہا "کوئی یونائیٹڈ فلمز والے کر رہے ہیں"

ممکن تھا تمہیں بھی کسی فلم میں کانٹریکٹ مِل جاتا۔" اور ہیں چل دیا۔

"گڈ گاڈ ——— ڈاکٹر ——— پلیز ٹھہرو ——— جان کدھر ہے؟"

"وہ تو کسی اور ماڈل کی تلاش میں تین دِن سے غائب ہے۔ میرا خیال ہے۔ اب تو آخری تاریخ بھی گزرنے والی ہوگی۔"

"اوہ پلیز ڈاکٹر۔ مجھے جان کے پاس لے چلو۔" اس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔

میں نے باتوں باتوں میں اس کا شوق اور بھڑکایا اور پھر وہ مجھ سے وعدہ کر کے بھاگ گئی کہ تھوڑی دیر میں لال فراک اور کالا مفلر پہن کر آتی ہے۔

کچھ دیر بعد جان آگیا۔ میں نے اسے ساری بات سمجھائی تو وہ میری طرف غور سے دیکھ کر سر ہلانے لگا۔ "میرے بیٹے تم اتنے کم سِن بھی نہیں ہو جتنا میں تمہیں سمجھتا تھا۔" مسکراتے ہوئے اس نے مجھے تھپکی دی۔

تصویر بنانے سے پہلے سوفی نے جان کے کاغذوں سے سلوٹیں نکالیں۔ تارپین اور السی کا تیل اس کی پیالیوں میں انڈیلا۔ برش دھوئے اور پھر اصرار کیا کہ جان اپنے ہاتھوں سے اسے مناسب پوز میں کھڑا کرے۔ چونکہ وہ بال رُوم ڈانسنگ پوز تھا اس لیے ایک مرد کی بھی ضرورت تھی۔

"سوفی تو شاید پیٹر یا الیگزینڈر میں سے کسی کو بلائے گی۔" میں نے دانستہ چوٹ کی کہ شاید وہ مجھے چُن لے۔

"ڈیم اِٹ" وہ بے صبری سے ہاتھ جھٹک کر بولی "کسی گدھے کو بُلا لو مجھے تو اپنی تصویر سے غرض ہے۔"

الله میں نے فوراً ارادہ بدل دیا۔ اِتنے میں پیٹر اُدھر سے گزرا اور ہم نے اسے جھٹ سے پکڑ لیا۔ وہ بھی آمنا وصدقنا کہتا آگیا۔

جان نے بڑی محنت سے علیحدہ کاغذ پر تصویر بنائی۔ سارا وقت سوفی ایسے کھڑی رہی جیسے ٹیلی ویژن پر ہزاروں لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے کچھ کام تھا اس لیے جلدی

ہی وہاں سے آ گیا۔ کیونکہ جان کا خیال تھا کہ دو ایک روز میں اصل تصویر پر منتقل کر سکے گا۔

اگلے روز اپنے کمرے میں جانے سے پہلے میں نے آرٹ سیکشن میں جھانکا لیکن جان ابھی آیا نہ تھا۔ البتہ مس ٹیلر اس کی سیٹ پر کھڑی جان کی چیزیں بے زاری سے اِدھر اُدھر پھینک رہی تھی اور ساتھ ہی بڑبڑا رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا اس کے پاس گیا۔

"آج بڑی برہم ہو مس ٹیلر۔"

"او ہیلو ڈاکٹر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب تک یہ کمبخت بُوڑھا میرے سیکشن میں ہے، میں برہم ہونے کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرا برش اسی نے لیا ہے۔ اس کے اتنے نرم بال ہیں کہ نہایت لطیف قسم کی ڈرائنگ اس سے ہو سکتی ہے میرے پاس وہ پچھلے بارہ برس سے ہے اور میں نے آج تک کسی کو نہیں دیا میرے دوست بھی اس کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہو گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جان کے علاوہ کسی میں ہمت نہیں کہ وہ اسے ہاتھ لگا سکے۔" وہ جان کی چیزیں اُٹھا اُٹھا کر فرش پر گراتی رہی۔

"بائی گاڈ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اس کے غلیظ ہاتھوں نے استعمال کر لیا ہے تو مجھے توڑنا پڑے گا۔"

اتنے میں نیچے سے سونی والی تصویر برآمد ہوئی۔ دراز خالی ہو چکا تھا۔ برش وہاں نہیں تھا مس ٹیلر نے برش کا غصہ تصویر پہ اُتارا۔ تیوری چڑھا کر اسے دیکھا اور "ہونہہ" کہہ کر زمین پر پھینک دی۔ جہاں پہلے ہی چاک کے رنگوں کا برادہ بکھرا پڑا تھا۔

یہ دیکھ کر مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ اور اسے آرام سے سمجھانا شروع کیا۔ اسی سلسلہ میں اسے جان کی کہانی سنائی۔ اس کے ڈرائنگ سیکھنے کی اور بد مزاجی کی وجہ

بتائی۔ مس ٹیلر نے پہلے میری بات کو لاپرواہی سے پھر دلچسپی سے اور آخر میں سنجیدگی سے سُنا اور جب میں نے کہانی ختم کی تو وُہ گہری سوچ میں بیٹھی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں فرش کو دیکھ رہی تھیں۔ لیکن ان میں نظر نہ تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔ پھر اس کے لب آہستگی سے کُھلے اور وُہ جیسے اپنے آپ سے کہنے لگی۔

"کتنی خُوش قسمت ہے۔۔۔۔ اِس کے لیے کوئی اتنا بیقرار ہے۔"

وہ پھر سوچ میں ڈوب گئی اور میں آہستہ سے "معاف کرنا مس ٹیلر۔" کہہ کر اُٹھ آیا۔ دروازے سے باہر نکلتے ہُوئے میں نے مُڑ کر دیکھا تو مس ٹیلر تصویر زمین سے اُٹھا کر بڑے پیار سے اپنے فراک سے صاف کر رہی تھی۔

دو دن بعد نوروز کی رات تھی۔ میں رات کے سات بجے کے قریب مُنہ دھو کر کپڑے بدل رہا تھا تا کہ ایک تقریب میں شرکت کر سکوں کہ اِتنے میں جان آگیا۔ چند باتیں موسم کی ہوئیں۔ پھر میں نے پُوچھا "جان اتنی سردی میں کیوں گھوم رہے ہو؟"

"میں تمھارا کل کا دن اپنے لیے مانگنے آیا ہُوں ڈاکٹر۔ مجھے پتہ تھا تم نوروز کے جشن میں جا رہے ہو گے۔ ممکن ہے کل نہ مِل سکو۔ اِس لیے تمھارا وعدہ لینے آیا ہوں۔"

"کیوں خیریت تو ہے۔"

"میری تصویر ختم ہو گئی ڈاکٹر۔" وُہ بچّوں کی سی خوشی سے بولا "میں کل ایلن کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ تم بھی چلنا۔ ایک دوست کے ساتھ ہونے سے تقویت رہے گی۔"

"بڑا شکریہ جان لیکن ایک آدھ روز صبر کر لو۔ کیا ہرج ہے۔" میں نے گھڑی دیکھی۔ "مجھے معلوم ہے تمھیں دیر ہو رہی ہے۔۔۔۔ اچھا چلو۔ میں بھی سڑک کے کونے تک تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ راستے میں باتیں ہوں گی۔"

اوور کوٹ کستے ہُوئے ہم باہر نکلے۔ فضا تاریک تھی لیکن زمین پر ہر طرف برف

کے پھیلاؤ سے اِس تاریکی میں سُہانا اُجالا تھا۔ کہیں کھڑکی میں سے روشنی باہر جھانکتی تو اِس سحر زدہ ماحول کو زخمی کرتی معلوم ہوتی۔ مختلف گھروں سے گانے اور قہقہوں کی دبی دبی آوازیں نکل کر اندھیرے میں بھٹک رہی تھیں۔ کہیں کسی بجلی کے کھمبے کی چھوٹی سی دُنیا میں تھوڑی سی روشنی ہوتی تو اس کی سجاوٹ کا کوئی کنارا اندھیرے میں سے نکل کر جھانکتا۔ کوئی کار قریب آتی تو اس کی روشنیوں کے نور بھرے مخروط میں برف کے گالے پتنگوں کی طرح اُڑتے۔ ان کاروں میں زرق برق جوڑے ڈانسنگ ہالوں کی طرف اُڑے جا رہے تھے۔ جان میرے بازو میں ہاتھ ڈالے چل رہا تھا۔ کچھ دیر خاموش چلتا گیا۔ پھر بولا:

"وہ بھی ایسی ہی رات تھی ڈاکٹر —— بالکل ایسی —— نوروز کے جشن والے ڈانس میں ایلین نے زندگی کا پارٹنر بدل لیا تھا اور جب ۱۹۲۰ء کا پہلا سورج چڑھا تو میری دُنیا بدل گئی —— کل ۱۹۶۰ء شروع ہو گا۔ پُورے چالیس برس سے ہر نوروز میری شکست کی سالگرہ ہوتی ہے —— اگلے سال تک معلوم نہیں زندہ رہوں یا نہ رہوں۔ اِس لیے کل اسے تصویر دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ کم از کم ایک نوروز تو فتح کا بھی دیکھ لوں —— تمھاری زندگی میں کتنے نئے سال طلوع ہوں گے بیٹے! کل کا دن مجھے دے دو —— صرف ایک دن۔"

"میں ضرور چلوں گا جان۔" میں نے غیر ارادی طور پر اسے قریب کر کے بھینچ لیا۔ اور پھر ایک بڑا جدت والا خیال میرے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا۔

"سنو جان۔ کیوں نہ کل کے نوروز کو مکمل فتح منایا جائے۔ اگر اس پر تصویر دل کا اچھا اثر ہو۔ تو...... تو تم اس سے شادی کر لو۔"

جان چُپ ہو گیا۔ جیسے اسے بات پسند نہیں آئی۔ کافی قدم چل کر بولا۔

"شادی؟...... ہونہہ...... شادی!" اس کی مری ہُوئی آواز بھی طنز سے بھر پُور تھی۔ میں سمجھا شاید اپنے اور ایلین کے بڑھاپے کی طرف اشارہ کر

رہا ہے۔

"ہاں ہاں۔ کیا حرج ہے۔ ساری عمر تمہیں جس چیز کے نہ ہونے سے سکون نہیں ملا۔ اگر اب مل جاتے تو اس سے بڑی خوشی کیا ہو سکتی ہے۔" جان خاموشی سے چلتا گیا۔ میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ ردِ عمل معلوم کرنا چاہا تو اس کے منہ سے سانس بھاپ بن کر چہرے کے تاثرات کو چھپا رہا تھا۔ جان کافی دیر سوچتا رہا۔

"نہیں میں شادی ہرگز نہ کروں گا۔"

"کیوں؟" میں جھلا گیا "جان تم تو بس بچے بن جاتے ہو بعض دفعہ۔"

"نہیں میرے بیٹے ــــ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جانتے ہو کیوں؟ جب میں نے آخری دفعہ ایلین کو دیکھا تھا تو وہ اٹھارہ سال کی حسین لڑکی تھی جو سرخ فراک اور کالے مفلر میں قلانچیں بھرتی تھی۔ اس وقت سے آج تک وہ اسی طرح میرے ساتھ رہی ہے۔ اُس نے مجھے لوریاں دے کر سلایا ہے اور بوسے دے کر جگایا ہے۔ ہندوستان کے جنگلوں میں اُس نے میرا ساتھ دیا ہے۔ انگلستان کی سردیوں میں اس نے مجھے گرم رکھا ہے۔ اسپھال کے مورچے میں زخمی ہوا تو اس نے میری تیمارداری کی۔ میری آنکھ کے گھاؤ کو اس نے اپنی نرم انگلیوں سے سینچا ہے۔ اب میں ساٹھ برس کا ہوں۔ لیکن وہ اسی طرح اٹھارہ سالہ حسین لڑکی میری اُنگلی پکڑ کر مجھے چلاتی ہے۔ وُہ اب بھی میرے ساتھ ہے۔ تم تو نوروز کے جشن میں چلے جاؤ گے اور میں کسی پارک میں بیٹھ کر اس سے باتیں کروں گا۔ میٹھی میٹھی۔ سکون دینے والی۔ اور برف ہم پر گرتی رہے گی۔ ۔ اب اگر میں اس ایلین سے شادی کر لوں تو یہ ایلین کدھر جائے گی۔ نہیں بیٹے نہیں۔"

وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگنے لگا۔ لیکن میں نے پکڑ لیا۔

"سنو جان!! اگر یہ بات ہے تو پھر تم نے دو سال سے یہ کیا سوانگ رچا رکھا ہے۔ بڑھاپے میں گھر بیٹھ کر آرام کرتے۔ یہ دن رات ایک کر کے تصویریں بنانے میں کیا تک تھی؟"

"کیا... ٹینک...... ہے؟؟..... یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔"

"عجیب بات ہے" مجھے سچ مچ غصہ آگیا "تو پھر تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں کیا چاہتا ہوں؟؟" جان نے منہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھ سے پانی بُری طرح رس رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے دستانہ اُتارا اور کانپتی ہوئی انگلی سے آنکھ خشک کی۔ پھر دستانہ پہنتے ہوا بولا: "میں کیا چاہتا ہوں..... شاید کچھ...... ہاں..... بس میں اتنا چاہتا ہوں...... کہ........ ایلین پچھتائے..... لمحہ بھر کو پچھتائے..... " وہ جیب میں سے رومال ڈھونڈنے لگا۔ "اگر وہ ایک لمحہ کے لیے پچھتاتی ہے تو....... میں.... میرا چالیس سالہ کرب ڈھل جائے گا..... ایک لمحہ......"

اب اس کی دونوں آنکھوں سے پانی رس رہا تھا۔ پانی؟؟ اپنی جیب سے رومال نکال کر اسے دیتے ہوئے میں نے کہا۔ "جان میں کل تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

اگلے روز صبح ہی صبح جان آگیا۔ وہ تصویریں اٹھائے تھا۔ میں نے نئے سال کی مبارکباد دی۔ اور پوچھا۔ "جان تمھاری تصویر تو اچھی بن گئی ہے نا؟"

"اچھی کیسے نہ بنتی؟ بہترین برش سے بنائی ہے؟"

"کیا مطلب؟" میرا دماغ تین روز پہلے والے واقعہ کی طرف چلا گیا۔

"یہ مِس ٹیلر ہے نا۔ یہ بھی ایک عجیب عورت ہے۔ پرسوں میں تصویر بنانے لگا تو کہنے لگی جان اپنے برش سے نہ بناؤ رنگ خراب ہو جائے گا اور پھر اندر سے اپنا برش اُٹھا لائی۔ تمھیں تو شاید پتہ نہیں۔ وہ بڑا بہترین برش تھا اور مس ٹیلر اسے کسی کو نہیں دیتی۔ بلکہ اگر کوئی مانگے تو لڑتی ہے۔ لیکن مجھے خود ہی لا دیا اور جب تک میں تصویر بناتا رہا۔ اپنے سارے کام چھوڑ کر وہیں کھڑی رہی اور خاموشی سے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ میں نے کہا مس ٹیلر بیٹھ جاؤ تو بولی بھی نہیں۔ بس دیکھتی رہی اور

پھر اس روز کوئی مشورہ بھی نہیں دیا۔ کوئی تصحیح بھی نہیں کی۔ حالانکہ پہلے اپنے آپ کو بہتر آرٹسٹ بتانے کے لیے وجہ بے وجہ غلطیاں نکالتی تھی۔ میں تصویر بنا چکا تو خاموشی سے برش اٹھا کر لے گئی۔"

تیار ہو کر میں نے ٹیکسی کے لیے فون کیا۔ باہر نکلتے نکلتے ٹیکسی تیار تھی۔ اور ہم بوڑھوں کے ہوسٹل پہنچ گئے۔

انگلینڈ میں اولڈ پیپلز ہوم دیکھ کر مجھے ہمیشہ وحشت ہوتی تھی۔ جہاں تیس چالیس بوڑھے بیکار بیٹھے موت کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ جیسے آخرت کے سفر سے پہلے اسٹیشن پر ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوں۔ ان کا یہاں آنا گویا اس چیز کا اعلان ہوتا ہے کہ وہ دنیا سے فالتو ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھار ان کے عزیز و اقارب آ کر دیکھ جاتے ہیں کہ ابھی مرنے میں کتنی کسر باقی ہے۔ جس بوڑھے سے بات کرو یاس اور مایوسی میں ڈوبی ہوئی یادوں کا ذکر کرے گا۔ اسی لیے میں نے جان سے کہا کہ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گا۔ کیونکہ مجھ سے موت کا زندہ روپ نہیں دیکھا جاتا۔ اسے ایلن کے پاس چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ جان اس وقت سخت بے چین تھا۔ بحث یا ضد کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لیے فوراً راضی ہو گیا۔

جب دروازے میں داخل ہونے لگے تو اس نے تصویریں مجھے دے دیں۔ کیونکہ وہ تشویش سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ اندر جانے سے پہلے وہ رک گیا۔ "مسلسل دو سال سے اس لمحے کا انتظار کرتا رہا ہوں۔ ڈاکٹر رک جاؤ۔ ذرا مجھے اپنے اوپر قابو پا لینے دو۔"

"فرمائیے۔" ایک ملازم ڈیوڑھی میں مل گیا۔

"مسز ڈیوڈ۔ پلیز۔"

ملازم نے چونک سے سر ہلایا اور ہمیں ساتھ لے کر اوپر چڑھنے لگا۔ پہلی منزل پر لاؤنج تھا۔ جہاں دس پندرہ بوڑھے مرد اور عورتیں مٹی کے بے جان بتوں کی طرح بیٹھے

ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ ایک بُوڑھی عورت لفٹ میں سے نکل رہی تھی۔ آہٹ سُن کر کھڑی ہوگئی۔ جب تک نظر اُٹھا سکتی۔ ہم آگے نکل گئے تھے۔ دو منزل اور اُوپر چڑھے۔ کوریڈور میں سے گزرے تو آدھ کھلے دروازوں سے کمرے میں بیٹھے بُوڑھے نظر آئے۔ جامد و ساکت، بے نور آنکھیں کسی نہ معلوم نقطے پر جمی ہوئی۔ ڈھلکے ہوئے پپوٹے، لٹکتی ہوئی جھریاں۔ سارے ماحول پر ایک عجیب سی گھٹن چھائی ہوئی۔ مجھے اِن چہروں پر بالکل وہی آثار نظر آئے جو عیدِ قرباں سے پہلے منڈی میں بکروں کے چہروں پر ہوتے ہیں۔ ملازم نے ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ کھولا اور ہمارے اندر جانے کو راستہ چھوڑ دیا۔

ہم نے کمرے میں جھانکا۔ وہ دُوسرے دروازے سے باہر بالکونی میں بیٹھی تھی خلافِ توقع اُسی روز تین دن کی برفباری کے بعد تھوڑی اندھی دُھوپ نکلی تھی۔ اِنگلستان کے سردی زدہ لوگ دُھوپ کی ایک کرن بھی ضائع کرنا کُفرانِ نعمت سمجھتے ہیں۔ اِس لیے وہ کمبل میں لپٹی ہوئی آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ ہماری طرف اس کی پشت تھی اور کرسی کی ٹیک پر سفید بالوں کا ایک گچھا نظر آرہا تھا۔ اس کے سامنے میز تھی۔ جان نے بے چینی چھپاتے ہوئے مجھے اشارہ کیا۔ اور میں پروگرام کے مطابق آگے بڑھا۔ جان اُس کی پُشت پر رُک گیا۔

"مارننگ مسز ڈیوڈ ... ... میں تمھارا ایک پرانا دوست تم سے ملانے لایا ہوں"

وہ بُوڑھا چہرہ اُٹھا کر میری طرف دیکھنے لگی۔ سفید چہرہ —— سفید بال اور سفیدی والی آنکھیں۔

"شاید تمھیں جان یاد ہے ابھی تک ... ... جان کیلارڈ؟"

اس کے ہونٹ پھیلے۔ چہرے کی ساری جھریوں نے اپنی جگہ بدل کر نیا نمونہ بنا دیا۔ وہ مسکرا رہی تھی "اوہ جونی ... ... کہاں ہے وہ؟" میں نے جھلستی نظر سے دیکھا۔ جان میں کچھ حوصلہ آگیا تھا۔

"اس نے اپنے ہاتھ سے بنا کر نئے سال کا تحفہ تمہیں دیا ہے۔ تم یہ دیکھو۔۔
۔۔۔۔۔۔ وہ ابھی آتا ہے۔" میں نے شرارت سے جان کی طرف دیکھتے ہوئے آگے
بڑھ کر تصویریں ایلین کے سامنے میز پر رکھ دیں۔ جان کا رنگ لال تھا۔ ہونٹ پھڑک
رہے تھے۔ چہرے کی جھریاں بے چینی سے مچل رہی تھیں اور وہ اس کا ردِ عمل دیکھنے
کو بڑے اِنہماک سے آگے کو جھکا ہوا تھا۔

وہ اسی طرف مسکرا کر دیکھتی رہی۔ جدھر میں پہلے کھڑا تھا اور کہنے لگی "ہاں
جونی۔۔۔۔۔ جونی مجھے اچھّی طرح یاد ہے۔" اس نے یاد میں غرق ہونے کی وجہ سے
مجھے تصویریں رکھتے نہیں دیکھا تھا۔ اِس لیے میں نے برف کے منظر کی تصویر اُٹھا کر اس
کے چہرے کے سامنے کر دی۔

وہ اسی طرح مسکراتی رہی۔

"اوہ! ایلین" جان چلّایا "کیا تم دیکھ نہیں سکتیں؟"

"تم آ گئے جان" اس نے اِدھر اُدھر سر گھماتے ہوئے کہا "دیکھوں کیا۔ میں تو
چار سال سے اندھی ہو چکی ہوں۔۔۔۔۔۔ کِدھر ہو تم؟۔۔۔۔۔"

تصویر میرے ہاتھ سے گر پڑی۔ میں نے جان کی طرف دیکھا۔ اس کے
چہرے پر مایوسی، بے چینی، غُصّہ اور ناکامی گھونسے مار رہے تھے۔ لمحہ بھر میں
وہ پسینہ سے شرابور ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی تسلّی کے لیے کیا کہوں۔
______ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ جھپٹا، اور اگلے لمحے بالکونی سے نیچے
کُود گیا۔

سانس روک کر میں نے نیچے جھانکا۔ تین منزل نیچے جہاں نشیب کی وجہ سے
سڑک اور بھی گہری ہو گئی تھی وہ پتھّر کی طرح جا گرا اور ایک دفعہ تڑپ کر چت ہو گیا۔
اِدھر اُدھر سے لوگ چیونٹیوں کی طرح لپکے چلے آئے۔

میں نے مڑ کر ایلین کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ہاتھ فضا میں اُٹھا کر اِدھر اُدھر

بلا رہی تھی۔ "لاؤ نا اپنا ہاتھ مجھے دو........ کدھر ہو تم..... دیکھو تنگ نہ کرو......... چالیس سال بعد بھی تمہیں وہ شرارتیں نہیں بھولیں۔"

(۱۹۶۰ء)

لاعلم

کالا کوٹ، کالی ٹائی، میلا کالر، گنجا سر، آنکھوں پر کالی عینک، سنجیدہ چہرہ، کاروباری سختی اور رحمدلی کا فقدان۔

مولو حلوائی چند ثانیے ملتجیانہ نظروں سے اس کو دیکھتا رہا کہ شاید کچھ کمی ہو جائے لیکن وکیل صاحب ذرا نہ پسیجے۔

"جناب پانچ سو تو بہت زیادہ ہیں۔" وہ ہاتھ ملتا ہوا بولا۔

"ہونہہ۔ بہت ہیں!" وکیل صاحب نے کاغذ میز پہ پھینک دیئے "میاں یہ بھی ہمارا کاروبار ہے۔ جس طرح تیرا ہے۔ تو کبھی ساڑھے تین روپے سیر سے کم دیتا ہے مٹھائی۔"

"ہی ہی ہی۔" مولو کھلکھلا کے ہنس پڑا۔ "آپ مالک ہیں۔ پیسہ بھی نہ دیں

مٹھائی اور مقدمہ میں تو فرق ہے۔"

"واہ۔ فرق کیسے، وہ بھی کاروبار، یہ بھی کاروبار۔ بلکہ تمھیں تو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ترازو کی ڈنڈی تمھارے ہاتھ میں ہے۔ اگر بھاؤ کم کیا بھی تو ڈنڈی مار لی اور یہاں ڈنڈی عدالت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔"

"ہم کیا ڈنڈی ماریں گے جی۔ پر آپ تو کچھ مہربانی کر سکتے ہیں۔"

"میاں گنجائش ہی نہیں ہے۔ پانچ سو روپے سے ایک پیسہ بھی کم نہیں۔ اور پھر تمھارا کیس بھی تو بڑا کمزور ہے۔ فوڈ انسپکٹر نے چھاپہ مارا، تو لتے ہوئے موقع پر پکڑے گئے ہو۔ گاہک تمھارے خلاف پیش ہو رہا ہے۔ لیبارٹری کی رپورٹ ہے کہ گھی کی بجائے تیل اور چربی میں مٹھائی بناتے ہو۔ شیرے میں پکا ہوا چوہا برآمد ہو چکا ہے۔ دو چشم دید گواہ ہیں۔ تین سال کی سزا سامنے ہے۔ مردہ کیس میں جان ڈالنا ہے اور تم کہتے ہو بہت فیس ہے۔ نہیں منظور تو جاؤ تمھاری مرضی اور بھی کئی وکیل ہیں۔ ان میں سے کوئی کر لو۔"

مولو حلوائی چپ ہو گیا۔ اس مرحلہ پر وکیل صاحب کے منشی نے بھی سُر ملا دی اور وکیل صاحب کی لیاقت کے اصلی یا فرضی قصّے سنانے لگا۔ دو ایک پرانے موکل بھی منشی کے ساتھ مل کر تعریف کرنے لگے۔ مولو نے پیشگی کے طور پر سو روپے وکیل صاحب کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ذرا دیر بعد وکیل صاحب معائنہ مثل کی درخواست لے کر کمرۂ عدالت میں چلے گئے۔

وکیل صاحب شہر کے اچھے وکلاء میں شمار ہوتے تھے۔ ویسے ان کا کارنامہ یہ ہے کہ کئی معصوموں کو سزا دلوا چکے تھے اور کئی مجرموں کو صاف بری کرا گئے۔ سچ میں شک پیدا کرنے اور جھوٹ کو معتبر بنانے میں تیس سال صرف کرنے کے بعد ان کو یہ اعزاز حاصل ہوا تھا۔

اس وقت ان کے پاس تین مکان اور دس ایکڑ زمین تھی۔ وہ ٹاؤن کمیٹی کے ممبر تھے

تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ مقدمہ ایک جنگ ہوتی ہے۔ جس میں اکھاڑے کی طرح داؤ لگانے پڑتے ہیں۔ اور پس پردہ چالیں بھی چلنا پڑتی ہیں۔

"سن بے مولے" اگلے دن وہ خالص وکیلانہ کھسر پھسر میں مصروف تھے۔ "صفائی کا کیس تو میں بناؤں گا۔ تو ذرا (انھوں نے چٹکی بجائی) استغاثہ کے گواہوں کو توڑ۔"

"میاں جی۔ میری کون سنتا ہے۔ جو میں ۔۔۔۔۔"

"پاگل ہے تو تو۔ تم سے کون گدھا کہتا ہے کہ جا کر ان کے پاؤں پڑو۔ بس ذرا اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے کہو کہ ان کے ملنے جلنے والوں سے بات کریں۔ یہ کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"مگر وکیل صاحب چھ روز کے بعد تو شہادت کی تاریخ ہے۔ اتنے دن میں میں کیا کروں گا۔"

"بڑا احمق ہے تو بھی۔ اہلمد کو ذرا خوش کر دے تو سمن دو دن بعد نکلیں گے اور تعمیل کرنے والے سپاہی کی خدمت کر دینا تو رپٹ آ جائے گی کہ تعمیل کے لیے وقت کم ہے یا گواہان دوسرے شہروں میں شادی بیاہ کی وجہ سے گئے ہیں۔ تاریخ پر تاریخ پڑتی جائے گی۔"

مولو حلوائی قائل ہو کر مسکرایا۔ اس کی باچھیں ایسے کھلتی گئیں جیسے اس کا دماغ مصرع طرح پر گرہ لگا رہا ہے۔

چند دن کے بعد مولو پھر آ گیا۔ وکیل صاحب نے اس کی رپورٹ ایسی رازداری سے سنی جیسے ایک ہمسائی دوسری ہمسائی سے تیسری ہمسائی کی بات کرتی ہے۔ اور رپورٹ سن کر ایسے مایوس ہوئے جیسے دوسری ہمسائی کہ اس بات کا پہلے ہی سے علم تھا۔ مولو کسی گواہ کو بھی نہ توڑ سکا تھا کیونکہ وہ اپنی برادری اور پارٹی کے بندھنوں سے مجبور تھے کہ شہادت ضرور دیں گے۔ ویسے بھی وہ موقع پر موجود تھے اور عدالت

ان کو بُلوا سکتی تھی۔

"تو پھر کسی کو دے دلا کر راضی کر لو۔" وکیل صاحب بولے "کہ وہ کہہ دے کہ موقع پر چار پانچ منٹ دیر سے پہنچا تھا۔ یا چھاپے کا وقت صُبح کے بجائے شام تھا۔ یا یہ کہ مولو سفید شلوار کی بجائے کالی دھوتی باندھے ہُوئے تھا۔ یا اسی قسم کی کوئی اور بات جو دُوسرے گواہوں سے مُختلف ہو۔"

بات مولو کی سمجھ میں آ گئی اور وہ سوچتے ہُوئے بولا "اچّھا کوشش کروں گا۔"

"ارے کیا خاک کوشش کرے گا۔" وکیل صاحب دستاویزات کا لفافہ ہلاتے ہُوئے بولے "اِتنے دن میں تو کچھ نہ بن سکا۔ اور اب کوشش کرے گا۔"

اِسی اثنا میں اردلی نے عدالت کے دروازے سے گردن لمبی کر کے ہانک لگائی۔ "عبداللہ خاں بنام ملکھاں بی بی۔ ای۔ ای۔"

اور وکیل صاحب لفافہ سنبھالتے دروازے کی جانب لپکے "ارے آواز پڑ گئی۔" چند قدم جا کر پھر لوٹے۔ "ارے سُن مولو۔ بات سُن۔" اس کے مُنہ سے کان لگا کر بولے "اور نہیں تو ایک گواہ پر اس کے کسی مُخالف سے اِستغاثہ کروا ڈال۔"

"کیسا اِستغاثہ؟"

"ہیں؟؟ کیسا اِستغاثہ؟؟ ابے کوئی بھی اِستغاثہ ہو، یعنی یہ کہ میرے روپے نہیں دیتا........ یا میری زمین سے اُس نے درخت کاٹ لیے...... یا ...... یا........ یا میری دوکان سے گھی چرا کر لے گیا........ اور کچھ نہیں تو یہ...... کہ رات کو گلی میں اُس نے میری بیوی کو چھیڑا........ ابے بری ہونا ہے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا............ جا جا، جلدی کچھ کر ڈال........ مجھے عدالت میں حاضر ہونا ہے۔"

اور وکیل صاحب لفافہ ہلاتے دُوسرے مؤکل کے ساتھ لپک کر چل دیے، جو آواز پڑ جانے کے بعد بے کل ہو رہا تھا۔

مقدمہ شروع ہو گیا۔ مولو وکیل صاحب کی تواضع کرتا رہتا۔ وہ خندق میں بیٹھے بیٹھے محاذ کنٹرول کرتے رہے۔ اور مولو ان کی ہدایات کے مطابق پیچ در پیچ چکر چلاتا رہا۔ اس کی ضرورت کے مطابق وکیل صاحب ریڈر سے اپنے روایتی تعلقات کی بنا پر تاریخیں ڈلواتے رہے۔ مولو، ریڈر اور اہلمد کے گھر مٹھائی بھیجتا رہا۔ عدالت سے باہر مولو لوگوں سے نپٹنے کی کوشش کرتا اور عدالت کے اندر وکیل صاحب تابڑ توڑ جرح کرتے رہتے۔ شہادتیں ختم ہوئیں تو مولو نے پیرجی کے مزار پر نیاز دلوائی، اور موچیوں والی مسجد کے امام کو نئی پگڑی خرید کر دی۔

شہادت کے بعد عدالت میں دونوں وکلاء کی بحث تھی۔ سرکاری وکیل نے مثل کے ورق بے دلی سے اُلٹے سیدھے کیے اور مشین کی طرح ایسی یکساں آواز میں بحث کرنے لگا جیسی یکساں تنخواہ اسے ہر ماہ ملتی تھی۔ خواہ مقدمے میں محنت کرے یا نہ کرے۔

"جناب والا۔ اس کیس پر بحث کرنا لاحاصل ہے، کیونکہ واقعات اس قدر واضح اور شہادتیں ایسی پختہ ہیں کہ شک کی گنجائش نہیں رہی۔ واقعات اس مقدمہ کے یوں ہیں کہ ملزم شہر کے مین بازار میں مٹھائی کی دوکان کرتا ہے۔ وقوعہ کے روز فوڈ انسپکٹر نے ملزم کی دُکان پر چھاپہ مارا۔ جب یہ غلام حسین گواہ کو مٹھائی تول کر دے رہا تھا جو اس کے پاس گاہک بن کر آیا تھا۔ فروخت شدہ مٹھائی کا دوبارہ وزن کرنے پر وہ اصل مقدار سے کم نکلی۔ اس میں سے نمونہ لے کر گواہان کے روبرو سربمہر پیکٹ تیار کیا گیا۔ اور لیبارٹری کو برائے کیمیاوی تجزیہ بھیجا گیا۔ جس کی رپورٹ کے مطابق حلوائی نے اصل گھی کی بجائے تیل اور چربی استعمال کی تھی۔ حالانکہ دوکان کے باہر بورڈ لگا ہے کہ مٹھائی خالص گھی سے تیار کی جاتی ہے۔ بعدازاں جب فوڈ انسپکٹر نے دوسری مٹھائیوں کا جائزہ لیا تو گلاب جامن کے شیرے میں سے مرا ہوا چوہا برآمد ہوا۔ جسے جلیبی گواہوں نے دیکھا اور برآمدگی کے فرد پر دستخط کیے۔ اس قدر بھرپور اور قوی

ثبوت کی موجودگی میں جناب والا میں درخواست کروں گا کہ ملزم کو سخت سزا دی جائے، کیونکہ قانون کا مقصد عوام کی صحت کا تحفظ ہے اور ہر اُس چیز کا خاتمہ کرنا ہے۔ جس سے لوگوں کی صحت کو خطرہ ہو۔ شکریہ۔"

سرکاری وکیل نے دلائل ختم کیے تو وکیل صفائی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ عدالت نے کرسی پر پہلو بدلا۔

"جناب عالی اس قدر کمزور کیس پر بحث کرنا، محض جنابِ والا کا وقت ضائع کرنا ہے۔ لیکن چونکہ وکیلِ سرکار نے سخت سزا کا مطالبہ کیا ہے اِس لیے میں جناب کی توجہ ان چیزوں کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو ملزم کی بے گناہی کا پکار پکار کر اعلان کر رہی ہیں۔ میں ایک لمحہ کے لیے بھی ماننے کو تیار نہیں کہ ملزم نے کم تولا ہوگا۔ میں خود اس کا پرانا گاہک ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ وہ کبھی کم نہیں تولتا۔"

"آپ کی خریداری اور تجربے کا ذکر فائل میں نہیں ہے۔ وکیل صاحب، آپ اپنے دلائل صرف فائل تک محدود رکھیں"۔ مجسٹریٹ نے ٹوکا۔

"بے شک حضورِ والا۔" وکیل صاحب نے قدرے جھک کر کہا "اِس حالت میں اگر اس بات کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی فوڈ انسپکٹر اس بات کا مجاز نہیں ہے کہ پیور فوڈ آرڈی ننس (PURE FOOD ORDINANCE) کے تحت ملزم کا چالان کم تولنے کی وجہ سے کر سکے۔ حکومت کا علیحدہ محکمہ ترازو اور باٹ کی پڑتال پر مامور ہے۔ جس کے کارندے گشت کرتے رہتے ہیں اور ایک علیحدہ ایکٹ کے تحت چالان کرتے ہیں۔ چونکہ کم تولنے کا چالان اس محکمہ کے متعلقہ افسر نے نہیں کیا اِس لیے اس چالان کی قیمت صفر ہے اور کوئی عدالت کسی قانونی ضابطے کی رُو سے ملزم کو کم تولنے کی سزا نہیں دے سکتی۔ تاوقتیکہ مجوزہ طریق کار کے مطابق وہ افسر چالان نہ بھیجے جو اس کا مجاز ہے۔ ویسے بھی میں نے شہادتِ صفائی میں انسپکٹر ویٹس اینڈ میشرز (INSPECTOR OF WEIGHTS AND MERSURES) کو پیش کیا ہے

جس نے واضح طور پر کہا ہے کہ وقوعہ سے ایک ہفتہ قبل اس نے ملزم کے تول کی پڑتال کی تھی اور درست پایا تھا۔"

"ملزم کے خلاف دوسرا الزام یہ ہے کہ وہ گھی کی بجائے تیل اور چربی استعمال کرتا ہے۔ چونکہ یہ فیصلہ کیمیاوی تجزیئے کے بعد لیبارٹری نے دیا ہے اس لیے میں اسے درست تسلیم کرتا ہوں، لیکن ساتھ ہی حضور والا کی توجہ پیور فوڈ آرڈی ننس کی دفعہ ۱۹ کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ جہاں واضح طور پر تحریر ہے کہ اگر کوئی شخص کسی چیز کو ایسی ہی حالت میں بیچتا یا استعمال کرتا ہے جس حالت میں اس نے خریدا ہے تو اس پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا۔ بندہ نواز! میں نے ملزم کی صفائی میں مسلم گھی اسٹور کے مینیجر کو پیش کیا ہے۔ جس نے تسلیم کیا ہے کہ ملزم ہمیشہ اس سے گھی خریدتا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ ہمیشہ سر بمہر ٹین بھیجتے ہیں۔ اس لیے اگر ملزم نے سر بمہر ٹین میں سے گھی نکال کر مٹھائی میں ڈالا ہے اور اس کے گھی کو لیبارٹری نے تیل اور چربی قرار دیا ہے تو اس جرم کی ذمہ داری ملزم پر ہرگز عائد نہیں ہوتی بلکہ مسلم گھی سٹور پر ہوتی ہے۔ جو خوش قسمتی سے اس مقدمہ میں ملزم نہیں ہے۔ اگر حکومت اس کو سزا دینا چاہتی ہے تو اس کے خلاف علیحدہ چالان مرتب ہو۔ یہ تو جناب والا حکومت جانے اور اس کا کام۔ لیکن میری استدعا یہ ہے کہ میرا موکل اس جرم میں سزا نہیں پا سکتا۔ کیونکہ شہادت استغاثہ سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ ملزم نے گھی کا ٹین کھولنے کے بعد اور مٹھائی میں ڈالنے سے پہلے خود ملاوٹ کی ہے۔ اگر حکومت ملزم کو سزا دینا چاہتی ہے تو یہ ثابت کرنا لازمی ہے۔ کہ گھی کی خرابی کا ذمہ دار وہ خود تھا۔ اور مسلم گھی سٹور نہ تھا۔

"باقی رہا چوہے کا معاملہ، بندہ نواز تو میں اس میں بھی ملزم کو بے قصور سمجھتا ہوں، گواہانِ استغاثہ میں سے غلام حسین نے اپنی تکرار جرح میں تسلیم کیا ہے کہ جب وہ وقوعہ پر پہنچا تو چوہا مٹھائی کی کڑاہی کے پاس فرش پر پڑا تھا۔ اسی طرح

گواہ نمبر چار فتح خاں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ اس کے سامنے چوہا کڑاہی سے نہیں نکالا گیا تھا۔ بلکہ فوڈ انسپکٹر نے ان سے کہا تھا کہ یہ کڑاہی سے نکلا ہے اور انھوں نے اس کے کہنے پر فرد پر دستخط کر دیے۔ اس شہادت کی روشنی میں جناب والا کوئی منصف مزاج جج کسی حقیقی مجرم کو بھی سزا نہ دے گا۔ کیونکہ جو لوگ عینی شاہد کا بھیس بدل کر یہاں آتے ہیں انھوں نے چوہے کو کڑاہی میں دیکھا ہی نہیں ــــــ اگر بالفرض عدالت میری معروضات کو قابلِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے کسی وجہ سے یہ یقین کر بھی لیتی ہے کہ چوہا کڑاہی میں تھا۔ تو بھی جناب والا ملزم کو سزا نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ قانون کا تقاضا مجرم کو سزا دینا ہے اور سزا دینا بنیادی شرط جرم کا ہونا نہیں بلکہ مجرمانہ نیّت سے جرم کا کرنا ہے۔ کوئی بھی شخص کسی جرم کا مرتکب نہیں ہو سکتا جب تک اس جرم کو دانستہ کرنے کی نیت اس کے دل میں نہیں ہے۔ اس بات پر قانونی شہادت بہت واضح ہے۔ اور لاہور ہائیکورٹ، پشاور ہائیکورٹ، الہ آباد اور لکھنؤ ہائیکورٹ کے فیصلے ناقابلِ فراموش بن چکے ہیں۔

شہادتِ استغاثہ میں اس امر کا اشارۃً بھی ذکر نہیں ہے کہ ملزم نے چوہے کو جان بوجھ کر مجرمانہ نیت سے شیرے میں ڈالا تھا یا بعد ازاں چوہے کو شیرے میں پڑا ہوا دیکھ کر اس نے جان بوجھ کر اسے رہنے دیا تھا۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ محض سہواً ہوا ہے اور خوش قسمتی سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔ کیونکہ شہادت کی فائل میں کہیں ذکر نہیں ہے کہ چوہا شیرے میں کتنی دیر سے پڑا تھا اور آیا اسی دوران میں کوئی گاہک وہ شیرا لے گیا تھا یا نہیں؟ اور اگر لے گیا تھا تو اسے کیا نقصان پہنچا تھا یا نہیں؟ ممکن ہے وہ دیکھے جانے سے چند ہی منٹ پہلے گرا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ چوہا شیرے میں گرتے ہی خود بخود باہر نکل آیا ہو اور باہر آ کر مر گیا ہو۔ کیونکہ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے چشم دید گواہان نے بھی چوہے کو کڑاہی میں نہیں دیکھا بلکہ باہر دیکھا ہے۔

"یہ مجملہ سوالات اور ان کے تسلی بخش جوابات انصاف کے لیے از حد لازمی ہیں کیونکہ اگر عدالت اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ یہ سب سہواً ہوا تھا اور ملزم کی لاعلمی میں ہوا

تھا تو وہ قابلِ سزا نہیں ہے اور اگر ملزم کو سزا ملتی ہے تو ان تمام عورتوں کو بھی سزا ملنا چاہیے جن کے گھروں میں دودھ میں مکھیاں یا جھینگر نکلتے ہیں اور وہ انگلی سے نکال کر وہ دودھ بچوں، نوکروں اور بعض اوقات مہمانوں کو بھی پلا دیتی ہیں۔ اور اگر قانون ان عورتوں کو سزا نہیں دیتا تو بھر بیرے ہوٹل کو سزا کیوں ملے۔ جب کہ قاتل کے مطابق جو ہے کا کٹا اسی میں موجود ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ آج کل ہر طرف رشوت کا بازار گرم ہے۔ سرکاری ملازمین لوگوں سے رشوت طلب کرتے ہیں اور اگر کوئی ایماندار آدمی دینے سے انکار کرے تو ان کی معصومیاں چوہوں کا روپ دھار جاتی ہیں۔

"آخر میں میں حضورِ والا کی توجہ گواہوں کے کردار کی طرف دلاتا ہوں۔ فوڈ انسپکٹر چالان کرنے والا ہے جس نے اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے اور تنخواہ لینے کے لیے جھوٹے یا سچے چالان ضرور کرنے ہیں۔ لہذا اس کی شہادت کو کوئی اہمیت نہ دینا چاہیے، دوسرا گواہ فوڈ انسپکٹر کا چپڑاسی ہے جو ظاہر ہے افسر کی حمایت ضرور کرے گا۔ تیسرا گواہ ملزم کا پرانا دشمن ہے اور وہ اس لیے اس کے خلاف شہادت دے رہا ہے کہ ملزم نے اِسی عدالت میں اس کے خلاف اِستغاثہ دائر کیا ہے کہ اس نے ملزم کی بیوی کو چھیڑا تھا۔ اِس لیے اِس مخالفت کی وجہ سے اس کی شہادت بھی قابلِ اعتبار نہیں، چوتھا گواہ جرح میں تسلیم کرتا ہے کہ اس کی بہن ملزم کے بھائی کی بیوی تھی اور اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ لہٰذا یہ ضرور ملزم کے خلاف شہادت دے گا، اور اسے اہم نہیں سمجھنا چاہیے۔ صرف پانچواں گواہ غیر جانبدار کہلا سکتا ہے۔ لیکن اس پہ جرح ملاحظہ فرمائیں تو موقع پر تماشائیوں کی موجودگی، مٹھائیوں کی ترتیب، گواہوں کے پہنچنے کا درمیانی وقفہ، مولو حلوائی کا لباس، سر بمہر پیکٹ بنانے کی تفصیلات اور چھاپہ مارے جانے کے وقت کے بارے میں اس کے بیانات دوسرے گواہوں سے اِس قدر مختلف ہیں کہ ایک صحیح الدماغ انسان یہی سوچتا ہے کہ یا تو یہ جھوٹا ہے اور یا باقی سب جھوٹے ہیں۔ بات دونوں میں سے جو بھی درست ہو۔ وہ چالان کی

سچائی کے بارے میں بہر حال شک پیدا کرے گی۔ اور شک کا فائدہ جنابِ والا ملزم کو جاتا ہے۔

"میں آپ سے اسی انصاف کے نام پر درخواست کرتا ہوں جس کے تحفظ کے لیے لمبے لمبے قانون وضع کیے گئے ہیں اور بڑی بڑی عدالتیں قائم کی گئی ہیں کہ ملزم کو بری کیا جائے۔ کیونکہ انصاف کا تقاضا اور قانون کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دس گناہ گار بے شک چھوٹ جائیں لیکن ایک بے گناہ کو سزا نہ ہو۔ شکریہ۔"

وکیل صاحب نے دلائل ختم کیے۔ عدالت نے جمائی لی اور فائل ریڈر کی طرف سرکا دی۔ جس نے فیصلے کے لیے اگلی تاریخ دے دی۔

مقررہ دن پر فیصلہ سنا دیا گیا۔ مولو حلوائی بری ہو گیا۔ باہر جا کر اس نے وکیل صاحب کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ ہاتھ چومے، گلے لگایا۔

"آپ نے میرے خاندان کو تباہی سے بچا لیا ہے۔ وکیل صاحب میں ساری زندگی حضور کا غلام رہوں گا۔"

وکیل صاحب فاتحانہ مسکراہٹ سے مولو کے کندھے کو تھپ تھپا رہے تھے۔ شکریہ ادا کرنے کے لیے مولو حلوائی نے فیس کا بقایا حصہ اور نذرانہ کے طور پر ایک سو روپے پیش کیے۔ جو وکیل صاحب نے فوراً جیب میں ٹھونس لیے۔

سہ پہر کو وکیل صاحب اپنے گھر پہنچے تو ان کا آٹھ سالہ بچہ ٹانگوں میں لپٹ گیا۔ "ابا جان چیز لینی ہے۔ پیسے دیں۔"

"ہٹ جا مردار۔" ماں نے ڈانٹا "گھر میں داخل تو ہونے دے۔ ذرا آرام بھی نہیں لینے دیتا۔ اور آ کر فرمائشیں شروع کر دیتا ہے۔"

"کیوں ڈانٹتی ہو۔" وہ ٹانگوں سے لپٹے ہوئے بچے کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرنے لگے۔ "کیا ہوا جو پیسے مانگ لیے۔ چکی پیسنے کو تو نہیں کہہ رہا ہے جو مجھے آرام کی ضرورت ہو۔"

اور اُنھوں نے مولو حلوائی کے دِیئے ہوئے روپوں میں سے ایک روپے کا نوٹ بچّے کی طرف بڑھایا، اُس نے جھپٹ کر چھینا اور اُچھلتا کودتا، خوشی سے شور کرتا باہر بھاگ گیا۔

وکیل صاحب نے غسل کیا۔ چائے پی۔ تھوڑی دیر اخبار دیکھا اور پھر دفتر کو چل دیئے۔ جہاں موکل ان کا انتظار کر رہے تھے۔ وہاں کچھ دیر ان کا کام کرتے رہے اور پھر شام کے وقت دوستوں کے ساتھ سینما دیکھنے چلے گئے۔

رات کو سینما دیکھ کر نکلے تو سڑک پر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں ٹہلتے ہوئے اگلے دن کی مصروفیات کا سوچتے گھر کی طرف چل دیئے۔ مگر جب گھر پہنچے تو وہاں کہرام بپا تھا اور ڈاکٹر بچّے کی نبض ہاتھ میں پکڑے مایوسی سے سر ہلا رہا تھا۔

اگلی صُبح بچّے کا جنازہ اُٹھنے لگا تو وکیل صاحب دھواں دھوں روتے ہوئے لوگوں سے کہہ رہے تھے۔

"ارے لوگو! مولو حلوائی کی مٹھائی کھا کر میرے بچّے کو ہیضہ ہو گیا۔ نہ معلوم حکومت ایسے بے ایمانوں کو سزا کیوں نہیں دیتی۔"

(۱۹۶۲ء)

نام

ایم اے کے امتحان میں چند روز باقی تھے۔ میں یونیورسٹی لائبریری میں کتابیں ڈھونڈ رہا تھا کہ میری نظر اُس پر پڑی۔ وُہ میز پہ بیٹھی کسی کتاب میں سے کچھ نقل کر رہی تھی۔ جب میں نے دیکھا تو اُس نے بھی سر اُٹھا کر مجھے یُوں ہی دیکھا۔ کمرے کی دُھندلی روشنی میں وُہ بڑی دِلکش نظر آئی۔ پھر جب کتاب درج کرانے کے لیے میں کاؤنٹر پر لائن میں کھڑا تھا۔ تو اُس کی پُشت میری طرف تھی۔ لمبی گردن میں ہلکا سا خم تھا اور باریک چنا ہُوا سفید دوپٹہ مور کے پروں کی طرح گردن اور سر کی پُشت پر پھیلا تھا۔ یہ انداز اتنا اچھا لگا کہ کتاب لینے کے بعد بھی میں نے دو تین بار دروازے میں جھانک کر اُسے دیکھا۔

ہمارا امتحان شرُوع ہو گیا۔ میں روزانہ پرچہ دینے یونیورسٹی ہال میں جاتا۔ ایک

ون پرچہ ختم کر کے باہر نکلا۔ پورچ میں چند ہم جماعتوں سے سوالات پر بات کر رہا تھا کہ وہ انیتہ کے ساتھ ادھر آتی نظر آئی۔ دوپہر کا وقت تھا اور وہ دھوپ میں آ رہی تھی۔

"ارے اس کی شکل تو کوئی خاص نہیں۔" میں نے دل میں سوچا "اس روز تو بڑی اچھی لگ رہی تھی۔"

انیتہ نے جیسے ہی مجھے دیکھا وہ بھاگی آئی۔ "آپ کے لیئے ایک پیغام ہے۔ —— ہمارے پروفیسر صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ اُن سے آج ضرور مل لیں۔"

اتنے میں چند قدم آگے جا کر وہ کھڑی ہو چکی تھی۔ میں نے انیتہ کا شکریہ ادا کرتے کرتے اس کی طرف ایک چھچلتی ہوئی نگاہ ڈالی تو اُس نے فوراً پلکیں جھکا لیں۔ اتنے میں انیتہ اُس تک پہنچ گئی اور وہ دونوں چل دیں۔ آج وہ اتنی اچھی نہ لگی تھی۔ اس لیے میں نے بھی دُوسری دفعہ نہ دیکھا۔

مجھے بالکل علم نہ تھا کہ یہ لڑکی کون ہے، کس مضمون میں ایم اے کر رہی ہے، آیا پہلے سال میں ہے یا دُوسرے میں، یا اس کا نام کیا ہے۔ نہ ہی میں اتنا دلدادہ ہُوا تھا کہ یہ سب کچھ پتہ کرتا پھرتا۔ میرا امتحان ختم ہو گیا تھا۔ اور میں کبھی کبھار پبلک لائبریری کتاب لینے یا رسالہ وغیرہ دیکھنے چلا جایا کرتا تھا یا شام کو ٹھنڈی سیر کر لیتا تھا۔

کوئی دو ماہ بعد میں صبح کے وقت پبلک لائبریری کے ریکارڈ روم میں جانے لگا تو سیڑھیوں کے پاس آ کر اُس نے اپنی سائیکل روکی اور تالا لگانے لگی۔ میں کچھ خیال کیئے بغیر اندر چلا گیا اور ٹائمز کے پُرانے پرچے اُٹھا کر میز پر بیٹھ گیا۔

اتنے میں وُہ بھی آ گئی۔ اور کاؤنٹر پر کلرک سے باتیں کرنے لگی۔ آپ نے تو پبلک لائبریری کا ریکارڈ روم دیکھا ہوگا۔ اس کے صرف ایک طرف دروازہ ہے۔ درمیان میں ایک بڑی سی گول میز ہے جس کے گرد خالی کرسیاں پڑی ہیں۔ اور دُوسری طرف ایک کارِیڈور سی ہے۔ جس کے مُنہ پر جالی ہے۔ اِدھر سے کچھ روشنی آتی رہتی ہے

مجموعی طور پر کمرہ کافی تاریک ہے۔ جس میں دن کی روشنی یا تو دروازے سے آتی ہے یا جالی سے اور باقی تاریکی دُور کرنے کو بلب جلتے رہتے ہیں۔

وہ دروازے کے قریب ہی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ میں اندھیرے میں تھا اور دروازے میں سے داخل ہونے والی تیز روشنی کے چوکور فریم میں اس کا تاریک خاکہ نظر آتا تھا۔ نقوش کی تفصیل تو نظر نہ آتی تھی مگر آؤٹ لائن بڑی دلفریب تھی ننھی سی ناک اور ٹھوڑی کی گولائی دوپٹے کی جالی میں سے نظر آتی تھی۔ نیچے سیدھی گردن دوپٹے کے روشن اور تاریک گردابوں میں گھری ہوئی۔ اس کے تلے کمر کا خم۔ جس سے ذرا پرے کندھے سے اُمنڈنے والا پلّو آبشار کی طرح لٹک رہا تھا —— میں بار بار دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔

اتنے میں وہ کلرک کے ساتھ اندر آ گئی۔ کلرک کوئی کتاب ڈھونڈنے لگا۔ اور وہ ساتھ ہی پھر رہی تھی۔ وہ سیڑھی لگا کر اُوپر والے شیلف پر جاتا تو وہ ننھی سی ناک اور ٹھوڑی اپنی سیدھی گردن پر اُٹھائے اُوپر دیکھنے لگتی۔ اور کمرے کی نیم تاریکی میں بڑی اچھی لگتی۔ تھوڑی دیر بعد اُسے کتاب مِل گئی۔ اور وہ میرے سامنے میز پر بیٹھ کر پڑھنے لگی۔

ہم کوئی گھنٹہ بھر بیٹھ کر پڑھتے رہے۔ کوئی بات چیت نہ ہوئی مگر میں کبھی کبھی اُسے چوری چوری دیکھ لیتا۔ جالی میں سے آنے والی مدھم روشنی میں اس کے چہرے کے بعض حِصّے روشن تھے۔ اور بعض تاریک۔ مجھے پہلی دفعہ غور سے دیکھنے کا موقعہ مِلا۔ اس کا رنگ کھُلا ہُوا تھا۔ چہرہ چپّتی کی طرح گول تھا۔ چھوٹی سی چپٹی ناک تھی آنکھیں لمبی اور بڑی تھیں۔ جن پر پلکوں کا گھنا سایہ تھا۔ چہرے کی جلد زیادہ صاف نہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کسی زمانے میں اس کے بہت زیادہ مہاسے نکلے تھے۔ گو اب نہ تھے۔ اس کے نقوش کو ہم فرداً فرداً خوب صورت نہیں کہہ سکتے تھے۔ مگر لمبی گردن کے ہلکے خم۔ باریک ہونٹوں کی ہلکی سی مسکراہٹ اور دونوں گالوں میں ننھے ننھے گڑھول

کی وجہ سے وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ ویسے بھی گول چہرہ میری کمزوری ہے۔
تھوڑی دیر بعد اُسے بھی احساس ہو گیا کہ میں اُس سے متاثر ہو رہا ہوں۔ اور اُس کی مسکراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ دو ایک دفعہ اُس نے میری طرف دیکھا بھی۔ تب ایک اور پیاری چیز کا پتہ چلا۔ گردن کے خم کی وجہ سے وہ آنکھوں کے کونوں کا استعمال زیادہ کرتی تھی۔ اور اس کی پلکیں اُٹھنے اور جھکنے میں کانپتی تھیں۔ جیسے ابابیل کے پر ہوں۔ کچھ دیر بعد وہ اُٹھ کر چل دی۔ میں بھی برائے نام ہی پڑھ رہا تھا۔ اِس لیے اُٹھ کے باہر نکلا۔ مگر وہ سائیکل پر جا رہی تھی اور میں پیدل ہونے کی وجہ سے پیچھے رہ گیا۔
چند دن تک وہ وقتاً فوقتاً یاد آتی رہی۔ جی چاہتا کہ اُسے دیکھوں۔ مگر کہاں؟؟ نہ مجھے اس کا گھر معلوم تھا۔ نہ نام۔ نہ کلاس۔ آہستہ آہستہ خود ہی خیال محو ہونے لگا۔
تین ماہ گزر گئے۔ چھٹیوں کے بعد یونیورسٹی کھل گئی۔ لاہور پھر سے جوبن پر آ گیا۔ ہر طرف خوش باش جوان چہرے نظر آنے لگے۔ ایک دن میں یونیورسٹی میں سے گزر رہا تھا کہ وہ ایک ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوئی۔
"شاید یہ یہاں پڑھتی ہے۔" میرے دل میں کھد بد ہوئی اور میں بھی اندر چلا گیا۔ اس ڈیپارٹمنٹ میں صبح کے وقت ایم اے کی کلاس ہوتی تھی اور شام کے وقت ایک ڈپلوما کورس پڑھایا جاتا تھا۔ میں دو سال پیشتر ڈپلوما کا امتحان پاس کر چکا تھا اور وہاں کے پروفیسر، کلرک اور چپراسی میرے واقف تھے۔ میں بلا جھجک اندر جا سکتا تھا۔ وہاں کی لائبریری اور ریڈنگ روم کے استعمال کی بھی مجھے اجازت تھی۔ اندر جا کر میرا شبہ درست ثابت ہوا اور وہ کلاس روم میں چلی گئی۔ میں دفتر میں کلرک کے ساتھ کچھ گپ لگانے کے بعد باہر نکل آیا۔
اکتوبر کے مہینہ میں میرا ایم اے کا نتیجہ نکل آیا۔ میں فیل ہو گیا تھا۔ ہمیشہ فرسٹ کلاس لینے کے بعد یہ زندگی کی پہلی ناکامی تھی۔ اور گو میں جانتا تھا کہ یہ ایک حادثے کی وجہ سے ہے۔ پھر بھی اپنے پر اعتماد اُٹھ سا گیا۔ کالج میں داخلہ تو لے

لیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر کسی سے ملنے سے گھبراتا تھا۔ خصوصاً یونیورسٹی جانے سے بہت کتراتا تھا۔ حالانکہ میری اس لڑکی سے راہ رسم نہ تھی۔ اور شاید اسے پتہ بھی نہ ہو کہ میں نے ایم اے کا امتحان دیا تھا۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے ساری دُنیا سے مجموعی طور پر اتنی شرم نہ آتی تھی جتنی اکیلی اس سے آتی تھی۔ اور مجھے یوں لگتا کہ اس کے سامنے سے بھی گزروں گا تو وُہ میرے ماتھے سے پڑھ لے گی کہ میں فیل ہو گیا ہوں۔ اس لیے تین چار ماہ تک میں یونیورسٹی نہ گیا۔ جنوری میں جا کر کچھ درست ہوا تو پھر میرا یہ معمول بن گیا کہ کالج سے فارغ ہو کر تیسرے چوتھے روز یونیورسٹی کا چکر ضرور لگاتا۔ کسی بہانے اس ڈیپارٹمنٹ میں چلا جاتا۔ وہ اکثر وہاں ہوتی، کبھی ریڈنگ روم میں، کبھی لائبریری میں، کبھی کاریڈور میں سہیلیوں یا لڑکیوں کے ساتھ۔ وہاں ایک بار گزرتا کہ اُسے دیکھ سکوں۔ یا قریب کے نوٹس بورڈ سے جھوٹ موٹ نوٹس دیکھنے کھڑا ہو جاتا۔ لائبریری میں البتہ زیادہ دیکھنے کا موقع ملتا۔

اُسے بھی میری دلچسپی کا اندازہ تھا۔ اور وُہ لرزتی ہوئی پلکوں کو جھپکا کر آنکھوں کے کونوں سے مجھے دیکھا کرتی۔ اس کا ردِ عمل کافی حوصلہ افزا ہوتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وُہ چوکنی سی ہو جایا کرتی۔ ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر پہن لیتی اور آنکھوں کے کونوں کا استعمال زیادہ کرتی۔ شروع شروع میں ہمارے دیکھنے میں چوری کا انداز ہوتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ یہ جھجک کم ہو گئی۔ گو ٹکٹکی باندھ کر نہ میں نے اُسے دیکھا تھا۔ نہ اس نے مجھے ——— اتنا البتہ ضرور تھا کہ اگر کسی اور طرف مُنہ کیے میں بیٹھا یا کھڑا ہوتا، تو وُہ مجھے دیکھتی رہتی اور ایسا ہی موقعہ پا کر میں بھی اسی طرح کرتا۔ کئی دفعہ اچانک مُڑ کر دیکھنے میں ہم دونوں ایک دُوسرے کا جُرم پکڑ چکے تھے۔ لائبریری میں بیٹھے ہوتے تو وُہ پڑھنے میں بار بار دوپٹہ کھول کر پھر سے درست کرتی۔ بلا مقصد کتابیں ایک طرف سے اُٹھا کر دُوسری طرف پٹخ دیتی۔ ادھ کھلی انگڑائی توڑ دیتی۔ زور زور سے کتاب کے ورق اُلٹتی۔ آنکھوں کے کونوں سے ٹیڑھا ٹیڑھا تکا کرتی اور کئی

ایسی چھوٹی چھوٹی حرکتیں کرتی جو خود نمائی کے لیے مخصوص ہیں۔ اور ہر لڑکی فطرتاً کرتی ہے۔ اور ہر لڑکا بیان کیے بغیر پہچان جاتا ہے۔ اِس انداز میں قریباً دو مہینے گزر گئے مگر ہماری بات چیت نہ ہوئی۔ آپ جانتے ہیں۔ لڑکے اور لڑکی کی فوری بات چیت تو افسانوں یا فلموں میں ہوتی ہے۔ اصل زندگی میں تو سو دشواریاں ہوتی ہیں۔

مارچ کی خوشگوار دوپہر تھی ——— میں کالج سے فارغ ہُوا۔ تو دل میں گدگدی سی ہوئی۔ اور میں اِس ڈیپارٹمنٹ کے ریڈنگ رُوم میں چلا گیا۔ لیکچر ختم ہو چکے تھے۔ طلباء جا چکے تھے۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح ریڈنگ رُوم میں بیٹھی تھی اور اکیلی تھی۔ یہ تو میں آپ کو بتانا بھُول ہی گیا کہ وُہ بہت محنتی تھی۔ کلاس میں بہت لائق تھی اور اس کے کپڑے پہننے کا ذوق بہت اچھا تھا۔ اس روز بھی وہ ریڈنگ رُوم میں بیٹھی اکیلی پڑھ رہی تھی۔ اور پُوری آستین والے کھلتے ہُوئے پیلے سویٹر اور ہلکے نیلے دوپٹے میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ہم دونوں کچھ دیر بیٹھے پڑھنے کا ڈرامہ سا کرتے رہے۔ مگر سچّی بات تو یہ ہے کہ میں اس خاموش رشتہ سے تنگ آ گیا تھا۔ اور اس سے بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ مگر کوئی طریقہ نہ سوجھتا تھا۔ اِتنے میں وہاں کا چپراسی اندر آ گیا۔ میں نے اُس سے پانی مانگا اور پھر اپنے زمانے کی باتیں چھیڑ دیں۔ وُہ بھی باتونی تھا۔ بات پر بات کیے گیا اور میں دِل میں خُوش ہوتا رہا کہ اِس طرح کم از کم میرا تو تعارف ہو رہا ہے۔ پھر مجھے اچانک ایک چیز سُوجھی۔ ریڈنگ رُوم میں ایک رجسٹر رکھا تھا۔ جس پر ڈیپارٹمنٹ کے ہر طالب علم کو اپنا نام لکھنا ہوتا تھا۔ تاکہ ان کی حاضری کی پڑتال ہو سکے۔ میں چونکہ ان دنوں وہاں کا طالب علم نہ تھا اِس لیے کبھی نام نہیں درج کرتا تھا مگر اس روز کتابیں اُٹھائیں اور چپراسی سے مخاطب ہو کر کہا" لاؤ بھئی آج تمھارے رجسٹر میں ہم بھی حاضری لگا دیں۔" پھر میں نے بڑے صاف حروف میں اپنا نام لکھا اور آ گیا۔ اس روز کی تاریخ میں صرف میرا ہی نام درج تھا۔

دُوسرے دن میں پھر وہاں گیا۔ جاتے ہی رجسٹر کھولا ——— میری توقّع درست

تھی۔ میرے نام کے بالکل نیچے اُس نے بھی اپنا نام بڑے صاف حروف میں لکھ دیا تھا ——— اِس طریقہ سے ہمارا آپس میں تعارُف ہُوا۔ میں سارا دن خُوشی سے بے خُود ہو کر گھُومتا رہا اور پروگرام بناتا رہا کہ اب جا کر اس سے بات چیت شروع کرنا چاہیے۔ اس کے سارے رویے سے مُجھے یقین تھا کہ وُہ بھی مجھ سے اتنی ہی دِلچسپی لے رہی ہے جتنی میں اس میں لیتا ہُوں۔ اور بات چیت کر کے معاملہ آگے چلانا کافی آسان ہوگا۔

مگر جب خُوشی دھیمی ہُوئی اور رات کو پڑھنے بیٹھا تو سوچا کہ امتحان قریب آ رہا ہے۔ لگے ہاتھوں پچھلے سال کے پرچے بھی دیکھ ڈالو۔ اب جناب پرچے جو دیکھے تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ خیال ہُوا کہ تیاری تو ہُوئی نہیں۔ کچھ دِنوں کا حساب لگایا۔ کچھ کتابوں کا حساب لگایا۔ کچھ مجوّزہ ملاقاتوں کا حساب لگایا تو کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ نہ بابا پہلے پچھلے سال فیل ہوتے ہیں۔ اگر اب بھی اِس لڑکی کے چکّر میں پھنس گئے تو پھر فیل ہوں گے۔ اور دو دفعہ فیل ہونے سے اعتماد اِتنا چکنا چوُر ہو گا کہ پھر کبھی پاس نہ ہو سکیں گے۔ چنانچہ رات کو بجلی گُل کر کے جب لیٹا تو عہد کیا کہ فِی الحال بات نہ کی جائے اور پہلے کی طرح وقتاً فوقتاً گرمگے نظارے کیے جائیں۔ چنانچہ اگلے تین ماہ اِسی طرح گُزارے۔ اِس دوران میں کبھی دُوسرے چوتھے روز ڈیپارٹمنٹ میں چلا جاتا تھا۔ اگر باہر فلپس کی لیڈی فریم والی سائیکل نظر آتی۔ جس کے پچھلے مڈگارڈ پر مارکر کے نشان میں شیر بیٹھا ہوتا تو میں اندر چلا جاتا اور تھوڑا وقت لائبریری میں گزار لیتا۔ اس کا خاموش ردِعمل ہمیشہ حوصلہ افزا اور گرمجوشی کا تھا۔ مگر اس نے بات چیت کی کبھی کوشش نہ کی۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی اِمتحان کی وجہ سے محتاط ہے۔

اِمتحان کے پہلے پرچے کے روز میں بہت گھبرایا ہُوا تھا۔ شیو بڑھی ہُوئی، بال پریشان، رنگ فق، مُنہ پر ہوائیاں اُڑی ہوتیں، یونیورسٹی ہال کے باہر لان میں کھڑا اپنی کاپی پر آخری نظر دیکھ رہا تھا۔ اچانک نگاہ اُٹھائی تو دیکھا کہ وُہ مجھ سے پندرہ بیس

گزدور ایک پودے کے ساتھ کھڑی ہے اور بڑی واضح مسکراہٹ سے میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے۔ میں ایک دم ٹھٹک گیا اور غالباً پہلی دفعہ ہم کافی تا نیوں تک ایک دوسرے کو سدھ بدھ دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں ایسی سہاس اور شفقت تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ "پگلے کچھ حوصلہ کر۔"

میں نے ہڑبڑا کر کاپی بند کر دی اور شاید ایک چھوٹا سا قدم بھی اس کی طرف بڑھایا۔ مگر وہ ایک دم جلدی سے مڑ کر چل دی۔ اس کے بعد میں نے کاپی نہیں کھولی لیکن اللہ قسم وہ پرچہ اتنا شاندار ہوا کہ شاید زندگی میں ایسا امتحان نہیں دیا۔ حالانکہ اس پرچے میں میری تیاری ناقص تھی۔

امتحان ختم ہونے کے اگلے دن میں ڈیپارٹمنٹ میں گیا۔ وہاں صرف پہلے سال کے طلباء تھے۔ مگر وہ نہ تھی۔ میں دفتر میں جا بیٹھا۔ وقت کاٹنے اور بیٹھنے کے بہانے بار بار کلرک کو چائے پلائی۔ مگر وہ نہ آئی۔ کلرک اپنا کام کرتا رہا۔ کبھی ایک چٹھی ٹائپ کرتا کبھی دوسری۔ میں بھی کسی پر سرسری نظر ڈال لیتا۔ ایک چٹھی جو اٹھائی تو دیکھا کہ وہ اس لڑکی کے بارے میں تھی۔ اس کے پروفیسر نے وائس چانسلر کو لکھا تھا کہ اس لڑکی نے فلاں موضوع پر بہت اچھا (THESIS) لکھا ہے۔ اور بڑی محنت کی ہے۔ چند کتابوں کے نہ ملنے کی وجہ سے وہ وقت پر پورا نہیں کر سکی۔ اب کتابیں مل گئی ہیں۔ اس لیے پندرہ دن کی اور مہلت دی جائے۔

میں بڑا خوش ہوا کہ چلو اب پندرہ دن تو ضرور آئے گی۔ کسی روز آ کر مل لیں گے اور پھر بات کرنے کو موضوع بھی مل گیا تھا۔ میں خوشی خوشی واپس آ گیا۔

مگر وائے قسمت اگلے روز جو ملیریا ہوا تو مہینہ بھر چارپائی سے نہ اٹھ سکا۔ ہر وقت لیٹا ہوا قسمت کو گالیاں دیتا رہتا۔ خدا خدا کر کے چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو سیدھا ڈیپارٹمنٹ گیا۔ چپڑاسی کے لیے بیڑیوں کا بنڈل لے کر ہی گیا تھا۔ وہاں اسے چائے کے لیے پیسے بھی دیے۔ مگر اس نے بری خبر یہ سنائی کہ وہ چھٹیوں میں باہر چلی گئی

ہے۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ کیونکہ چھٹیوں میں ہم دونوں کے ایم اے کے نتیجہ کا اعلان ہو جانا تھا اور بعد ازاں مجھے تو کہیں ملازمت پر جانا ہی تھا۔ وہ بھی شاید کہیں چلی جاتی۔ میں پریشان سا سوچتا رہ گیا۔ اب ایک راستہ رہ گیا تھا۔ چپراسی کو رشوت دی کہ جب بھی اس کا کچھ پتہ چلے مجھے بتائے۔ پھر میں دل برداشتہ سا گھر آ گیا۔ سچ کہتا ہوں جتنی بدمزہ وہ چھٹیاں گزریں، شاید ہی کوئی گزری ہو۔

چھٹیوں میں ہی ایک روز اس کا نتیجہ اخبار میں دیکھا۔ وہ پاس ہو گئی تھی۔ اب میری رہی سہی اُمید بھی ختم ہو گئی۔

یونیورسٹی کھلنے کے دس پندرہ دن بعد میں ڈیپارٹمنٹ گیا۔ وہاں چپراسی نے بتایا کہ اس لڑکی کو اس ڈیپارٹمنٹ میں بطور ریسرچ سکالر ایک سال کے لیے جگہ مل گئی ہے اور اس کے علاوہ اُس نے شام کے ڈپلوما کورس میں بھی داخلہ لے لیا ہے۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اگلے روز میرا نتیجہ بھی آ گیا۔ میں بھی پاس ہو گیا تھا۔ لاہور سے باہر ایک دو اچھی سرکاری ملازمتیں ہاتھ میں تھیں۔ مگر میں نے فوراً ہی لاہور میں ایک غیر سرکاری کالج میں بطور لیکچرار کام شروع کر دیا۔ اب میں تلا ہوا تھا کہ اس سے راہ رسم بڑھا کر دو چار ماہ تک شادی کر لی جائے۔ مجھے ذرا برابر بھی شک نہیں تھا کہ اُسے شادی میں کوئی اعتراض ہو گا۔

مجھے علم تھا کہ ڈپلوما کی کلاس شام پانچ بجے ہوتی ہے چنانچہ میں ایک روز عین پانچ بجے یونیورسٹی پہنچا۔ ابھی ڈیپارٹمنٹ سے چند قدم دور ہی تھا کہ سائیکل کی آواز سن کر پیچھے جو دیکھا تو میرے بالکل پیچھے سائیکل کے پیڈل اُلٹے گھماتی ہوئی وہ مجھے میٹھی نظروں سے تک رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی اُس نے سائیکل تیز کی اور آگے نکل گئی۔ مگر ابھی وہ سٹینڈ پر رکھ کر تالا لگا رہی تھی کہ میں بھی پہنچ گیا۔

"معاف کریں۔" میں نے قریب جا کر پوچھا "وہ فلاں موضوع پر THESIS آپ نے ہی لکھا ہے؟"

"جی ہاں۔" وہ مسکراہٹیں برساتی ہوئی بولی۔ اس کی لرزتی ہوئی پلکیں اُٹھ اُٹھ کر گرتیں اور گر گر کر اُٹھتیں۔ دونوں گالوں میں گڑھے ناچ رہے تھے۔

"میں بھی اس موضوع پر کچھ کام کر رہا ہوں۔" میں نے صاف جھوٹ گھڑا۔ "اور ذرا اس کے بارے میں آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"پوچھیے۔" وہ میری طرف سیدھی دیکھتی ہوئی بولی۔

"اب تو آپ نے کلاس میں جانا ہوگا۔ اگر کل کوئی وقت دے سکیں تو۔ . . . .
شاید اطمینان سے بات کر سکوں۔"

"ہاں ہاں۔ آپ دس بجے آجائیں۔"

"آپ کا ایم اے کا نتیجہ اخبار میں دیکھا تھا۔ مجھے تھوڑا رنج ہوا تھا کہ آپ اوّل نہیں آئیں۔"

اُس نے شرما کر سر جھکا لیا اور پھر سائیکل کی چابی انگوٹھی کے گرد گھماتی ہوئی بولی۔

"دراصل دو پرچے کچھ کمزور رہ گئے تھے۔ ان کی تیاری نہ ہو سکی۔"

"بہرحال مجھے بڑا رنج ہوا۔ کچھ یقین سا تھا کہ آپ ضرور اوّل آئیں گی۔"

اتنے میں اُس کا پروفیسر دروازے میں نمودار ہو گیا۔ اور وہ "گڈ ایوننگ سر" کہہ کر اُس کی طرف لپکی۔

اس کے اس طرح اچانک جانے پر حیرت تو ہوئی۔ مگر میں اپنی پہلی کامیابی پر اتنا سرشار تھا کہ زیادہ اہمیت نہ دی بہر اُروال رواں ناچ رہا تھا۔ اور اس کی گفتگو کے فقرے دل ہی دل میں دہراتا کئی گھنٹے سڑکوں پر اکیلا گھومتا رہا۔

اگلے دن کالج میں دس بجے کلاس لینا تھی۔ مگر میں نے جاتے ہی حاضری لگا کر لڑکوں کو چھٹی دے دی۔ سائیکل لے کر مارا مار کرتا یونیورسٹی پہنچا۔ مجھے یقین تھا کہ پچھلے ڈیڑھ سال کی بے قراری کو آج سکون آجائے گا اور میں آئندہ اتوار کا کوئی رنگین سا پروگرام بنانے کے بارے میں سوچتا ہوا یونیورسٹی پہنچ گیا۔

میں نے لائبریری میں جھانکا۔ وہ ایک علیحدہ میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر کمرے میں بہت لوگ تھے۔ اس لیے میں برآمدے میں نوٹس بورڈ دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد موقعہ دیکھ کر اندر چلا گیا۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی آئی۔ اور جب میں نے بات شروع کی تو اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے جواب دیے۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی لرزتی ہوئی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھتی رہی۔ میں THESIS کے بارے میں بات کرتا رہا۔ کچھ گفتگو اس کے علاوہ بھی ہوئی۔ مگر وہ بہرے لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے بات چیت رسمی ہی رہی۔ اب مجھے اطمینان تھا کہ بول چال تو شروع ہو گئی ہے۔ یعنی سب سے مشکل مرحلہ طے ہو گیا ہے۔ جس کے پیچھے ڈیڑھ برس کی خاموش باتیں ہیں۔ اس لیے اب پھر کسی دن دیکھا جائے گا۔ اور میں کوئی آدھ گھنٹہ بات کرنے کے بعد واپس آ گیا۔

میں اپنی کامیابی پہ بہت خوش تھا۔ مگر میری حساس طبیعت رہ رہ کر مجھے احساس دلا رہی تھی کہ ایک کرسی پہ وہ بیٹھی تھی۔ دوسری پاس خالی پڑی تھی۔ میں سارا وقت کھڑا ہوا اس سے بات کرتا رہا۔ مگر اس نے مجھے بیٹھنے کو نہیں کہا۔ "بہر حال دیکھا جائے گا۔ لڑکیوں کو تھوڑا سا نخرہ بھی تو جائز ہے۔"

خوشی سے رات بھر نہ سو سکا۔ بڑے بڑے میٹھے بول لبوں تک آتے جو میں اسے کہنا چاہتا تھا۔ مگر کہہ نہ سکا تھا۔ جب آدھی رات کے بعد تک کروٹیں لیتے لیتے جسم دکھنے لگا تو ارادہ کیا کہ کل پھر اسے جا کر لائبریری میں ملا جائے۔ چنانچہ اگلے دن پھر اپنی کلاس کو چھٹی دے کر میں یونیورسٹی پہنچ گیا۔

وہ سیڑھیوں کے پاس اپنی سائیکل کا تالا کھول رہی تھی۔ شاید کہیں جا رہی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ مگر اس کا چہرہ تاثرات سے خالی تھا۔ جیسے وہ مجھے پہچانتی ہی نہ ہو۔ میں قریب جا کر رکا۔ مگر وہ تالا کھولتی رہی۔ میں بہت کچھ سوچ کر آیا تھا۔ کہ ایسے بات شروع کروں گا۔ اس طرح اس کے ڈمپل کی تعریف کروں گا۔ ایسی تشبیہوں سے

گردن کے خم کو سراہوں گا۔ مگر کل والی کرسی کی بات پھر ذہن میں اُبھری اور آج کے رویّے کی وجہ سے تمام خیالات بھک سے اُڑ گئے۔ اتنے میں وہ سائیکل لے کر چلنے کو تیار تھی۔ جلدی میں تو کچھ بن نہ پڑا۔ میں نے ویسے ہی بات چلانے کو پوچھا۔

"مِس —— کل میں آپ کے پاس اپنی کتاب تو نہیں چھوڑ گیا؟"

"کہاں؟" اُس نے لاتعلقی سے پوچھا۔

"جہاں میں آپ سے آدھا گھنٹہ بات کرتا رہا۔"

"پتہ نہیں۔" اس نے لاپرواہی اور درشتی سے کہا اور پیٹھ موڑ کر چل دی۔ میں حیران کھڑا دیکھتا رہا۔ مگر اس نے میری طرف دیکھے بغیر سائیکل کے پیڈل پر پاؤں رکھا اور چلی گئی۔

سائیکل کے ڈولتے ہوئے ہینڈل کو سیدھا رکھنے کی کوشش میں میں تھکے تھکے پیڈل چلا رہا تھا اور اس کے رویّے کے بارہ میں سوچ رہا تھا۔ کیا اُسے کل میری کوئی حرکت ناپسند آئی تھی؟؟؟ یا شاید اپنی قیمت بڑھا رہی ہے۔ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ اُسے مجھ سے دلچسپی ہی نہیں۔ مگر دِل کہتا کہ تم ہی پاگل ہو۔ ڈیڑھ سال کے التفات کو ایک ثانیے کی بے رُخی سے مٹا رہے ہو۔ بہر حال اسی ادھیڑ بن میں میں کالج واپس چلا گیا۔ وہاں جا کر کوئی کلاس نہ پڑھائی۔ بلکہ سٹاف رُوم میں بیٹھا پریشان ہوتا رہا۔

کافی سوچ بچار کے بعد ایک اور طریقہ ڈھونڈا۔ شام کو پیدل سیر پر نکلتا تو اس طرح پروگرام بناتا کہ عین پانچ بجے یونیورسٹی کے سامنے سے فٹ پاتھ پر گزرتا کیونکہ وہ اُسی وقت آیا کرتی تھی۔ خیال تھا کہ اس طرح اتفاقیہ سی ملاقات نظر آئے گی اور میں اسے ہلو کہہ کر یا سلام کر کے ردِعمل دیکھوں گا۔

پہلے دن میں آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چل رہا تھا کہ سامنے اس کی سائیکل دکھائی دی۔ میرا دِل دھڑکنے لگا۔ میں سلام کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اُس نے بھی مجھے دُور

سے دیکھا اور آگے بڑھتی آئی۔ مگر میرے قریب آکر اس نے بڑے مزے سے دُوسری طرف مُنہ پھیر لیا اور مجھے "ہلو" کہنے کا موقعہ بھی نہ مِل سکا۔ میں شرمندگی اور غصّہ سے تڑپ اُٹھا۔ مگر کچھ نہ کر سکتا تھا۔

دُوسرے دن اور پھر تیسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے وُہ رات انگاروں پر کاٹی۔ چوتھے دن میں اُسے دُور سے آتا دیکھ کر ایک درخت کی اوٹ میں رُک گیا اور چھُپ کر دیکھنے لگا۔ یقین کریں وہ بے چینی سے سر اِدھر اُدھر گھُما مجھے ڈھونڈ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میرے سارے گلے ایک دم دُھل گئے اور میں کھانس کر اوٹ سے باہر نِکل آیا۔ مجھے دیکھتے ہی وُہ بے اِختیار مُسکرا پڑی۔ وہ اِس وقت کوئی پچاس ساٹھ گز دُور ہوگی۔ میں فُٹ پاتھ کے کنارے رُک گیا۔ مگر قریب آکر مُڑنے کے لیے ہاتھ کا اِشارہ دینے میں اُس نے مجھے پھر نظر انداز کر دیا۔

میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ جن سے مَیں اپنی مایُوسی بیان کر سکوں۔ لڑکی کے لیے نخرہ اور ناز یقیناً جائز ہے۔ مگر دُوسرے کی بے عزّتی تو جائز نہیں۔ میں دل ہی دِل میں پیچ و تاب کھاتا واپس آگیا اور پھر یونیورسٹی جانا ترک کر دیا۔

کوئی دو ماہ اِسی طرح گُزر گئے۔ میں یونیورسٹی نہیں گیا۔ مگر ہر وقت ایک اُلجھن میں پڑا رہتا کہ اِس لڑکی کی کانپتی ہُوئی پلکوں اور مُسکراہٹوں نے مجھے ڈیڑھ سال سہارا دِیئے رکھا۔ مگر جب میں نے قدم ذرا آگے بڑھایا تو اس نے چلن کیوں بدل لیا۔ رہ رہ کر دِل میں خیال اُٹھتا تھا کہ شاید وُہ اب کسی اور کی طرف مائل ہوگئی ہے مگر وہ کون ہو سکتا تھا۔ میں نے آج تک اُسے کسی لڑکے سے گھُل مِل کر بات کرتے یا سینما جاتے یا ٹک شاپ میں بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ پھر وجہ کیا تھی؟؟؟ ساری سوچ کا نتیجہ یہی نکلا کہ تھوڑا التفات تھوڑا گریز لڑکیوں کی مخصوص تکنیک ہے۔ جھلک دکھا کر چھُپ جانا ان کی فِطرت میں شامل ہے۔ ممکن ہے وُہ بھی پہلی حوصلہ افزائی کے بعد ذرا کھچاؤ برت رہی ہو۔ اِس لیے ایک کوشش اور کر دیکھو۔

چنانچہ وہ بھی کر ڈالی اور ایک شام یونیورسٹی پہنچ گئے۔ خوش قسمتی سے وہ بھی اسی وقت آئی اور آتے ہی کلاس روم میں گھس گئی۔ میں نے جھانکا تو وہ اکیلی تھی۔ میں حوصلہ کر کے اندر چلا گیا۔ پھر کسی قسم کی شکایت کیے بغیر میں نے اُسے یاد دلایا کہ اس کے THESIS کے بارے میں پہلے بات کر چکا ہوں اور اب ذرا اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ سپاٹ انداز میں بولی۔

"میں نے اِس کی ایک کاپی پروفیسر صاحب کو دے دی ہے جو انھوں نے لائبریری میں رکھ دی ہے۔ آپ وہاں سے دیکھ لیں۔"

"جی نہیں۔ وہاں نہیں ہے۔" میں نے ویسے ہی جھوٹ بول دیا۔ "آپ کی کاپی دو دن میں واپس کر دوں گا۔"

مگر وہ مسکرا کر بولی ——— "وہ وہیں ہے۔"

بخدا اس کی مسکراہٹ نے پھر مجھے مبہوت کر دیا اور میں نظر ہٹا نہ سکا۔ میرے اس طرح بدتمیزی سے دیکھنے پر وہ گھبرا سی گئی۔

"آپ دیکھیے تو سہی" اس نے ذرا سختی سے کہا۔ میں چونکا۔ اِتنے میں ایک لڑکا بھی اندر آ گیا اور میں باہر نکل آیا۔

یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ میں کئی دن کڑھتا رہا۔ اور "آپ دیکھیے تو سہی" میرے کانوں میں گونجتا رہا ——— بلکہ اتنے برس گزر جانے کے بعد اب بھی گونج رہا ہے۔

ایک ماہ بعد ہمیں یونیورسٹی سے ڈگری ملنا تھی۔ مجھے دھڑکتے دِل سے کانووکیشن کا اِنتظار تھا کہ اُسے ایک نظر دیکھ سکوں گا۔ مگر اِنتظار سے زیادہ اپنی بے بسی پہ غصہ آتا تھا۔ میں بار بار اپنے طرزِ عمل پر نظر دوڑاتا۔ مگر کوئی بات قابلِ اعتراض نہ لگتی تھی۔ اور مجھے آہستہ آہستہ یقین آنے لگا کہ وہ کسی اور طرف مائل ہو چکی ہے۔

پھر کانووکیشن کا دن بھی آ گیا۔ یونیورسٹی ہال جھنڈیوں، قناتوں، پھولوں اور سُرخ بنات سے دُلہن بنا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں کالے کالے گاؤن پہنے اِرد گرد گھوم رہے تھے۔ پُرانے ہم جماعت کئی ماہ بعد مِلے تھے۔ اپنی پُرانی یادوں اور نئی ملازمتوں کا ذِکر ہنس ہنس کر سُنا رہے تھے۔ کئی ایک اپنی منگنی کی خبر دے رہے تھے۔ ہر طرف عجب چہل پہل تھی۔ مگر میں اپنے آپ کو سارے ماحول سے بیگانہ محسوس کر رہا تھا اور پُرانے دوستوں کی بجائے نظریں اس کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں ہدایت ملی کہ اپنے اپنے مضمون کے لحاظ سے گروپ بنا لیں اور باری باری ہال میں داخل ہوں۔ ہمارا گروپ مختصر سا تھا کیونکہ میرے مضمون میں صرف چودہ لڑکے پاس ہوتے تھے۔ اِس لیے ہمارے ساتھ ہی لڑکیوں کا گروپ بھی آگے بڑھا اور اس میں وہ نظر آئی۔

اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ سفید شلوار، سفید قمیص، سفید دوپٹہ، کانوں میں سفید ٹاپس، اس کے اُوپر کالے گاؤن کی سلوٹیں کسی ملکہ کی پوشاک کی طرح اس کی شخصیت اُبھار رہی تھیں۔ ہم دونوں دروازے میں اکٹھے پہنچے اور اس نے میری طرف دیکھا۔

یا خدا!! میں کانپ سا گیا۔ اُس کی نظر میں وُہی التفات، شیرینی اور مٹھاس تھی۔ جس نے مجھے ڈیڑھ سال غلط فہمی میں مُبتلا رکھا تھا۔ میری کنپٹیاں ایک دم جلنے لگیں اور جب طلبا کے ریلے میں اپنی سیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا تو ذہن میں بھونچال تھا کہ یہ لڑکی چاہتی کیا ہے۔

کانووکیشن پر ایم اے کی ڈِگری مِلنا طالب علم کی زندگی کا معراج ہے۔ لڑکے سینکڑوں میلوں کا سفر کر کے آتے ہیں اور بشاش چہروں سے کارروائی میں شرکت کرتے ہیں۔ مگر میں مشین کی طرح دُوسروں کے ساتھ کھڑا رہا۔ ڈگری وصول کی۔ سر جُھکایا اور پھر بیٹھ گیا۔ نہ وائس چانسلر کی تقریر کا کوئی حصّہ سُنا اور نہ صاحبِ صدر کی تقریر کا۔

جلسہ برخاست ہُوا تو میں ہال کے باہر پورچ کی نکڑ پر کھڑا تھا۔ لان میں بینڈ بج رہا تھا۔ اور وُہ برآمدے میں کھڑی سُن رہی تھی۔ میں سخت اُداس تھا۔ اُسے حسرت سے تک رہا تھا۔ وُہ اپنے سفید لباس، کالے گاؤن اور ہاتھ میں پکڑی ہُوئی سفید ڈگری سے کوئی حُور معلوم ہوتی تھی۔ دو چار دفعہ اُس نے بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میٹھی نظروں سے مجھے دیکھا اور آنکھوں کے کونوں سے تو کئی بار دیکھا۔ مگر میری انانیت اتنی مجروح تھی کہ میں بات کرنے کو تیار نہ تھا۔ اگر اب میں نے بات کی اور وُہ نہ بولی، یا بے رُخی برتی تو اتنے لوگوں میں میری بے عزّتی ہو جائے گی۔ مگر ساتھ ہی مصیبت یہ تھی کہ اس کی نظروں میں نئی دعوت تھی، جس نے میرے ذہن میں کھلبلی ڈال دی۔ چنانچہ اب میں نے سوچا کہ اُسے کہیں ایسی جگہ ملنا چاہیے جہاں پر بالکل اکیلی ہو تا کہ اس سے ان پہیلیوں کا مطلب پُوچھ سکوں۔

خُوش قسمتی سے یہ موقع بھی جلد ہی مِل گیا۔ چند روز بعد کسی سیاسی مسئلے پر تمام کالجوں کے طلبا نے ہڑتال کی تھی۔ اور بہت بڑا جلوس نکالا تھا۔ میں بھی جلوس کے پیچھے چلتا چلتا مال روڈ سے گزر رہا تھا۔ مگر جب یونیورسٹی پہنچا تو دُور سے اس کی سائیکل ڈیپارٹمنٹ کے آگے کھڑی نظر آئی۔ دِل نے کہا اس وقت یقیناً اکیلی ہو گی اور میں جلوس گزرنے کے بعد ڈیپارٹمنٹ میں چلا آیا۔

میرا قیاس درست تھا۔ وہ اندر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مگر ایک لڑکا اور بھی تھا۔ اس کے جانے کے اِنتظار میں میں نے الماری سے ایک کتاب نکلوائی۔ اور کھول کر سامنے رکھ لی۔ میرا دماغ تیزی سے پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اس سے کس قسم کی بات کی جائے جو جلد ختم نہ ہو۔ کئی موضوع سوچے مگر تسلی نہ ہُوئی۔ اِتنے میں وہ لڑکا چلا گیا اور ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔

میرا حلق سوکھنے لگا۔ ٹانگیں کانپنے لگیں۔ جسم میں ہلکی ہلکی لرزش چھا گئی۔ مگر میں نے اپنے اوپر قابو پا کر پوچھ ہی ڈالا۔

"دیکھیے۔ آپ نے تو ایم اے میں فلاں موضوع پر بہت کچھ پڑھا ہو گا۔ کسی مُصنّف کی کوئی اچھی سی کتاب بتا سکتی ہیں؟"

اُس نے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا اور باہر کی طرف اِشارہ کر کے بولی: "باہر نوٹس بورڈ پر کتابوں کی مکمّل فہرست لگی ہے۔ وہاں سے دیکھ لیں۔"

میرا سارا جسم اس خشک جواب سے ایک دم سُن ہو گیا۔ ظاہر تھا وہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بھرپور سردی میں بھی مجھے پسینہ آ گیا۔ مگر میں خفّت چھپانے کو ڈھٹائی سے بولا:

"آج آپ نے سٹرائیک نہیں کی۔"

اُس نے سر جھکا لیا اور پڑھنے لگی۔ شرمندگی سے مجھے کمرے کی تمام چیزیں گھومتی نظر آئیں اور میں نے ڈوبتے آدمی کی طرح میز کے کنارے کو پکڑ لیا۔ مگر دو منٹ بعد اُس نے سر اُٹھایا۔

"سٹرائیک سے کیا مِل جائے گا؟"

آج میں دیانت داری سے محسوس کرتا ہُوں کہ اس نے یہ جُملہ بات چلانے کو کہا تھا اور وہ اس دن خُود بھی بات کرنا چاہتی تھی۔ مگر میری حالت اس کے پہلے رویّے سے اِتنی دگرگوں تھی کہ مجھے محسوس نہ ہو سکا۔ اور میں نے بھی درشتی سے یہ کہہ کر کہ "جو دُوسروں کو مِلتا ہے آپ کو بھی مِل جاتا۔" سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر بعد میں قسمت کو بُرا بھلا کہتا اور اپنے آپ کو کوستا اُٹھ آیا۔

دو چار روز بعد ہوش آیا اور اس کے آخری جُملہ کا صحیح اندازہ ہُوا تو میں نے اپنے آپ کو بڑی گالیاں دیں کہ وہ بے چاری تو بات آگے چلانا چاہتی تھی۔ مگر میں نہ سمجھ سکا۔ چنانچہ ازسرِ نو غصّہ چڑھنے لگا۔ مگر یہ اپنے اُوپر تھا۔ اور کئی دن تک رہا بالآخر ایک دن ٹھنڈے دِل سے سوچ کر فیصلہ کیا کہ آخری کوشش کی جائے۔

کئی دن کی منصوبہ بندی کے بعد میں شام سات بجے یونیورسٹی کے گیٹ کے

پاس چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے علم تھا کہ ڈپلوما کی کلاس سات بجے ختم ہوتی ہے اور وہ قدرے دیر سے باہر آیا کرتی ہے۔ اتنے میں اِکّا دُکّا لڑکے باہر نکل گئے اور میں گیٹ سے نکل کر اندر کی طرف چلا۔

اس روز سترہ فروری تھی۔ سات بجے رات گہری ہو گئی تھی۔ اور ساڑھے سات بجے اے۔آر۔پی یا سِول ڈیفنس والوں کی ایک مشق تھی۔ جس میں دو گھنٹے کے لیے کرفیو اور بلیک آؤٹ ہونا تھا۔ یہ دن میں نے جان بوجھ کر چنا تھا کہ اُسے باتوں میں لگا لوں گا۔ اتنے میں کرفیو لگ جائے گا اور پھر ہم دو گھنٹے کے لیے اکٹھے ہوں گے۔ آج میں تلا ہُوا تھا کہ اپنا دِل کھول کر اُس کے سامنے رکھ دوں گا اور صاف صاف کہہ دوں گا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

جب میں یونیورسٹی ہال کے پورچ میں پہنچا تو عین اُس وقت وہ بھی وہاں آئی۔ وہ سائیکل ہاتھ میں لیے پیدل آ رہی تھی اور بجلی کی روشنی کے نیچے ہم دونوں ملے —— میں رُک گیا ——

"معاف کریں۔ ایک منٹ کے لیے کچھ بات کر سکتا ہوں؟"

وُہ رُکے بغیر آگے بڑھتی گئی۔

"سُنیے —— میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لُوں گا۔"

مگر وہ انکار کے طور پر سر ہلا کر آگے چلی گئی۔

میری حالت اس مُسافر کی سی تھی۔ جو کتنی دن کے سفر کے بعد جہاز پکڑنے کو سمندر پر پہنچے۔ مگر بندرگاہ میں داخل ہونے سے پہلے اس کی نظروں کے سامنے جہاز چل پڑا ہو۔ میں نے انتہائی بے بسی اور بے چارگی سے اسے ایک دفعہ پھر آواز دی۔ وہ اس وقت تک پندرہ بیس گز آگے جا چکی تھی۔ چلتے چلتے اس نے بغیر پیچھے مُڑے کچھ کہا۔ مگر میری حالت اتنی غیر ہو چکی تھی کہ میں سمجھ نہ سکا۔

اور وُہ چلی گئی ——

میں نے جکرا کر دیوار کا سہارا لیا اور نہ جانے کتنی دیر گم سم کھڑا رہا۔ اتنے میں بجلی ایک دم گل ہو گئی اور فضا میں سائرن گونجنے لگے۔ میں اپنے جسم کو گھسیٹ کر ہال کی سیڑھیوں تک لے گیا۔ اور وہاں بیٹھ کر اندھیرے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اگلے دن بستر پر آنکھ کھلی تو سب سے پہلا خیال دماغ میں یہ آیا کہ اس نے جاتے جاتے کہا کیا تھا؟ کئی اندازے لگائے۔ مگر قرینِ قیاس یہی تھا کہ کرفیو کی وجہ سے وہ جلد از جلد گھر جانا چاہتی تھی۔ اس لیے اس وقت نہ رک سکتی تھی مگر اس کی تصدیق کیسے ہو؟ یہ پتہ کیسے چلے کہ وہ بے رخی نہیں برت رہی بلکہ کرفیو سے پہلے گھر پہنچنے کی مجبوری تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد طے یہ پایا کہ آج لائبریری میں بیٹھا جائے اور اس سے کوئی بات نہ کی جائے۔ اگر وہ رات کے رویے کی معذرت کر دے یا صرف اتنا ہی پوچھ ڈالے کہ کیا بات کرنا چاہتا تھا۔ تو میں عمر بھر کا غلام ہو جاؤں گا۔

یہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ وہ لائبریری میں بیٹھی تھی۔ میں بھی وہیں تھا۔ کتاب میرے سامنے تھی۔ مگر اس کے اوراق میں سے کبھی اس کی گردن کا خم اور کبھی ڈمپل کا تصور ابھر آتے۔ کوئی ایک گھنٹہ وہ بھی بیٹھی رہی۔ میں بھی بیٹھا رہا۔ دو ایک مواقع ایسے بھی آئے جب ہم اکیلے تھے۔ مگر اس نے کوئی بات چیت نہ کی۔ البتہ بے چین بہت نظر آتی تھی۔ بار بار پہلو بدلتی۔ کتاب کے ورق الٹتی رہتی۔ کاپی اور پنسل سے کھیلتی رہتی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کی توجہ پڑھائی کی طرف نہیں۔ مگر میرا مقصد اس کی بے چینی سے پورا نہ ہوتا تھا۔ اس لیے میں بھاری دل سے اٹھ آیا۔

کالج جاتے ہی میں نے استعفیٰ لکھ کر دے دیا کہ قواعد کے مطابق مجھے ایک ماہ بعد فارغ کر دیا جائے۔ جس مقصد کے لیے لاہور بیٹھا تھا۔ جب اس میں ہی ناکام ہو گئے تو یہاں رہنے سے کیا حاصل۔

دو چار روز بعد میں یونیورسٹی سے گزر رہا تھا کہ وہاں کے پورچ میں سے میری طرف آتی نظر آئی۔ اس نے مجھے دیکھا۔ مگر میں راستہ تبدیل کر کے دوسری طرف سے

نکل گیا۔

کچھ عرصہ بعد میں نے اُسے انارکلی میں دیکھا۔ وُہ ایک معمّر خاتون کے ساتھ جا رہی تھی۔ جب میری نظر اس پر پڑی تو وُہ پہلے سے مجھے دیکھ رہی تھی اور جب میں نے دیکھ کر آنکھیں ہٹا لیں تو بھی وُہ دیکھتی رہی۔ آپ شاید سمجھیں...... کہ میں جذباتی ہو کر بات کر رہا ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی نظر میں اتنی واضح شکایت اور حسرت تھی کہ میں چکرا گیا۔ مگر میں مزید کوشش کرنے کو تیار نہ تھا۔ اگر وہ اپنی قیمت اس طریقہ سے بڑھانا چاہتی تھی تو میں خود اس سے زیادہ نہیں گر سکتا تھا۔ عورت کا گریز حقیقت ہے۔ مگر مرد کی انا اس سے بڑی حقیقت ہے۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد مجھے ایک فرم میں بڑی اچھی ملازمت مل گئی۔ قریباً ایک ہزار روپے تنخواہ تھی۔ میں نے جھٹ سے کار خرید ڈالی۔ اور کئی روز یونیورسٹی کے گرد و نواح میں کار پر گھومتا رہا۔ اُس نے مجھے کئی دفعہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔

اب اس میں ایک تبدیلی آگئی تھی۔ وہ مجھے جہاں بھی دیکھتی ٹکٹکی باندھ کر گھورنے لگتی اور اس کی آنکھوں میں اتنی واضح دعوت ہوتی کہ اِس ساری کہانی سے لاعلم آدمی بھی چلّا اُٹھتا کہ وُہ مجھے چاہتی ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں آزمودہ را آزمودن جہل است ڈیڑھ سال ان نظروں نے میری اُمنگوں کو پالا۔ اور پھر چھ ماہ میں ہی لڑکی نے روند ڈالا۔ اب میں اُن آنکھوں پر کیا یقین کر سکتا تھا۔ اور اگر بالفرض وُہ مائل بھی ہے تو میں نے سوچا کہ کار کی وجہ سے ہو گی۔ اس کو لگاؤ میری کار سے ہے مجھ سے نہیں ہے۔ چنانچہ وُہ جہاں کہیں ملی۔ میں نے بڑی رکھائی سے اُسے نظر انداز کر دیا۔ بلکہ ایک دفعہ تو میں پیدل جا رہا تھا۔ اور وُہ انیتہ کے ساتھ بس سٹاپ پر کھڑی تھی۔ میں نے رُک کر انیتہ سے دو چار منٹ بات کی۔ اِس دوران میں وُہ آنکھیں گاڑ کر مجھے دیکھتی رہی۔ وُہ متوقع تھی کہ میں اُس سے بھی بات کروں گا۔ مگر میں نے ایک نظر ڈال کر بے رُخی سے آنکھیں نیچی کر لیں۔ اور آگے بڑھ گیا۔ میرا رویّہ بظاہر سرد ہوتا تھا۔ مگر میں ہمیشہ مُنتظر

رہتا تھا کہ وہ مجھ سے بات کرے۔ بار بار ناکامیوں سے میری خودداری اتنی مجروح ہوئی تھی کہ اب میں کسی حالت میں بات کرنے کو تیار نہ تھا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ ایک دفعہ بھی بات کر لیتی یا اشارے سے روک ہی لیتی تو اللہ قسم وہیں اس کے قدم پکڑ لیتا اور دوسرے دن شادی رچا لیتا۔

میں اپنی طرف سے یہ قصہ ختم کر چکا تھا۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اس قصہ سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا اور اس کی یاد دن بدن شدت اختیار کرتی گئی۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ میں سڑک پر جا رہا ہوں کہ میرے منہ سے اس کے کہے ہوئے جملے لاشعوری طور پر نکل جاتے۔ راہ گیر حیران ہو کر مجھے دیکھتے تو میں شرمندہ ہو کر رہ جاتا۔ اسی طرح کتنی دفعہ اس کا نام زیرِ لب پکارتا رہتا جس سے بعض اوقات بڑی پریشان کن صورتِ حال پیدا ہو جاتی۔ کتنی دفعہ لوگوں نے سنا اور پوچھا بھی ــــــ مگر میں ٹال گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ہر وقت محتاط رہنا پڑتا۔ اور میری شخصیت میں اپنے آپ سے ایک عجیب قسم کا خوف پیدا ہو گیا۔ وہ تو بالآخر قدرت نے مدد کی کہ جب کچھ عرصہ بعد شادی ہوئی تو خوش قسمتی سے میری بیوی کا نام بھی وہی تھا جو اس لڑکی کا تھا۔ اس لیے اب عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اپنی بیوی پر بہت فریفتہ ہوں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میری بیوی کو مجھ سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ میں اسے پورا پیار نہیں دے سکا۔

کوئی دو سال پہلے کی بات ہے کہ میں رحیم اور سلطان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یہ دونوں اب ہماری فرم میں ملازم ہیں اور سوئے اتفاق سے دونوں یونیورسٹی میں اسی لڑکی کے ہم جماعت تھے۔ ان دنوں تو میرے واقف نہ تھے۔ مگر اب گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں میری عمر کے ہیں اور ہم سب کے بچے کالجوں میں پڑھ رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں اس لڑکی کا ذکر چھڑ گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب رحیم نے اس کے

عاشق ہونے کا دعویٰ کیا۔ مگر ساتھ ہی ناکام عاشق ہونے کا اعتراف بھی کیا۔ بات نے طول پکڑا تو اس نے ہمیں اپنی داستان سنائی۔ حیرت والی بات یہ تھی کہ اس کی اور میری داستان قریباً قریباً ایک ہی تھی۔ اس لڑکی نے اس کو اپنی طرف لبھایا تھا۔ حوصلہ افزائی کی تھی۔ اپنی حرکات سے محبّت کا رنگ دکھلایا تھا۔ مگر اس کی ہر عملی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔ اور مزا یہ کہ یہ سارا قصّہ بھی اسی زمانے کا تھا۔ جب میں بھی اسی چکّر میں سرگرداں تھا۔ رحیم میری طرح حسّاس نہ تھا۔ وہ اس کو بھول گیا تھا۔ اور اب اسے مکّار، چالباز، فلرٹ اور لومڑی جیسے خطابات سے یاد کرتا تھا۔ رحیم کی کہانی میرے قصّے سے اتنی مطابقت رکھتی تھی۔ کہ میں نے بھی محض حیرت کی بنا پر اپنا آدھا ادھورا رومانس سنا دیا۔ کافی بحث کے بعد ہم دونوں کی متفقہ رائے یہ تھی کہ اس لڑکی کو لڑکوں کے جذبات سے کھیلنے میں مزا ملتا ہے۔ جیسے بلّی چوہے کو اچھال اچھال کر آدھ مُوا کر کے مزا لیتی ہے۔

سُلطان خاموش بیٹھا ہماری باتیں سنتا رہا۔ جب ہم اپنا غبار نکال چکے تو وہ بولا "تم دونوں بے وقوف ہو اور اس لڑکی کو قطعاً غلط سمجھے ہو۔"

"وہ کیسے؟؟؟"

"وہ ایسے کہ تم دونوں میں سے جو چاہتا اُس سے شادی کر سکتا تھا بلکہ یوں کہیے کہ جتنی محبّت وہ کر سکتی تھی وہ تم دونوں سے کرتی رہی ہے۔"

"بالکل بکواس" رحیم چلّایا "یہ محبّت کا نرالا ہی طریقہ ہے کہ دُور سے ترساؤ اور قریب نہ آؤ۔"

"تم لوگوں کو شاید تعجب ہو گا سن کر کہ میں بھی اس پر فریفتہ ہوا تھا۔" سُلطان نے کہا۔

"ہاہاہا" رحیم ہنسا۔ "ابے اُلّو کے پٹھّے تو بھی کسی لڑکی پر فریفتہ ہو سکتا ہے تُو تو ہر لڑکی کو پان سمجھ کر چبایا کرتا تھا۔ یونیورسٹی کا راجہ اندر تھا تُو۔ تیرے جیسے

فلرٹ کو محبت کرنے کی فرصت ہی کہاں ہے؟"

اور یہ حقیقت تھی کہ سلطان اپنے زمانے میں بہت تیز لڑکا تھا۔ اور یونیورسٹی کی بہت سی لڑکیوں سے کامیاب رومانس لڑا چکا تھا۔

"ارے سُن تو سہی" سلطان بولا "میں نے کب کہا کہ تم دونوں کی طرح میں اس کے پیچھے مجنوں بن گیا تھا۔ میرا تو مطلب یہ تھا کہ چند لمحے اچھے گزر جائیں اور بس۔ مگر وہ قابو میں نہیں آئی۔"

"مگر ہوا کیا تھا؟ کچھ بولو گے بھی یا تمہید ہی بناتے جاؤ گے۔"

"تم سنو تو!! ہونا کیا تھا۔ بس ایک روز اُس کے پیلے سویٹر پر اپنا دل آگیا۔ ہم نے ذرا ہاتھ پاؤں چلائے تو اُس نے بھی ایسی غلط فہمی کرادی کہ ہم نے کہا کہ میاں یہاں تو پکوان پہلے ہی تیار ہے۔ مگر ایک دن میں نے ٹک شاپ میں چلنے کو کہا تو اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اب اپنے پاس اتنا وقت تو تھا نہیں کہ اس کے پیچھے پاگل ہو کر گھومتے رہتے۔ ابھی یونیورسٹی میں کتنی لڑکیاں ایسی تھیں جن کو سال کے باقی حصے میں بھگتنا تھا۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ پہلے ہی تُرپ چال چلی جائے۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ یوں کہ کلرک تو اپنے ہی ہاتھ میں تھا۔ اس سے لڑکی کے گھر کا پتہ لیا اور ایک شام جا دروازہ کھٹکھٹایا۔"

"ارے!" رحیم چونکا۔

"اس کا چھوٹا بھائی باہر نکلا۔ میں نے کہا تمہاری باجی سے ملنا ہے تو باہر آ کر کہنے لگا کہ وہ نام پوچھتی ہیں۔ میں نے کہا کہ اُن ہی کو نام بتاؤں گا۔ باہر آ جائیں تو عرض کروں گا۔ خیر مجھے اندر بُلا لیا گیا۔ مگر یار مشکل یہ پڑی کہ بھائی بھی اسی کمرے میں تھا اور غالباً آخر تک رہتا۔ اگر میں قینچی نہ چلاتا۔"

"کون سی قینچی؟"

"یہی کہ اُسے بھگا یا جائے۔ ہُوا یوں کہ وہ اندر سے شربت لانے گیا تو میں نے کہا کہ دیکھو میں تمھارے ساتھ چند ایسی باتیں کرنے آیا ہوں جن کو تمھارے گھر والے قابلِ اعتراض سمجھیں گے۔ میں نے وہ باتیں ضرور کرنا ہیں۔ خواہ تمھارا بھائی یہاں بیٹھا رہے یا چلا جائے۔"

ہم بے اختیار ہنس دیے۔

"لڑکی سمجھ دار تھی۔ اس نے اپنے بھائی کو اندر بھیج دیا۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟" رحیم کرسی سے آگے جھک آیا۔

"کرنا کیا تھا۔ میں نے اُسے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ تم مجھے اچھّی لگتی ہو۔ پھر اس کے حُسن کی تعریف کی اور وہ سارے گُر آزمائے جن سے پہلے کتنی لڑکیاں فتح کی تھیں۔"

"کیا بولی وہ؟" میں بولا۔

"جانتے ہو کیا کہا اُس نے؟"

"کیا؟" ہم دونوں ایک ساتھ بولے۔

"کہنے لگی اگر تم مجھ سے اِتنی ہی محبّت کرتے ہو تو شادی کر لو۔ میں نے دِل میں سوچا مارے گئے یہ تو نماز بخشوانے آئے اور روزے بھی گلے پڑ گئے۔"

"پھر؟"

سلطان سگریٹ سلگانے لگا۔ کم بخت کو ہمارے جذبات کا بھی خیال نہ تھا۔

"پھر یہ کہ" اُس نے لمبا کش کھینچا۔ "میں نے کہا کہ میں تیار ہوں لیکن بہتر ہے کہ پہلے چند روز ہم اکٹھے گزار لیں تاکہ تم میری طبیعت سمجھ جاؤ۔ مگر وہ نہ مانی کہتی تھی میں بدنام ہو جاؤں گی۔ میں نے بہت زور مارا تو بڑے درد سے کہنے لگی سلطان صاحب! ہم متوسط طبقے والوں کے پاس نام کے علاوہ اور ہے ہی کیا۔ اچھّی اخلاقی شہرت کے لیے ہی تو ہم سینکڑوں ذہنی دیواریں بناتے ہیں اور اگر شادی کے وعدوں

پر تجربوں میں وہ نام ہی کھودوں تو کون شادی کرے گا مجھ سے ؟ بھئی رحیم میں نے اُس کی بات سُنی، تو مجھے یوں لگا جیسے اُس نے میرے دِل میں جھانک کر میری نیت کو گردن سے پکڑ لیا ہو ۔ بحث تو ڈھٹائی سے پھر بھی میں کرتا رہا۔ مگر وہ اٹل تھی اور میں اُٹھ کر آ گیا۔"

"اس کے بعد پھر کبھی نہیں ملے ؟" میں نے پُوچھا۔

"اوں ہوں۔ میں وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں ۔ اور کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔" اس نے کش لگایا۔ "در اصل اس کا باپ اِنتہائی غیر ذمّہ دار تھا۔ اور توقع نہ تھی کہ وہ لڑکیوں کے لیے رشتے ڈھونڈ سکے گا۔ پھر اس کی تین چھوٹی بہنیں اور بھی تھیں۔ اور تم جانتے ہو کہ ہمارے خاندانی نظام میں گھر کے بڑے بچّے کی چھوٹے بچّے ہر حال میں تقلید کرتے ہیں۔ اِس لڑکی کو اپنی اِس ذمّہ داری کا اِحساس تھا۔ .... وہ ہر ایک سے شادی کرنے کو تیار تھی۔ خواہ سلطان ہو۔ یا رحیم ہو۔ یا کوئی اور ہو۔ مگر کسی سے دوستی کا جوا کھیل کر اور بدنام ہو کر شادی کے آئندہ اِمکانات تباہ کرنا نہیں چاہتی تھی ـــــــ اپنے بھی اور اپنی بہنوں کے بھی ـــــــ نام اس کا مسئلہ نہ تھا۔ سارے متوسط طبقے کا مسئلہ ہے۔ عورت کا بنیادی مسئلہ، تم جانتے ہو، شادی ہے اِسی کے نام پر وہ اپنا اخلاق تباہ کر سکتی ہے۔ اور اسی کی خاطر وہ اپنا اخلاق بچائے رکھتی ہے۔"

"وہ آج کل کہاں ہے؟" میرے دِل میں یہ سوال بڑی دیر سے کُھد بُد کر رہا تھا۔

"فلاں کالج میں پروفیسر ہے ـــــــ میری لڑکی بھی اُسی کالج میں پڑھتی ہے اور وہ ذکر کرتی ہے کہ ہر جگہ نیک اخلاق کی مثال دینے اسی پروفیسر کا تذکرہ ہوتا ہے ـــــــ بڑا اچھا نام ہے اس کا۔"

اِتنے میں دو ایک دوست اور بھی آ گئے اور موضوع ختم ہو گیا۔

آج صبح میں اپنے ڈاکٹر دوست کے پاس بیٹھا تھا جو نفسیاتی معالج ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہمارے ملک میں طبیبوں کی اتنی ضرورت نہیں جتنی نفسیاتی معالجوں کی ہے۔ کیونکہ پابندیوں میں جکڑے ہوئے اس معاشرے میں زیادہ تر بیماریاں نفسیاتی اُلجھن کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ مجھے اس کا نکتۂ نظر تسلیم کرنے میں تامّل تھا۔ اور میں کہہ رہا تھا کہ ہر ایک سپیشلسٹ یہ سمجھتا ہے کہ دُنیا میں اس کے وجود کے علاوہ اور کسی کی ضرورت نہیں بحث ہوتی رہی اور وہ اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کو مریضوں کے ہسٹری کارڈ اُٹھا لایا۔ ایک ایک کارڈ پر نظر ڈالتا اور مریضوں کے حالات بتاتا جاتا۔

"ایک مریضہ ہے جس کی ہسٹری دِلچسپ ہے۔ جب یہ پہلے روز میرے پاس آئی تھی تو میں میز پر کام کر رہا تھا۔ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ وُہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ کہ اتنے میں بجلی بُجھ گئی۔ ہم نے چند لمحے انتظار کیا اور پھر میرا ملازم ایک بڑی موم بتی اُٹھا کر لے آیا۔ جو میں نے اپنے سامنے کی میز پر رکھ لی اور مریضہ کی ہسٹری لکھنے لگا۔ مجھے حیرت اِس بات پر ہوئی کہ مریضہ کی زبان میں ہکلاہٹ پیدا ہو گئی اور اس کی باتیں بے ربط ہو گئیں۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو وُہ بڑی وحشت سے موم بتّی کو گھُور رہی تھی۔ پھر ایک دم وُہ اُٹھی اور موم بتّی کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیا۔"

"ارے" میں حیران رہ گیا۔ "مگر یہ کیوں کیا اس نے؟"

ڈاکٹر مسکرایا۔ "میں نے اس کے گھر والوں سے پتہ کیا تو معلوم ہُوا کہ وہ اکثر موم بتیوں کو توڑ پھوڑ دیتی ہے اور انھیں برداشت نہیں کر سکتی۔"

"مگر کیا وہ اسی تکلیف کے علاج کے لیے آئی تھی؟"

"نہیں یہ وقوعہ تو اتفاقیہ ہو گیا۔ وُہ خُود نہیں آئی تھی بلکہ اس کے گھر کے لوگ اُسے زبردستی لاتے تھے۔ تکلیف اُسے یہ تھی کہ برسات کے موسم میں وُہ ستونوں سے لپٹ کر رونے لگتی۔ روتے روتے بے ہوش ہو جاتی اور اس کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات چاندنی راتوں میں بھی وُہ ایسا ہی کرتی۔ اس کے لواحقین کو خاص طور پر ایسا گھر

لینا پڑتا تھا جس میں ستون کوئی نہ ہو۔ مگر تم جانتے ہو۔ کسی اور جگہ ستون کا مِلنا مشکل نہیں اور وہ ادھر ہی بھاگ جاتی۔"

میں دم بخود تھا۔ ویسے ہی ہسٹری کارڈ اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ مریضہ کے نام پر نگاہ پڑی تو میں ایک دم چونکا ——— یہ وُہی تھی۔ عُمر پچیس سال لکھی تھی۔ اور نام کے ساتھ "مِس" کا لفظ دیکھ کر مجھے نہ معلوم کیوں دُکھ ہُوا۔ میں تھوڑی دیر کو سُن سا ہو گیا۔

"اب اسے کچھ فائدہ ہُوا ہے تمھارے علاج سے؟" میں نے بالآخر پُوچھا۔

ڈاکٹر نے دونوں ٹانگیں میز پر رکھ دیں اور کرسی کی ٹیک پر پھیل گیا۔ پائپ میں تمباکو جما کر اس نے دیا سلائی دکھائی اور دُھواں چھوڑتے ہُوئے بولا:

"اگر ہم اسے عنقریب پاگل ہونے سے بچا سکیں تو یہ ایک معجزہ ہو گا۔"

(۱۹۶۳ء)

ہیر کا مقبرہ

ادیب ہو ——— اور جھنگ میں رہتا ہو ——— تو ہیر سیال کے متعلق کیوں نہ لکھے گا۔

جب اُس نے ہیر کی کہانی لکھی۔ جو ایک ممتاز ادبی رسالے میں شائع ہوئی۔ تو ایڈیٹر نے اُسے مبارکباد کا پیغام بھیجا۔ اور کئی لوگوں نے اُسے خطوط لکھے کہ اُس نے ہیر اور رانجھے کو لازوال بنا دیا ہے۔ اِس قصّے کو جس انداز میں اُس نے بیان کیا ہے اُس سے اُن دونوں کی مظلومیت پہ ایک زمانہ ترس کھا رہا ہے۔ اور اُن کی وفا زندۂ جاوید ہو گئی ہے۔

اور یہ حقیقت ہے کہ ادیب نے یہ قصّہ لکھنے کے لیے بہت محنت کی تھی۔ جب اُس نے ارادہ کیا تو صُبح سویرے اُٹھ کر ہیر کے مقبرے کی طرف چل دیا۔ جھنگ سے

لائیلپور جانے والی سڑک پر ایک دو میل چلنے کے بعد دائیں جانب ایک اُونچا سا ٹیلہ نظر آیا۔ اور وُہ سڑک سے ہٹ کر پگڈنڈی پر ہو گیا۔ دھول کے غبار اس کے پاؤں سے لپٹنے لگے۔ کھیتوں کے ایک دو چوکور ٹکڑے گزرنے کے بعد بھٹے کی اینٹیں بکھری ہوئی ملیں۔ اُس نے پاؤں تھپک کر مٹی اُڑائی۔ اور پھر سے دھول اُٹھاتا آگے چل دیا۔ ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر وُہ درختوں کے جھنڈ سے آگے نکلا۔ دیوار کے گرد چکّر لگا کر ہیر کے مقبرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اور بڑے اشتیاق سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

یہ ایک عام کمرے کے سائز کی پتّھر کی عمارت تھی۔ جس میں بغیر کواڑ کے دروازہ تھا۔ اندر جانے کے لیے دو سیڑھیاں تھیں۔ اور دروازے کے دائیں طرف دیوار میں یہ عبارت کندہ تھی:

"عاشقِ صادق میاں رانجھا اور ہیر سیال کی آرام گاہ۔"

وُہ اندر داخل ہُوا تو ہلکے سبز رنگ کے غلاف میں لپٹی ہُوئی پکّی قبر نظر پڑی۔ جس کے سرہانے دو اڑھائی فٹ اونچا کتبہ تھا۔ اُس پر ہیر اور رانجھا کے اکٹھے دفن ہونے کے متعلق لمبی سی عبارت تھی۔ ساتھ ہی لکڑی کا ایک دیا تھا۔ جس کے اِرد گرد سرسوں کے تیل میں بھیگی ہُوئی راکھ کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں تھیں۔ قبر کے گرد خُوشنما پکّا فرش تھا۔ اور قلعی شدہ دیواروں میں خوبصورت محراب بنے تھے۔ چھت کے بیچ میں بڑا سا گنبد تھا۔ جس میں کلس کی بجائے گز بھر قطر کا گول سوراخ تھا۔ اِس سوراخ میں سے نیلا آسمان، کہیں کہیں بادل کے مرغولے اور اِدھر اُدھر لپکتے ہُوئے پرندے نظر آتے تھے۔ ادیب کو دیواروں پر کچھ نقوش اور تحریریں نظر آئیں۔ اور وُہ قریب جا کر پڑھنے لگا۔ یہ نقوش زائرین کے آنے کے ثبوت تھے۔ کئی ایک نے اپنا نام اور تاریخ لکھی تھی۔ اکثر نے اپنے ساتھ اپنی محبُوبہ کا نام بھی لکھا تھا۔ کسی جگہ دِل کی تصویر بنی تھی۔ جس میں تیر اٹکا تھا۔ اور اس کے دونوں طرف لڑکے اور لڑکی کے

نام تھے۔ اکثر لوگوں نے مُرادیں مانگی تھیں کہ اے مائی ہیر یا میاں رانجھے اگر مجھے میری محبوبہ مِل گئی تو میں یہاں آکر خیرات کروں گا یا فلاں شرط پوری کروں گا۔ اِسی طرح اپنی اپنی خفیہ محبّت کی کامیابی کی دُعائیں۔ کوئلے۔ چاک۔ پنسل اور سیاہی سے تحریر تھیں۔ بعض زائرین نے اپنے شہروں کے نام بھی لکھے تھے۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا۔ کہ ہندو پاکستان کے کونے کونے سے لوگ یہاں آئے ہیں۔

اگلے روز سے ادیب وہاں ہر روز آنے لگا۔ اور بیٹھ کر اُن کا قصہ لکھتا۔ کبھی ایک صفحہ لکھتا کبھی دو۔ بعض دفعہ سارا دن لکھنے کے بعد شام کو پھاڑ ڈالتا کیونکہ اس میں اُن جذبات کی عکّاسی نہ ہو پائی تھی جو اُس کے دِل و دماغ پر چھاتے ہوتے۔ وہ اپنی کہانی میں ہیر اور رانجھے کی مظلومیت کو خاص طور پر اُبھارنا چاہتا تھا۔ جن کی سچی لگن معاشرے کی غلط اقدار کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

چنانچہ ادیب نے اس قصّہ کا ہر پہلو تفصیل سے لکھا۔ رانجھے کا البیلا پن' اس کی بھابیوں کے طعنے۔ رانجھے کا غیرت کھا کر ہیر کی تلاش میں نکلنا۔ دریائے چناب میں طغیانی۔ لُڈن ملاح کی کشتی پر ہیر سے مُلاقات۔ ونجھلی کی آواز پر ہیر کا مست ہونا۔ ہیر کے باپ ملک چوچک کے ہاں رانجھے کا چرواہا بننا۔ ہیر اور رانجھے کی خفیہ مُلاقاتیں۔ اور بالآخر لنگڑے چاچے کیدو کا گھی والی چوری مانگ کر راز افشا کرنا اور ملک چوچک کو اُکسانا کہ ہیر کی شادی رنگ پور کے کھیڑے سے کر دی جائے۔ یہ تمام تفصیلات لکھنے کے بعد ادیب کے قلم نے سماج کے نظریات پر کڑی نکتہ چینی کی۔ جن کے تحت گاؤں کا بڑا زمیندار ملک چوچک اپنی لڑکی کی شادی رانجھے سے اس وجہ سے نہیں کر سکتا تھا کہ وہ دو سال تک اُن کا چرواہا رہا ہے۔ اور دونوں کے پیار کے باوجود رنگ پور کے کھیڑے رشتے کے لیے چُنے گئے۔ پھر شادی کے بعد ہیر کی فرضی بیماری اور رانجھے کے جوگی بن کر آنے کا ذکر کرتے ہوئے ادیب نے لکھا کہ معاشرے کی غلط اقدار کی وجہ سے فرد کی شخصیت پر اِس قدر بوجھ رہتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو تعمیری کاموں

میں لگانے کی بجائے ریا کاری اور فریب میں لگا دیتا ہے تاکہ اپنی اُن اُمنگوں کی تسکین کر سکے جو اُس کا پیدائشی حق ہیں۔ اور جنھیں سماج تسلیم نہیں کرتا۔ بنی نوع انسان کا کتنا قیمتی سرمایہ ایسے افراد کی شکل میں ضائع ہو رہا ہے۔

اس تنقید کے بعد ادیب نے کہانی جاری رکھی۔ جگی ایک دن کھیڑوں کی لڑکی سہتی اور بھو ہیر کو لے کر غائب ہو جاتا ہے۔ کھیڑے کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے مُسلّح ہو کر گھوڑوں پر تعاقب کرتے ہیں۔ رانجھا زخموں سے چُور ہے۔ یہ صورتِ حال ادیب کے لیے بڑی دردناک تھی۔ وہ اس معاشرے پر برس پڑا جو دو دِلوں کے سچے ملاپ کو جھوٹے وقار کی خاطر خُون کے تالاب میں ڈبو دیتا ہے۔ اس نے لکھا کہ زندگی مجموعی طور پر اس لیے مُشکل بن گئی ہے۔ کہ سوسائٹی کے افراد فرداً فرداً ناخوش ہیں۔ کیونکہ بہ حیثیت فرد ان کی شخصیّت کے تقاضوں کو مایوسی کا مُنہ دیکھنا پڑتا ہے۔ قُدرت ہر فرد کو مکمل بناتی ہے۔ جسمانی۔ رُوحانی۔ دماغی اور جنسی طور پر وُہ مکمّل ہوتا ہے۔ لیکن جس معاشرے میں وُہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی اقدار کے مطابق فرد کی شخصیّت کا کوئی نہ کوئی حصّہ دب جاتا ہے۔ زندگی سے اس وقت تک ٹریجڈی ختم نہیں ہو سکتی۔ جب تک سوسائٹی کے تقاضے فرد کی ذات کے تقاضوں پر مقدم سمجھے جائیں گے۔ اس وجہ سے رانجھے کی پُوری کامیابی کے بعد بھی اس کا انجام المناک ہُوا۔ رنگ پور کے راجہ نے اپنے انصاف سے ہیر اور رانجھے کو شادی کی اِجازت دے دی۔ اور رانجھا برات بنانے کے لیے تخت ہزارے چلا گیا۔ مگر راجہ کے حُکم سے بھی بڑھ کر سماج کی اقدار کا حُکم تھا۔ جس کے سامنے ملک چوچک اور لنگڑے چاچے کیدو کو سر جُھکانا پڑا۔ اور جب چاچے کیدو نے اپنے ہاتھ سے ہیر کو زہر کا پیالہ دیا۔ تو دو افراد جن کو ایک ہی زندگی ملی تھی اپنی ہستی کی تکمیل کے بغیر مر گئے۔ مگر انسانی بہبود کے تحفظ کا دعویٰ کرنے والی اقدار زندہ رہیں۔

ادیب کی یہ کہانی ایک ممتاز ادبی رسالے میں شائع ہوئی تو ایڈیٹر نے مُبارکباد

کا پیغام بھیجا۔ اور کئی لوگوں نے اسے خطوط لکھے کہ اس نے ہیر اور رانجھے کو لازوال بنا دیا ہے۔ اِس قصے کو جس انداز میں اُس نے بیان کیا ہے۔ اس سے اُن کی مظلومیت پر ایک زمانہ ترس کھا رہا ہے۔ اور ان کی وفا زندہ جاوید ہو گئی ہے۔

چند روز بعد شام کے وقت ادیب گھر سے ٹہلنے نکلا۔ گھومتے گھومتے تھک گیا تو سڑک پہ ایک چھوٹے سے پُل کی منڈیر پہ بیٹھ گیا۔ وہاں سے اُسے ہیر کا مقبرہ نظر آیا۔ اور اس کا سینہ فخر سے تن گیا کہ اُس نے ملک کو ایک ادبی شاہکار دیا ہے۔ جو ادب پارہ ہونے کے ساتھ معاشرتی اصلاح کی کوشش بھی تھی۔ ادیب کو یقین تھا کہ اسے پڑھنے والی ہر آنکھ نمناک ہو گئی ہو گی۔ ہر دل سے ہمدردی کے بگولے اٹھیں گے۔ اور ہر دماغ میں اتنی عقل ضرور پیدا ہو جائے گی کہ وہ سچے پیار کے ناقابلِ تسخیر تقاضوں کو کھوکھلی اقدار کے نمائشی تازیانوں سے دبانے کی کوشش نہ کرے گا۔ اس نے فخر سے سوچا . . . . . کہ اگر ہر تحریر میں اتنی ہی جان ہو تو ہم ادیب لوگ دُنیا کو جنّت بنا سکتے ہیں۔ یہ سوچ کر اُس نے بڑے غرور سے مقبرے پر نگاہ ڈالی۔ اور اپنے مضمون کا مزہ لینے کے لیے ایک دفعہ پھر مقبرے کی طرف چل دیا۔

کھیتوں سے گزر کر وُہ اینٹوں کے بھٹے تک گیا۔ وہاں کچّی اینٹیں بڑی ترتیب سے ایک دُوسری پر پڑی تھیں۔ اور زمین سے اُکھاڑی ہوئی ناہموار مٹّی کو پھلانگتا ہوا جب وُہ پیلو کے درختوں والی چڑھائی چڑھ رہا تھا۔ تو ٹیلے کی دُوسری طرف سے اسے ایک عورت نظر آئی۔ جو اپنے آپ کو چادر میں چھپانے کی کوشش کرتی ہوئی تیزی سے مقبرے میں داخل ہو رہی تھی۔

ادیب لمحہ بھر ٹھٹکا۔ کئی سوال اس کے ذہن میں آتشبازی کے شراروں کی طرح پھوٹنے لگے۔ دیہاتی زندگی میں سب لوگ ایک دُوسرے کو جانتے ہیں۔ اور دُوسروں کی ذرا سی بھی غیر معمولی حرکت میں کُرید شروع کر دیتے ہیں۔ اِس لیے ادیب بھی اسی ماحول کا باشندہ ہونے کی وجہ سے لاشعوری طور پر سوچنے لگا کہ یہ کون ہے؟ اور

یہاں کیوں آئی ہے؟ پہلے وُہ مقبرے میں داخل ہونے لگا۔ پھر رُک گیا۔ دروازے کے قریب کھڑا ہو کر کان لگا کر اندر سے آواز سُننے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر وہاں مُکمّل خاموشی تھی۔ اِتنے میں اس کی نظر ایک درخت پر پڑی جو مقبرے کی دیوار کے ساتھ جُھکا ہُوا تھا۔ وُہ آہستہ سے اُدھر گیا۔ درخت پر چڑھا۔ پھلانگ کر مقبرے کی چھت پر گیا۔ اور گنبد کے کُھلے سوراخ میں سے بڑی احتیاط سے اندر کو جھانکنے لگا۔ وُہ عورت اندر موجود تھی۔ اور ہیر کی قبر کے کتبے سے لپٹی ہُوئی تھی۔ اس کی پیٹھ کی لرزش سے اندازہ ہوتا تھا کہ وُہ رو رہی ہے۔ اتنے میں بے تاب سسکیوں کی دبی گُھٹی آواز اُبھری۔ اور ہچکیوں کے ٹکڑوں میں وُہ عورت بولی:

"یا مائی ہیر! میرے رانجھے کی حفاظت کرنا .... وُہ ابھی تک نہیں پہنچا .... اس کو سلامتی سے یہاں پہنچانا ...." اور وُہ کتبے سے لپٹ کر رونے لگی۔

ادیب نے اُسے پہچاننے کی کوشش میں سر کے کئی زاویے بدلے۔ مگر ایک تو وہ عورت چادر میں لپٹی تھی۔ اور دُوسرے اس کا چہرہ بھی کتبے پر جُھکا تھا۔ اِس لیے وُہ اندازہ نہ کر سکا کہ یہ کون ہے؟

تھوڑی دیر بعد گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سُنائی دی۔ اور عورت نے چونک کر سر اُٹھایا۔ تب ادیب نے پہچانا کہ وُہ یونین کونسل کے چیرمین بابے گامے کی بہو تھی۔ جس کی چند ماہ پہلے شادی ہُوئی تھی اور ادیب حیرت سے بھونچکا رہ گیا۔

اِتنے میں بھرپور سا نوجوان مقبرے میں داخل ہُوا۔ اور عورت بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔ تب ادیب نے پہچانا کہ نوجوان ساتھ والے گاؤں کا چمار تھا ——— ادیب کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔

نوجوان نے عورت کا چہرہ اپنی طرف اٹھایا اور پُوچھنے لگا۔

"تُو تیار ہے نا؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور آنسو کا بڑا سا گھونٹ نگلتی ہوئی بولی: "جلدی نِکل چلو۔ نہیں تو کوئی آجائے گا۔"

لڑکا دھوتی کستے ہوئے اپنے بازوؤں کو غرور سے ہلانے لگا اور پھر اُس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے بولا:

"فکر نہ کر میری ہیرے۔ مولا بھلی کرے گا۔"

پھر وُہ دونوں لپک کر باہر نکلے اور گھوڑے پر بیٹھ کر یہ جا وُہ جا۔ یہ سب کچھ اِتنی جلدی میں ہُوا کہ ادیب بالکل مفلوج سا کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ ادیب نے گومگو کے عالم میں پھر مقبرے میں جھانکا۔

ہیر کی قبر پر سبز غلاف تھا ـــــ سرہانے کتبہ کھڑا تھا ـــــ سرسوں کے تیل کا دیا سیاہی میں ڈوبا تھا ـــــ اور مقبرے میں خاموشی تھی۔

ہیر مر چکی تھی ـــــ اُس کا سماج مر چکا تھا ـــــ مگر جو کچھ ادیب نے چند لمحے پہلے دیکھا تھا۔ وہ زندگی کا حِصّہ تھا ـــــ بابا گامو زندہ تھا ـــــ اس کا ماحول زندہ تھا ـــــ اور اس زندہ ماحول کی زندہ اقدار کا پروردہ ادیب زندگی کے سانس لے رہا تھا ـــــ اس کے ذہن میں بابے گامون کا باوقار چہرہ اُبھرا ـــــ سفید خشخشی داڑھی ـــــ ململ کی شفاف پگڑی ـــــ بالشت بھر اونچا اُٹھا ہُوا شملہ ـــــ ہر بات سے اِعتماد ٹپکتا ہُوا ـــــ

مگر اب؟؟؟؟

اس نے اُفق میں تحلیل ہوتے ہُوئے گرد کے غبار کی طرف دیکھا جس کے پیچھے بابے گامو کے گھر کا سارا وقار چار کے گھوڑے پر اُڑا جا رہا تھا ـــــ اب بابے گامو کی پگڑی کا شملہ بارش میں بھیگی ہوئی جھنڈی کی مانند ہو جائے گا۔ اس کی آواز کی کھنک ماند پڑ جائے گی۔ گاؤں کے معاملات میں اُس کی بات کی اہمیّت نہ رہے گی۔ اور اُس کی مخالف پارٹی کے لوگ اُس کی بہو کے نام سے ٹھٹھے اُڑائیں گے۔

بابے گامو پر ترس کھاتا ہوُا ادیب نیچے اُترا اور آہستہ آہستہ گاؤں کی طرف چلنے لگا۔
وہ سوچ رہا تھا کہ اِس خبر کی اِطلاع بابے گاموں کو کیسے دینی چاہیے۔ اِتنے میں اُس نے دیکھا کہ بابا گاموں چار پانچ آدمیوں کے ساتھ اُدھر ہی آ رہا تھا۔

ادیب سب کچھ بھُول کر بے اختیار اُن کی طرف بھاگا اور پکار کر کہنے لگا۔

"بابا۔ بابا۔ تیری بہو کو شیرا چمار بھگا کر لے گیا ہے۔۔۔۔۔"

بابا گاموں اور اُس کے ساتھی ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ مگر ادیب بازو ہلا ہلا کر چیختا گیا۔ "میں نے خود دیکھا ہے۔۔۔۔۔ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر اس طرف نِکل گئے ہیں۔ ۔۔۔۔۔ میں دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ ہیر کے مقبرے میں۔۔۔۔"

ادیب ایک دم سنّاٹے میں آ گیا۔ بابے گاموں کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا تھا اور وہ بُت بنا پھٹی پھٹی نظروں سے ادیب کو گھُور رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے ایک بھیانک خاموشی چاروں طرف چھا گئی۔

پھر بابا گاموں سر پیٹنے لگا۔ اُس کی پگڑی کھُل کر کندھوں پر لٹکنے لگی۔ اور وہ اپنے بال نوچنے لگا۔

"یا خُدا!! تُو نے بڑھاپے میں مجھے یہ دن بھی دکھانا تھا۔" وہ چلّایا اور سر پیٹنے لگا۔

اس کے ایک ساتھی نے ہاتھ پکڑ لیا اور بولا "بابا نصیبوں کو بعد میں پیٹ لینا۔ اب تو چار چھ جوان لے کر اُن کا پیچھا کرو۔"

"ہاں ہاں" ادیب چلّایا۔ "وقت ضائع نہ کرو۔ وہ ابھی زیادہ دُور نہیں گئے۔" اور پھر بابے گاموں کا ہاتھ پکڑ کر بولا "بابا فکر نہ کرو۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا۔ ذرا بھاگ کر گھر سے گھوڑی اور کلہاڑی لے آؤں۔ تم اپنے بیٹے کو بھی لے آؤ۔ اور سب لوگ چونگی کے پاس اکٹھے ہو جاؤ ——— میں بھی آتا ہُوں۔"

اور ادیب گھر کی طرف بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے اس کے جوتے میں کنکری گھس گئی جس سے اُسے تکلیف ہونے لگی۔ اتنے میں سامنے سڑک کا پُل نظر آیا۔ اور وہ اس کی

منڈیر پہ بیٹھ کر جوتا اتارنے لگا۔ یہ وُہی پُل تھا۔ جس پر تھوڑی دیر پہلے بیٹھ کہ وہ تحریر پر فخر کرتا رہا تھا۔

ادیب نے جُوتا اُتار کر جھاڑا۔ پھر پہنتے ہوئے اُٹھا۔ چلتے چلتے اُس کی نظر ہیر کے مقبرے پر پڑی تو ہیرا اور رانجھے کا نام لے کہ اُس نے موٹی سی گالی اُگل دی۔

(۱۹۶۲ء)

بھیڑئیے

لانچ نے ہلکا سا دھچکا کھایا۔ انجن کی آواز رُکی۔ رُک کر اُبھری۔ پھر رُکی۔ اور
چند لمحے بعد یکساں گھر رگھر رہونے لگی۔ لانچ کی رفتار بھی قدرے مدھم ہوئی اور پھر
ایک دھکّے کے ساتھ تیز ہو کر معمول کے مطابق ہو گئی۔ اختر نے کھڑکی کھول کر گردن
باہر نکالی۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے اور مہین پھوار نے ایک دم اس کے چہرے کو اپنی
لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بارش ختم ہو چکی تھی لیکن قطروں کے آوارہ بچّے اب بھی ہوا میں
بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ اور گھنے بادل دھوئیں کے مرغولوں کی طرح پیچ و تاب کھا
رہے تھے۔ نیچے دریائے کرنافلی اپنے چوڑے پاٹ کی چادر پھیلائے پُر سکون
انداز میں بہہ رہا تھا۔ کہیں کہیں ڈبکیاں کھاتے ہوئے کسی بانس کے دونوں سرے
باری باری سطح سے اُوپر جھانک رہے تھے۔ کناروں پہ پہاڑیاں سبز مخمل کی دیوار بنی

اُوپر اُٹھ رہی تھیں اور چوٹیوں پر سپاری کے درخت کنگھی کے دندانوں کی طرح بالکل سیدھے کھڑے تھے۔

اختر نے گھر دن اندر کرلی اور گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھول کر چپراسی نے اندر جھانکا۔

"وہ فائل لاؤ۔"

چپراسی نے سیٹ کے نیچے سے دراز کھولا۔ اور ایک فائل نکال کر اختر کو دی۔ اس نے فائل کھولی۔ سب سے اُوپر ایک تار پڑا ہُوا تھا "میری کوششیں ناکام ہوئیں۔" یہ تار بالوکھائی کے سرکل آفیسر نے بھیجا تھا۔ جو وہاں کے لوگوں کو علاقہ خالی کرنے کی ترغیب دے رہا تھا۔

آج ہی صُبح کرنافلی پروجیکٹ کے چیف انجنیئر نے اسے فون پر بتایا تھا کہ ۱۹۶۱ء کے وسط تک کرنافلی پروجیکٹ کا تعمیری کام ختم ہوجائے گا۔ اور ایک ماہ کے اندر اندر بند پر پانی روک کر بجلی پیدا کی جاسکے گی۔ اس وقت سے اختر کے ذہن میں بالوکھائی گھوم رہا تھا۔ اختر چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے کا ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر تھا۔ اور آج کل اس کے سپرد سب سے اہم کام یہ تھا کہ بند پر دریا کا پانی رُکنے سے بند کے پچھلے علاقے میں جو ایک سو گاؤں زیرِ آب آجائیں گے وہاں کے لوگوں کو نکال کر دُوسرے محفوظ علاقوں میں آباد کیا جائے۔ اِس سلسلے میں وہ دن رات کام کر رہا تھا۔ کیونکہ ایک تو چٹاگانگ کے پہاڑی قبائل کے جاہل لوگوں کو ترغیب دینا بڑا مُشکل کام تھا۔ اور دُوسرے راضی ہونے والوں کو حکومت کی طرف سے ان کے نقصان کی تلافی کے لیے روپیہ بھی مہیّا کرنا تھا۔ اختر کے آدمی گاؤں گاؤں پھیلے ہُوئے لوگوں کو جلد از جلد علاقہ خالی کرنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ اختر خُود بھی دَورے کر رہا تھا۔ عام طور پر لوگ تھوڑے اصرار کے بعد راضی ہوجاتے تھے لیکن بالوکھائی گاؤں اختر کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ وہاں کے لوگ گاؤں چھوڑنے پر

رضامند نہ تھے۔ اختر نے کئی کارندے بھیجے لیکن کوئی بھی ان کو ہموار نہ کر سکا۔ کل شام اختر کو جو تار کلب میں ملا تھا اس میں وہاں کے نئے سرکل آفیسر نے اپنی بیچارگی کا اظہار کیا تھا۔

گزشتہ رات کو جب اختر کپتائی میں کلب سے باہر نکلا تو کپتائی کا سارا علاقہ سرچ لائٹوں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ٹرک اور لاریاں اِدھر اُدھر تعمیر کا سامان لیے بھاگ رہی تھیں۔ فلک بوس کرین بڑے بڑے بوجھ تنکوں کی طرح اِدھر سے اُدھر اُٹھا کر پھینک رہے تھے۔ بند کے اُوپر ویلڈنگ کے نیلے اور سفید شرارے دُور دُور تک اُجالے پھینک رہے تھے۔ قوی ہیکل بلڈوزر ہاتھیوں کی طرح چنگھاڑتے ہوئے مہیب ٹیلوں کو زمین پر ہموار کر رہے تھے اور گہری خندقیں کھود رہے تھے۔ لوہے کے گارڈر اور سریئے کے ڈھیر، ٹائروں سے روندی ہوئی سڑکوں کے کنارے پھیلے ہوئے تھے۔ کرنافلی پروجیکٹ کو مکمل کرنے کے لیے چوبیس گھنٹے کام ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اختر کو خیال آیا کہ سرمائے سے یہ کام وقت پر ختم بھی ہو گیا اور اگر بند کے عقب میں گاؤں خالی نہ کرائے گئے۔ تو تکمیل کے باوجود بجلی پیدا نہ ہو سکے گی۔ اختر کے ذہن میں کوندا لپکا کہ اگر اُس نے عجلت سے کام نہ لیا تو وہ اپنے مُلک کا مجرم ہو گا۔ اسی وقت اُس نے اپنے پرسنل اسسٹنٹ سے کہا کہ وہ بذریعہ تار رانگامٹی میں سرکل آفیسر کو اِطلاع دے کہ وُہ کل بعد دوپہر بالو کھائی پہنچ رہا ہے۔

اختر نے لائٹر جلا کر سگریٹ سلگایا۔ اور فائل میں کھو گیا۔ کاغذات اُلٹ پلٹ کر اُس نے بار بار پڑھے۔ ڈائری نکال کر وُہ نوٹ پڑھے جو وقتاً فوقتاً وہ بالو کھائی کے بارے میں لکھتا رہا تھا۔ اُسے ابھی تک گاؤں والوں کی ہٹ دھرمی کی صحیح وجہ معلوم نہ ہو سکی تھی۔ کارندوں کی رپورٹیں کچھ واضح نہ تھیں مختلف اوقات میں مختلف قسم کے بہانے پیش کیے گئے تھے۔ اختر نے ایش ٹرے قریب کھسکا لی۔ پنکھے کا مُنہ اپنی طرف موڑ کر گدیلے پر نیم دراز ہو گیا۔ اور لانچ کے انجن کے شور میں گم ہو کر سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس کا اردلی چائے بنا کر لایا۔ اختر نے ایک بسکٹ پرچ میں رکھا اور پیالی ہاتھ میں لیے دروازہ کھول کر باہر لانچ کے کھلے حصّے میں آ کھڑا ہوا اور گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ موضع بالو کھائی بھول کے اِرد گرد کے سہانے نظارے میں گم ہو گیا۔

کشتی کے دونوں طرف کرنافلی کی چوڑی سطح ایک ہموار صحرا کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ چوڑائی کچھ دُور جا کر لمبائی میں بدل جاتی۔ پھر گھٹتے گھٹتے اُفق پر کناروں کے سمٹتے ہوئے خطوط میں غائب ہو جاتی۔ سطح پُرسکون تھی۔ سوائے ان لہروں کے جو لانچ کی چونچ کے دونوں طرف گنبد کی شکل میں اُبھر کر نیچے گرتیں۔ اور جھاگ پیدا کرنے کے بعد لہراتے ہوئے سانپ کی طرح کناروں کی طرف بھاگنے لگتیں اور گھنے سبزے تک پہنچ جاتیں۔ کناروں پر جا بجا پانی پچھوڑے کے انداز میں سبز گھاس، لمبی جھاڑیاں اور درختوں کی سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں جو آہستہ آہستہ اُبھر کر پُوری پہاڑی بنا دیتیں۔ گھنے درختوں کی شاخیں آپس میں اُلجھ رہی تھیں۔ کہیں کہیں شیرسٹی کے درخت سبزے کے درمیان لال انگارے کی طرح دہک رہے تھے۔ درختوں کے کندھوں کے درمیان کوئی پگڈنڈی جھانکتی اور ایک دھبّہ اس پر حرکت کرتا دکھائی دیتا۔ کہیں کنارے پر درختوں کا دروازہ سا بن جاتا اور اس میں سے کوئی پگڈنڈی ڈھلان سے پھسلتی ہوئی باہر نکلتی، اس کے دامن میں سیڑھی پر کوئی چکمہ عورت نہا رہی ہوتی یا برتن دھو رہی ہوتی۔ چکمہ قبیلے کی عورتیں صرف ایک دھوتی پہنتی ہیں اور اُوپر کا دھڑ ننگا ہوتا ہے۔ اس لیے لانچ کی آواز سُن کر وہ بیٹھ موڑ کر کھڑی ہو جاتیں۔ اختر اس وسیع منظر میں کھویا رہا جس میں چٹاگانگ کے اُونچے اُونچے پہاڑ کرنافلی کے پھیلے ہوئے چمکیلے پانی کو جُھک کر دیکھ رہے تھے اور آسمان پر بادلوں کا گھمبیر جھمگھٹا ایک پُر فضا پس منظر بنا رہا تھا۔ ہر طرف بکھرا ہوا سہانا سبزہ آنکھوں کو ابدی سکون دے رہا تھا۔ دُور کے پہاڑوں پر بارش ہو رہی تھی اور وہاں زمین سے آسمان تک ایک دُھند نے پُورے

منظر کے مٹے مٹے نقوش کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ کہیں کہیں اس کی لانچ لمبی لمبی ڈھکی ہوئی کشتیوں کے پاس سے گزرتی جن کو چلانے کے لیے ملاح لمبے بانس پانی میں دبا کر کشتی کی چھت پر ایک سرے سے دوسرے تک چلے جاتے، اس منظر کو دیکھ کر اختر ایک انجانا اعتماد محسوس کرنے لگا۔ کہ وہ بالو کھائی کے مسئلے کو حل کر کے ہی آئے گا۔

موضع بالو کھائی میں ایک ٹیلے پر پٹ سن کی دریاں بچھی تھیں۔ جس پر بید کی ایک کرسی پر اختر بیٹھا تھا۔ سامنے بانس کی میز پر ایک گلاس میں ناریل کا شیریں رس رکھا تھا۔ ٹیلے سے نیچے ڈھلان پر چکمہ قبیلے کے چالیس پچاس مرد کھڑے تھے۔ نیکریں پہنے ہوئے۔ پاؤں سے ننگے، قمیصوں کے بغیر منگول نقوش کے جاپانیوں جیسے گول گول چکنے ہوتے چہرے۔ اور بنگال کے دوسرے باشندوں کے برعکس گوری رنگت۔ کچھ پرے درختوں کے جھنڈ میں عورتیں سمٹی کھڑی تھیں۔ گول چپٹے سفید چہرے۔ کنواریاں بلاؤز اور دھوتی میں۔ شادی شدہ جوان عورتیں بغیر بلاؤز کے اور صرف ساڑھی کے پلو سے سینہ ڈھانپے ہوئے اور وسط عمر کی عورتیں صرف ایک دھوتی میں۔ ان کے ساتھ بچوں کا ہجوم تھا۔ سب لوگ خاموشی سے اختر کی طرف دیکھ رہے تھے جو انگلیوں میں سگریٹ دبائے فائل دیکھ رہا تھا۔ سرکل آفیسر اُس کے ساتھ کھڑا تھا۔ اور پیچھے تین سپاہی کمر بستہ تھے۔

اختر کی عمر چونتیس برس ہو گی۔ لیکن وہ ان لوگوں سے برتنا خوب جانتا تھا۔ اس نے ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ جس میں کرنافلی کے مجوزہ بجلی گھر کے فوائد بیان کیے۔ اُن کو متبادل اراضی اور اس سے متعلقہ سہولتیں دینے کے اصول بتائے اور کہا کہ اگر ان کو کوئی اعتراض ہے تو بتائیں۔

لوگوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ اختر متوقع نظروں ان کو دیکھتا رہا۔ بالآخر

تھوڑی دیر بعد ایک شخص کھڑا ہوا۔ اُس نے جھک کر پرنام کیا۔ ٹیکہ درست کی۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا:

"حضور میدانی لوگوں نے پہلے ہم پہاڑیوں سے ساری تجارت چھین لی ہے اور اب وُہ زمینیں بھی چھیننا چاہتے ہیں۔" آخری الفاظ کے ساتھ ہی فوراً بیٹھ گیا جیسے سپاہی دستی بم پھینک کر دُبک جائے۔

چٹاگانگ میں پہاڑی اور میدانی لوگوں کی شکر رنجی سے اختر خُوب واقف تھا۔ اِس لیے اُس نے نرمی سے ان کو سمجھایا کہ یہ زمینیں میدانی لوگ نہیں لے رہے بلکہ حکومت لے رہی ہے اور اس کے بَدلے میں ان کو اس سے بہتر زمین اور نقد معاوضہ مِلے گا۔

لوگ خاموش رہے۔

اختر نے ایک دفعہ پھر بات کو دُہرایا اور اِعتراضات پُوچھے۔

چند منٹ خاموشی کے بعد ایک بُوڑھا چکمہ کھڑا ہوا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولا "عالی جاہ خُدا آپ کی حکومت ہمارے سروں پر قائم رکھے لیکن ہم حکومت سے اپنی حفاظت مانگتے ہیں۔ ہم قبائلی لوگ ہیں۔ ہماری زندگی ہمارے قبیلے میں ہوتی ہے۔ آپ ہمیں مانگ اور لوہانگ قبیلوں میں بکھیر دیں گے۔ جہاں ہم ان کے غلام بن جائیں گے۔ ہم اِس تجویز کو کیسے قبول کر لیں؟"

اختر اس اعتراض کے لیے تیار تھا۔ اس نے فوراً ان کو یقین دلایا کہ اگر وہ لوگ چاہیں تو ان کو ایک ہی جگہ اکٹھی زمین دی جائے گی۔ اس موضوع پر اس نے اچھی خاصی لمبی سی تقریر کر ڈالی اور پُوچھا۔

"کیا اب آپ لوگ بالکل راضی ہیں؟" وہ جانتا تھا کہ موجودہ صُورت میں اُن کو نرمی سے سمجھانا سُود مند تھا۔

مجمع خاموش بیٹھا رہا۔

"اب آپ کو کیا اعتراض ہے؟" چند لمحے بعد اُس نے پھر پُوچھا۔
مکمّل خاموشی طاری رہی۔
"کاشی مل! بولتے کیوں نہیں؟" اُس نے چوہدری کو ڈانٹا۔
"حضور ہم غریب لوگ ہیں۔ پیسہ......."
"روپیہ تم کو حکومت دے گی۔ اور کوئی اعتراض؟" اختر بے صبری سے بولا۔ اب اس کی آواز میں سختی تھی۔
لوگ چُپ تھے۔
سرکل آفیسر اختر سے کہنے لگا۔ "حضور یہ اعتراضات تو معمولی ہیں۔ ان کا حل ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑا اعتراض وُہ ہے جس کا بظاہر کوئی حل نظر نہیں آتا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں ایک عورت ہے۔ جو اس جگہ کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔ اور یہ سب اس کی وجہ سے یہاں سے نہیں ہلتے۔"
"عورت؟" اختر حیران رہ گیا۔ "اِس قسم کے معاملے میں عورت کا کیا کام ہے؟"
"جی یہ سب کام ہی اس کا ہے۔ اِس گاؤں کے لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ اگر وہ عورت ان کے ساتھ نہ رہے گی تو ان پر آفت آجائے گی۔ اگر آپ اس عورت کو گاؤں چھوڑنے پر راضی کر لیں تو باقی اعتراضات رفع کرنے میں کوئی مشکل نہ ہوگی۔"
"لیکن کیسے ہو سکتا ہے؟ اور اگر ہے تو مانتے کیوں نہیں؟"
"جناب یہ اِس لیے نہیں مانتے کہ وہم صرف اسی گاؤں والوں کو ہے۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ آپ پڑھے لکھے لوگ ان کا مذاق اُڑائیں گے۔ ویسے تو ان میں سے بھی کئی لوگ یہ جگہ چھوڑنے پر راضی ہیں۔ لیکن اس عورت کے بغیر کوئی نہ ہلے گا۔"
اختر نے سگریٹ سلگایا اور کرسی کی ٹیک پر سر ٹکا کر کش لگانے لگا۔ دھوئیں کے مرغولوں میں سے وُہ اِرد گرد اُگے ہُوئے درختوں کی چوٹیوں کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔ کیونکہ اِس قسم کے معاملوں میں اگر احتیاط نہ برتی جائے تو قبائلی بے ڈھب ہو

جاتے ہیں اور کوئی فتنہ فساد کھڑا کر دیتے ہیں۔ چند منٹ مکمّل سنّاٹا طاری رہا۔ کسی کسی وقت کوئی پرندہ درخت پر بولنے لگتا یا دریا سے ملّاحوں کے پکارنے کی آواز آ جاتی یا ہوا کے دوش پر دُور سے ان چکمہ لوگوں کے گانے کی آواز آ جاتی جو شمشان میں مُردہ جلا رہے تھے۔

"اس عورت کو بلاؤ۔"

"بنورانی پیش کی جائے۔" اردلی پکارا۔

چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے کا چپّہ چپّہ سبز ہے۔ اینٹ پتھر تک سے کونپلیں پُھوٹتی ہیں۔ نیچے گُھٹنی ہُوئی ہری ہری گھاس۔ اُوپر ڈھلان کے ساتھ ساتھ اُٹھتے ہُوئے درختوں کا ہجوم۔ اس سبز پس منظر کے سامنے بنورانی کھڑی تھیں۔ ہری گھاس میں اس کے ننگے سفید پاؤں دھنس رہے تھے۔ چکمہ قبیلے کی مخصوص نیلی ساڑھی اس کی کمر کے گرد تھی۔ اور سُرخ بارڈر اس کے سینے کو ڈھانپ رہا تھا۔ اپنے ننگے کندھے جُھکا کر اس نے اختر کو پرنام کیا۔ اشارے سے اس کے پاؤں چھوئے۔ اور ایک طرف گردن ڈھلکا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی عمر کوئی چالیس برس کی ہو گی اور رنگ کھلتا ہُوا سفید تھا۔ اختر نے پُوچھا "بنورانی ہمیں پتہ چلا ہے کہ تمہیں یہ گاؤں چھوڑنے سے انکار ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟"

وُہ سر جھکائے کھڑی رہی اور اس کے دونوں ہاتھ جو پرنام کی صُورت میں پیٹ کے سامنے بندھے تھے۔ آہستہ آہستہ کانپنے لگے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

تھوڑے توقف کے بعد اختر نے سوال پھر دُہرایا لیکن وہ خاموش تھی۔

اب سرکل آفیسر نے پُوچھا لیکن وُہ چُپ رہی۔

اختر ایسے آفیسروں میں سے تھا جو سختی کرنے سے پہلے نرمی کا پُورا استعمال کرتے ہیں۔ اِس لیے اُس نے اُسے تحمّل سے سمجھایا کہ اگر اُس کے لیے کوئی مُشکل ہے تو حکومت اُس کی مدد کرے گی۔ اور جب تک وُہ اپنی مُشکل بیان نہ کرے گی۔ وُہ کیسے

اس کی مدد کر سکے گا۔

جھکے ہوئے مُنہ سے ہلکی سی آواز میں بنو رانی نے کوئی فقرہ کہا۔

"اُونچے بولو!" سرکل آفیسر نے ڈانٹا۔

وُہ خاموش رہی۔ اور ساتھ کھڑے ہوئے چوہدری نے بتایا کہ وہ کہتی ہے میں اپنے خاوند کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔

"تمھارا خاوند کیوں نہیں جاتا؟" اختر نے پُوچھا۔

وُہ چُپ تھی۔

"کیا وُہ تم سے ناراض ہے؟"

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر اُسے ساتھ کیوں نہیں لے جاتیں؟"

"اِن لوگوں نے اُسے اِس قابل نہیں چھوڑا کہ میں اُسے ساتھ لے جا سکوں۔" اس کے جھکے ہوئے سر سے آواز آئی۔ اس کے ہاتھ اب شِدّت سے کانپ رہے تھے اور پاؤں کی گرفت زمین پر مضبُوط ہوتی جا رہی تھی۔

"یہ کیا قِصّہ ہے؟" اختر نے وقت ضائع کرنے کی بجائے چوہدری سے پُوچھا۔

"حضور اس کا خاوند مر چکا ہے؟" چوہدری بولا۔

"مر چکا ہے!" اختر سخت حیران ہُوا۔ "مر چکا ہے تو ساتھ کیسے جاتے؟"

چوہدری لاتعلّق سا کھڑا ہو گیا۔ گویا اس جواب کی ذمّہ داری نہیں لینا چاہتا۔

"کہاں مرا تھا؟" اختر نے بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔

"جی اسی گاؤں میں۔" چوہدری بولا۔

اختر کچھ کچھ سمجھنے لگا۔ "کیا یہ عورت پاگل ہے؟" اس نے پُوچھا۔

اُس کے اس فقرے نے بجلی کا سا اثر پیدا کیا۔ بنو رانی تڑپ کر چونکی اور ہاتھ چھوڑ

کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ آہستہ سے ایک بازو پھیلا کر اُس نے چوہدری کو پرے ہٹایا اور ایک قدم آگے بڑھا کر بولی "حضور میں پاگل نہیں ہوں۔ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ میں پوری طرح سمجھتی ہوں۔ میں ان ہی لوگوں کی طرح کھاتی ہوں، پیتی ہوں، سوتی ہوں، ان کی باتوں پر ہنس سکتی ہوں، اپنی تقدیر پر رو سکتی ہوں۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ اِن لوگوں کے لیے دُنیا میں اور دِل چسپیاں بھی ہیں لیکن میرے لیے کوئی نہیں۔" ہر فقرے کے ساتھ بنو رانی کی جھجک غائب اور آواز بلند ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے کی خفیف جُھریاں مچل رہی تھیں۔ "یہ لوگ جانا چاہیں تو شوق سے جائیں۔ میں تو صِرف یہ چاہتی ہوں کہ مجھے یہاں سے نہ ہلایا جائے۔ میں اکیلی رہ سکتی ہوں میری ساری زندگی مصیبتوں میں گزری ہے۔ جو تھوڑے دن باقی ہیں۔ ان میں آرام ڈھونڈ کر کیا لوں گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اختر اب ساری بات سمجھ چکا تھا۔ اور ایک عملی تنظیم کی طرح فیصلہ کر چکا تھا۔ نرمی اور سختی کی ملاوٹ کا وُہ ہمیشہ قائل تھا۔

"بنو رانی کے جانے کی صُورت میں کتنے آدمی یہاں سے جانے پر تیار ہیں؟"

مجمع میں کئی ہاتھ اُٹھ گئے۔ اختر نے کانشی مل کی طرف دیکھا اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن میں نہیں جاؤں گی۔" بنو رانی بے اِختیار چلّائی۔ اختر نے اشارے سے روکتے ہُوئے کلرک کو بلایا اور سخت لہجے میں بآوازِ بلند کہنے لگا تا کہ سب لوگ سُن لیں "کل صُبح تک بنو رانی کے مکان وغیرہ کے معاوضے کے کاغذات تیار کر دو۔ اگر یہ معاوضہ لینے کو تیار ہو جائے تو اس کے دستخط کر والو۔ اگر نہ ہو تو فارم میں یہ درج کر کے آرڈر لکھ دو کہ بنو رانی کو بذریعہ پولیس یہاں سے نکالا جائے۔ کل شام تک یہ کاغذات بہر حال میرے دستخطوں کے لیے پیش کر دو۔ ہم اِتنی معمُولی سی بات کے لیے سارا کام نہیں روک سکتے۔" یہ کہتے ہُوئے اختر چل دیا۔

سناٹا چھا گیا۔ مجمع دم بخود تھا۔ بنو رانی بالکل پتھر کا بُت بن گئی۔ چاروں طرف

مکمل سکوت، جیسے وقت کی رفتار رک گئی ہو۔ سارے ساکن ماحول میں ہلنے والی شے فقط اختر تھا۔ جو دو تین بے آواز قدم اُٹھا چکا تھا۔ یک لخت ایک چیخ اس سناٹے کو چیر گئی اور اگلے لمحہ نورانی دوڑ کر اختر کے قدموں سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس کی بے باکی عاجزی میں بدل گئی۔

"حضور یہ آپ کے لیے معمولی بات ہے۔ میرے لیے نہیں۔ میری تو زندگی ہی اس جگہ میں ہے۔ آپ حاکم ہیں۔ جو چاہے کریں مجھے پھانسی دے دیں، دریا میں ڈبو دیں لیکن خدارا یہاں سے نہ نکالیں۔"

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ اختر ٹھٹک سا گیا۔ اس نے پاؤں پیچھے ہٹائے لیکن نورانی اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ اردلی نے بڑھ کر اُسے علیحدہ کیا۔ لیکن وہ اس کے بازوؤں میں ایسے ہمک رہی تھی۔ جیسے دودھ پیتے بچھڑے کو تھن سے بزور الگ کیا جائے۔ اور وہ ادھر کو لپکے، اردلی کے مضبوط ہاتھوں سے جب رہائی نہ ملی تو اُس نے تڑپتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے "سرکار ایک دفعہ آپ میرے ساتھ چلیے۔ میں آپ کو دکھاؤں کہ یہ معمولی بات نہیں۔ پرماتما کے لیے چند منٹ کے لیے میرے ساتھ آئیے۔ صرف ایک بار۔"

وہ کلبلا رہی تھی۔ ہاتھ جوڑتی، زمین پر سر رکھتی، آسمان کی طرف بازو اُٹھا کر بدھا کا واسطہ دیتی۔ مجمع قدرے بکھر چکا تھا۔ اور لوگ اِدھر اُدھر دم بخود کھڑے اس ڈرامے کو ایسے دیکھ رہے تھے۔ جیسے ان کی اپنی قسمتوں کا فیصلہ ہو رہا ہے۔ اختر کا سر گھوم رہا تھا۔ ضلع کے انتظام میں اس کو اکثر ایسے مواقع پیش آتے تھے۔ جب آنسوؤں کی بارش میں اُس نے رونے والوں کے خلاف حکم نافذ کیے تھے۔ کیونکہ اکثر اوقات وہ آنسو جھوٹے ہوتے تھے لیکن نورانی کا رونا، تڑپنا اور کلبلانا کچھ ایسا والہانہ تھا کہ اختر پسیجے بغیر نہ رہ سکا۔ ویسے بھی وہ یہاں مقامی تفتیش کے لیے آیا تھا۔ اِس لیے معاملے کے ہر پہلو سے واقف ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔

اختر سرکل آفیسر اور چودھری کاشی مل کے ساتھ چل رہا تھا۔ کچھ پیچھے فاصلے پر باقی لوگ تھے۔ وہ بھاگی بھاگی آگے نکل جاتی۔ کچھ دُور جاکر رُکتی۔ پھر بے صبری سے پیچھے اُن کی طرف آتی۔ قریب آکر پھر آگے کو بھاگتی اور کچھ دُور جاکر پھر واپس آجاتی۔ ٹیلے سے اُتر کر یہ لوگ ایک چھوٹی سی کچی سڑک پر ہو لیے جس پر گھنے درخت اُوپر سے سر ملا کر ایک چھت بنا رہے تھے۔ پکّی سڑک موڑ مڑ کر قدِ آدم ٹیلوں کے بیچ وادی سی میں غوطہ لگا جاتی۔ اور تھوڑی چڑھائی کے بعد بانسوں کی ایک باڑ کے ساتھ موڑ مڑتی۔ وہاں سے ایک پگڈنڈی پہاڑی پر پکّی سیڑھیوں سے جا ملتی۔ قریباً چالیس سیڑھیاں چڑھنے کے بعد چکمہ طرز کا بانسوں کی چٹائی کا مکان تھا۔ جو دریا کے کنارے واقع تھا۔ بڑی تنگ ڈیوڑھی میں داخل ہو کر یہ لوگ ایک بند دروازے کے سامنے پہنچے۔ کھولنے کی بجائے بنو رانی نے کندھے سے ایک دو دھکے بڑی زور سے دیے۔ بانسوں کی تاب ہی کیا تھی۔ دروازے کے پٹ ٹوٹ کر اندر جا پڑے۔ بنو رانی اندر گھس گئی۔ پیچھے اختر سرکل آفیسر چودھری اور گاؤں کے دو تین آدمی تھے۔ کمرہ خالی تھا۔ تاریکی میں انھوں نے دیکھا کہ اس میں ایک قبر ہے۔ جس پر تازہ پھول بکھرے ہوئے تھے۔

بنو رانی بے تابی سے قبر کے گرد گھومنے لگی۔ "دیکھیے حضور دیکھیے۔ میری ساری دولت یہ قبر ہے۔ یہ بتائیے میں اس کو کیسے یہاں سے لے جاؤں۔ آپ اسے معمولی بات کہتے ہیں لیکن میری تو دُنیا ہی یہی ہے آپ زمینوں کا معاوضہ دے دیں گے لیکن اس مٹی کے ڈھیر کا، اس کے اندر کی ہڈیوں کا میرے خاوند کی لاش کا معاوضہ مجھے کون دے سکتا ہے؟ مجھے معاوضہ نہیں چاہیے حضور۔ مجھے صرف یہاں رہنے دیں۔ سارے گاؤں کو لے جائیں۔ اگر یہاں پانی آجائے گا تو میں بانسوں کی اُونچی مچان بنا لوں گی اور اس پر رہوں گی۔ خدا کے لیے مجھ پر ترس کھائیے۔ ......"

چودھری اور دُوسرے چکمہ لوگ رام رام پکارنے لگے۔ گھبراہٹ سے ان کے چہرے پیلے پڑ گئے۔ کانپتی ہوئی اُنگلی سے قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چودھری بولا "تم نے

...... سرسبندرا کو ...... یہ یہاں دبایا تھا؟"

"ہاں!" بنو رانی باغیانہ انداز میں اس کی طرف پلٹی۔ "زندگی میں اُسے مجھ سے چھین کر تمھاری پیاس نہ بجھی تھی۔ جو تم لاش کو بھی جلانا چاہتے تھے۔ میں نے تم سب لوگوں سے چھپ کر اُسے یہاں دفن کیا تھا اور گزشتہ بیس برس سے وہ میرے پاس ہے۔" وہ غرور سے جاکر قبر پر بیٹھ گئی۔ جیسے اپنا پورا حق جتا رہی ہو۔

چکمہ لوگ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ دُعائیں پڑھنے لگے۔ پھر اُن میں سے ایک بھاگا ہوا باہر آیا۔ اور باقی لوگوں سے چلا کر کہا "سر بندرا کو یہاں دفن کیا ہوا ہے۔" لوگوں میں ایک دم شور مچ گیا۔ اور پھر ان کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اختر نے فوراً سپاہی کو آواز دی کہ ان لوگوں کو قابو میں رکھے۔

چند لمحے بعد بنو رانی کو جیسے اچانک احساس ہوا کہ یہ قبر اُس سے چھین جانے والی ہے۔ وہ ایک دم دوڑ کر اُٹھی اور اختر کے پاؤں پر گر پڑی۔ وہ بار بار وہی الفاظ دُہرا رہی تھی۔ اس کے پاؤں پر سر رکھتی۔ اس کے گھٹنے چومتی اور پھر قبر کے گرد چکر لگانے لگتی۔ تھوڑی دیر بعد سرکل آفیسر بنو رانی کے قریب گیا۔ اور اس کا بازو پکڑ کر کہنے لگا "بہن صبر سے کام لو۔ حوصلہ کرو۔ قانون ایک کا خیال نہیں رکھ سکتا۔ اُسے تو سب کا فائدہ دیکھ کر فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔"

بنو رانی بلک بلک کر رو پڑی۔ اختر کی طرف ہاتھ پھیلا کر بولی "تمھارا قانون مجھے کتنی دفعہ تباہ کرے گا؟ پہلے بھی میرا خاوند تمھارے قانون نے مجھ سے چھینا تھا۔ اور اب جو میں نے اس قبر کو اپنا خاوند بنایا۔ تو پھر تمھارا قانون اُسے مجھ سے چھین رہا ہے۔ تمھارا قانون سہاگنوں کو بیوہ بناتا ہے یا کبھی ان کی مانگ بھی بھرتا ہے۔ میں اس قانون کو کیا کروں جسے ہر دفعہ اپنی طاقت آزمانے کے لیے میرے آنسوؤں کی ضرورت ہے۔ خُدا کے لیے اِس بے رحم قانون کو ترس کھانا بھی سکھائیے۔ حضور میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں...." وہ بچھو کاٹے مریض کی طرح تڑپ رہی تھی۔

اختر کو یقین ہو گیا کہ یہ عورت پاگل یا نیم پاگل ہے اور اس کی باتوں پر مزید دھیان دینا غلطی ہوگی۔ وہ چودھری سے کہنے لگا " بنورانی کو سمجھاؤ کہ وہ صبر کرے اور جو حکم میں نے دیا ہے اس پر عمل ہوگا۔"

بنورانی نے ایک دم چپ ہو کر اختر کی یہ بات سُنی اور پھر چیخ مار کر قبر پر اوندھے مُنہ گر پڑی۔ بازو پھیلا کر اس نے قبر کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔ اُس کی ننگی پیٹھ سسکیوں سے کانپ رہی تھی۔ اختر خاموشی سے واپس مُڑا۔ جب وہ باہر نکلا تو لوگ مکان سے دُور ہٹ کر ایسی پھٹی پھٹی نظروں سے اُس طرف دیکھ رہے تھے۔ جیسے آتش فشاں پہاڑ پھٹنے کو ہے۔ اختر آہستہ آہستہ کرسی والے مقام کی طرف چلا۔ پیچھے سے بنورانی کی دِل دوز سسکیاں رہ رہ کر فضا میں اُبھر رہی تھیں اور ہوا کے دوش پر بکھر کر پہاڑوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

چٹاگانگ کی بارش کا کوئی اعتبار نہیں۔ ابھی ہے اور ابھی نہیں۔ آسمان کے کسی کونے سے بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا لپکتا آئے گا۔ چند منٹ فضا میں جھومے گا۔ اور پھر یک لخت زوردار بارش کی شکل میں ٹپک پڑے گا۔ پھر جیسے اپنی جلد بازی پر جھینپ کر اچانک ہی رک جائے گا۔ اکثر اوقات بادل آسمان پر چھائے رہتے ہیں۔ اور اپنی موجودگی کی یاد دہانی کے لیے وقتاً فوقتاً چھینٹے مارتے رہتے ہیں۔ اختر ابھی کرسی تک پہنچا نہیں تھا کہ ایک دم درختوں کے پتّے ٹپاٹپ کے راگ الاپنے لگے۔ چٹاگانگ میں ہر شخص کے پاس ہر وقت چھتری ہوتی ہے۔ ایک نے اختر پر سایہ کیا اور وہ سامنے چودھری کے مکان میں چلے گئے۔

اختر کا پروگرام اب واپس کپتائی جانے کا تھا۔ لیکن بارش تیز ہوتی گئی۔ شام کا اندھیرا بادلوں کی وجہ سے وقت سے پہلے آبادی پر اُتر آیا۔ اِس بھیگے بھیگے جھٹپٹے میں ٹیلوں کی مختلف بلندیوں پر مکانوں میں چراغ ٹمٹمانے لگے۔ جیسے اِدھر اُدھر جگنو اُڑ رہے

ہوں۔ اتنے میں لانچ کے ڈرائیور نے آکر اطلاع دی کہ انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے گزشتہ ایک گھنٹہ سے ٹھیک نہیں ہو سکی۔ اس لیے سفر صبح تک ملتوی کرنا ہو گا۔ موضع بالوکھائی میں کوئی ریسٹ ہاؤس نہ ہونے کی وجہ سے اختر قیام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس بارش میں رات کے وقت کسی دوسری کشتی پر جانا بھی خطرناک تھا۔ چنانچہ اس نے لانچ میں ہی رات بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ دو سپاہیوں کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ وہ پہرہ دیں۔

کھانے کے بعد اختر صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ چوہدری کا بوڑھا ملازم اس کے پاؤں دبا رہا تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر چوہدری بیٹھا تھا اور قبائلی مقدموں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ایک دم اختر نے پوچھا۔

"کاشی مل۔ یہ بنورانی کا قصہ کیا ہے؟"

"بہت پرانا قصہ ہے حضور۔ اس کی تو ساری زندگی اسی قصے میں گزری ہے۔ اس بوڑھے ملازم نے بنورانی کو ہاتھوں میں کھلایا ہے۔ یہ آپ کو بہتر بتا سکے گا۔ ...

... رامو خان! صاحب کو بنورانی کا قصہ سناؤ۔"

راموں چند لمحے خاموش رہا۔ پھر ایک لمبی سانس لے کر کہنے لگا "حضور کیا بتاؤں اس کے بارے میں۔ بے چاری کا ستارہ ہی برا تھا۔ وہ گاؤں کے لیے دیوی بننا چاہتی تھی۔ گاؤں نے اس کو چڑیل بنا دیا۔ اس کے اچھے دن بھی نہیں گزرے۔ برے بھی نہیں۔ اچھے دنوں میں وہ میرے ساتھ کھیلی۔ برے دنوں میں میں اس کے ساتھ رویا۔ آپ کو کیا بتاؤں۔ میں نے اس کی عمر کے چالیس سال اپنے سامنے دیکھے ہیں۔"

اختر کچھ تو شام والے منظر سے متاثر تھا۔ اور کچھ بوڑھے کی باتوں نے اشتیاق پیدا کیا۔ چنانچہ بولا:

"رامو خان پاؤں چھوڑ دو۔ اور ایک طرف بیٹھ کر اس کی کہانی سناؤ۔ شروع سے اخیر تک۔"

بوڑھوں کا ماضی ایک سمندر ہوتا ہے جس کا دُوسرا کنارہ انھیں کبھی نہیں ملتا۔ ان کے لیے یہ ہمیشہ مُشکل ہوتا ہے کہ وُہ اپنے ذہن سے ماضی کا کوئی ایک آدھ ورق نکال سکیں اِس لیے کوئی قِصّہ سُنانے سے پہلے انھیں مناسب آغاز نہیں ملتا۔ رامو خان بھی ہولے ہولے زمین پر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا۔ اختر نے سگریٹ سُلگایا اور کروٹ بدل کر رامو کی طرف مُنہ کر کے لیٹ گیا۔ چند منٹ کے توقف کے بعد وُہ بولا:

"حضوُر جب میں اس گاؤں میں آیا تو بنورانی کی عمر کوئی چھ برس کی ہوگی۔ اور سرنیدرا کوئی آٹھ برس کا۔ میں بنورانی کے باپ کا برکہ دار تھا۔ اور اُسے فصل میں سے آٹھ آنے حِصّہ دیتا تھا۔ ان کے مکان کے ساتھ ہی میرا مکان تھا۔ یہ دونوں بچّے مُجھ سے گھُل مِل گئے۔ میری ابھی شادی نہ ہوئی تھی۔ اِس لیے میں ان کی موجُودگی میں خُوش رہتا۔ رات کو یہ اکثر میرے پاس آتے، کہانیاں سُنتے، میرے کندھوں پر سواری کرتے۔ صحن میں بارش کے پانی میں بانس کی کشتیاں تیراتے۔ میں کھیت پر جاتا تو وہاں پہنچ کر کھیلتے رہتے میں دھان کی پنیری لگاتا تو یہ مُجھے پودے اُٹھا اُٹھا کر دیتے اور ٹیلوں کی اوٹ میں آنکھ مچولی کھیلتے۔

"ان کا آپس میں بڑا پیار تھا۔ لیکن اکثر لڑتے بھی تھے۔ لڑائی ہمیشہ ایک ہی بات پر ہوتی۔ سرنیدرا کے پاس چاقو تھا۔ جس سے وُہ درختوں کی شاخیں کاٹ کر پھینک دیتا۔ بانس کے ننّھے ننّھے پودے کاٹ ڈالتا۔ اور پھُولوں کو چاقو کے وار سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔ بنورانی کبھی روتی ہوئی میرے پاس آتی کہ سرنیدرا نے مُنّنے سے درخت کو توڑ ڈالا اور بڑھنے نہیں دیا۔ اور کبھی اُسے خُود سمجھاتی کہ دیکھ سرنیدرا، یہ شاخ جو تو نے مار دی ہے، بڑی ہوتی تو کوئی اس کا پھل کھاتا۔ اور جب سرنیدرا اُسے چڑانے کے لیے کوئی اور شاخ توڑ ڈالتا۔ تو یہ اس کے بال کھینچتی۔ وہ اسے مارتا اور یہ دونوں روتے روتے میرے پاس آتے۔ میں کبھی کبھی سرنیدرا کا چاقو چھپا دیتا۔ لیکن وُہ بڑا شریر تھا۔ پھر چرا کر لے جاتا۔

رامو خان ہنسنے لگا۔ اختر نے سوچا یہ بوڑھا آدمی ہے۔ ماضی کے صحراؤں میں بھٹکنے لگا ہے۔ اگر اسے بار بار راہ پر نہ لگایا گیا تو ممکن ہے اصل بات بیچ میں ہی رہ جائے۔ چنانچہ بولا۔ "رامو خان یہ سربندرا اور بنو رانی دو ہی تھے یا اور بہن بھائی بھی تھے؟"

"بنو رانی اکلوتی بچی تھی سرکار۔ سربندرا اس کے چچا کا لڑکا تھا۔ یتیم تھا۔ بنو رانی کا باپ اسے پال رہا تھا۔ لیکن شاباش ہے بالکل اپنے بچے کی طرح پالا۔ جب اس نے بنو رانی کو رانگامتی میں سکول بھیجا تو سربندرا کو بھی ساتھ بھیجا۔"

"اور یہاں کیوں نہ پڑھایا؟"

"حضور یہ تیس پینتیس برس پرانی بات ہے۔ اس وقت تو یہاں قسم کھانے کو بھی پڑھا لکھا آدمی نہ ملتا تھا۔ یہاں سکول کہاں۔ صرف رانگامتی میں ایک ہائی سکول تھا۔ بنو رانی کے باپ کو بڑا خیال تھا کہ وہ کچھ پڑھ جائے۔ اور بیچارے نے جناب بڑی مصیبت سے ان کو پڑھایا۔ صبح صبح یہ دونوں بچے ماہی گیروں کی کشتی پر بیٹھ کر جاتے۔ ماں تو مر چکی تھی۔ باپ خود ہی کپڑے میں کھانا باندھ کر دیتا۔ اور شام کو وہاں سے آنے والی کسی کشتی میں بیٹھ کر یہ واپس آجاتے۔ اس کا باپ پڑھا لکھا تو نہیں تھا لیکن وہ دونوں بچوں کو پاس بٹھا کر کہتا کہ سبق یاد کرو۔ اور جس روز ان دونوں نے اکٹھا میٹرک پاس کیا۔ تو اس نے سارے گاؤں میں چاول کی شراب بانٹی تھی۔ بڑی خوشی کی سرکار اس نے اور کیوں نہ کرتا۔ سارے علاقے میں یہی دو بچے تو پڑھ رہے تھے۔ بڑا خوش تھا۔ میرے پاس آیا اور کہنے لگا . . . . ."

"پھر بنو رانی کا کیا ہوا رامو خان؟" اختر نے اس کے خیالات کے دھارے کا رخ قائم کرنے کی بروقت کوشش کی۔

"پھر صاحب بنو رانی دیوی بن گئی۔"

"دیوی بن گئی؟" اختر حیران ہوا۔

"ہاں جناب دیوی ہی کہیے۔ جس نے گاؤں کو گلزار بنا دیا۔ لوگوں کی بھلائی کے

لیے تن من لُٹا دیا۔ وہ دیوی ہی تو تھی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ایک دن اُس نے پنگوڑا میں تقریر کی کہ ہمارے بچّے گلیوں میں آوارہ پھرتے ہیں۔ اگر والدین اُن کو تعلیم کے لیے رانگامتی نہیں بھیج سکتے تو میں انھیں یہاں پڑھایا کروں گی۔ جس کا جس وقت بھی چاہے میرے گھر میں آکر پڑھے۔ اور پھر بنورانی کا گھر دن رات کا مدرسہ بن گیا۔ بچّے آتے اور یہ ان کو پڑھاتی۔ ایک کے بعد دُوسرا۔ دُوسرے کے بعد تیسرا۔ اور جناب کبھی ایک پیسہ تک نہ لیتی۔ کسی نے کچھ دینے کی کوشش کی تو ہنس کر کہتی "یہ تو میں شاخوں کو سینچ رہی ہوں۔ جب یہ شاخیں بڑی ہوں گی۔ تو سبھی مِل کر ان کا پھل کھائیں گے۔"

"پھر تو وہ سچ مچ کا سکول بن گیا۔ بچّے بنورانی کے گھر میں صُبح اور شام اکٹھے ہوتے۔ پہلے پہل سریندرا ان کو مارتا تھا لیکن پھر بنورانی نے رام کر لیا۔ اور وُہ انھیں پڑھانے لگا۔ بنورانی بھی پڑھاتی لیکن وہ زیادہ تر بچّوں کا مُنہ دُھلاتی۔ اُن کے بالوں میں کنگھی کرتی۔ میلے کپڑے دھو کر صاف کرتی۔ بچیوں کو کھانا پکانا۔ اور کپڑے رنگنا اور دری بننا سکھاتی۔ ہر وقت انھیں کہتی کہ صاف سُتھرے رہا کرو۔ رات کے وقت گندے بچّوں کے گھر جا کر ان کے والدین کو صفائی کے فوائد بتاتی۔ خُود بھی شہر سے کتابیں منگوا منگوا کر نہ جانے کیا پڑھتی رہتی۔ سال بھر میں اُس نے گاؤں کی کایا پلٹ دی سرکار۔ گھر کے باہر پہاڑی کی ڈھلان پر سریندرا نے جھُولے ڈال دیے۔ روز چونے سے سفید سفید لکیریں بناتا۔ شام کے وقت بچّے وہاں کھیلتے۔ رات کو چاندنی میں سریندرا اور بنورانی پہاڑی کی ڈھلان پر بیٹھتے۔ ارد گرد بچّے ہوتے۔ جنھیں یہ کہانیاں سُناتے۔ کچھ بچّے بنورانی کے جسم کا سہارا لے کر سو جاتے۔ اور باقیوں کو یہ بتاتی رہتی کہ رانگامتی میں پڑھے لکھے لوگ کیسے رہتے ہیں۔"

"سریندرا اور بنورانی اس سکول کو کامیاب کرنے کے لیے یک جان ہو گئے سرکار۔ ہر وقت اکٹھے رہتے۔ دونوں مِل کر لوگوں کے گھروں میں جاتے اور انھیں پڑھائی اور

صفائی کی نصیحت کرتے۔ شام کو سرنیدرا بچوں کو کھیل کھلاتا تو بنورانی آس پاس گھومتی رہتی۔ وُہ بچیوں کو کھانا پکانا سکھاتی تو سرنیدرا کبھی کبھار جھانکتا رہتا۔ دونوں مل کر شہر سے موٹی موٹی کتابیں منگواتے اور پڑھتے رہتے۔"

"اور سکول کے لیے پیسے کہاں سے آگئے تھے راموخان؟" اختر بولا۔

"جہاں نیک نیتی ہو سرکار وہاں پیسوں کی کیا ضرورت ہے۔ سب بچے اپنی اپنی چیزیں لے آتے تھے۔ غریب بچوں کے لیے بنورانی خود قاعدے وغیرہ خرید لیتی۔ یا کوئی خُدا ترس آدمی کبھی کبھار مدرسے کے لیے خرید دیتا۔ اور سکول بھی تو کیا تھا حضور۔ دو تو کمرے تھے۔ لیکن شی شو اور شی گن کے درختوں تلے گھاس پر سرنیدرا بچوں کو پڑھاتا۔ نارول کے درخت کے نیچے بنورانی، بچیوں کو کپڑے دھونا، رنگنا اور کھانا پکانا سکھاتی۔ بارش آتی تو سب بھاگ کر کمروں میں گھس جاتے۔ وہاں سرنیدرا اور بنورانی صندوق پر بیٹھ جاتے اور بچے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیتے۔ پھر سب مل کر گانے گاتے۔ کوئی بچہ بھاگ کر گھر سے کٹھل لے آتا تو سب کٹھل کھاتے۔ کوئی ڈاب (سبز ناریل) توڑ لاتا تو اس کا پانی پیتے۔ اِن دونوں نے مل کر چھوٹی سی جنت بنا ڈالی تھی حضور۔ میں کھیت میں کام کرتا تو سب کے گانے کی آوازیں ہوا کے ساتھ میرے کان میں پڑتیں۔ اور بنورانی اور سرنیدرا کے لیے بے اختیار میرے مُنہ سے دُعا نکل جاتی۔ میں کیا جناب ہر شخص ان کو دُعائیں دیتا تھا۔ لوگ بنورانی کو دیوی سمجھتے تھے۔ تین سال میں ہی ہمارا گاؤں دُور دُور مشہور ہو گیا۔"

"حکومت نے سکول کی مدد نہ کی؟" اختر نے پُوچھا۔

"کی سرکار!" راموخان آہ بھر کر بولا۔ "اور اسی دن سے گاؤں کی تقدیر گھٹنے لگی۔ غریبوں کے کاموں میں حاکم آگھسیں تو معاملہ چوپٹ ہی ہو جاتا ہے۔ ہمارا ایک ڈی سی (D.C) تھا۔ میکال صاحب۔ ایک دن وُہ دورے پر آیا تو اس نے بنورانی کا سکول دیکھا۔ بڑا خوش ہُوا جناب وُہ بنورانی اور سرنیدرا سے کہنے لگا۔ "ول ام تُم کو

کلکتہ بھیجے گا۔ وہاں ماسٹر لوگ کا ٹریننگ سکول ہوتا ہے۔" پھر اگلی بارشوں میں جب سکول بند ہوا تو بنو رانی اور سریندرا کلکتہ چلے گئے۔"

"یہ تو پتہ نہیں جناب کہ کلکتہ میں کیا ہوا لیکن جب یہ چند ماہ بعد واپس آئے تو سکول بالکل ہی بدل گیا۔ ایک درخت پر لوہے کی گھنٹی لگ گئی۔ سکول کے ٹائم بن گئے دن میں کئی بار گھنٹی بجتی۔ بچوں کے نام لمبی لمبی کتابوں میں لکھے گئے۔ صبح سب بچے مل کر پرارتھنا گاتے۔ دوپہر کو کھانے کی چھٹی ہوتی۔ چار آنے مہینہ فیس لگ گئی۔ چند ایک بچوں کی فیس معاف ہوگئی۔ لوگوں نے باتیں کیں۔ میں نے بنو رانی سے پوچھا تو کہنے لگی" تم دیکھتے جاؤ چاچا۔ ہم گاؤں کو کیا بنا دیں گے۔ اس پیسے سے ہم ایک چھوٹا سا ہسپتال بھی کھولیں گے۔ جہاں سے لوگوں کو دوائی ملا کرے گی۔" میں نے دانتوں میں انگلی دے کر سر پہ پیار پھیرا۔ اور دعا دی۔ وہ جو کرتی بنتی سرکار گاؤں کے بھلے کے لیے کرتی بنتی۔

"پر بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ کلکتے سے واپس آکر سکول ہی نہیں بدلا۔ بلکہ بنو رانی اور سریندرا بھی بدل گئے ہیں۔ وہ یوں ہوا کہ ان کی واپسی کے کوئی سال بعد ایک دفعہ سکول میں چار چھٹیاں ہوئیں۔ اور دوسرے دن سریندرا اور بنو رانی گاؤں سے بھاگ گئے۔"

"بھاگ گئے؟ کیا مطلب؟" اختر سخت متعجب تھا۔

"جی سرکار بھاگ گئے۔" راموخان نے پُر اعتماد انداز میں دہرایا۔

"لیکن کیوں؟"

گاؤں کا چوہدری اب تک خاموشی سے سن رہا تھا۔ اختر کے تعجب پر بولا "جناب چکمہ قبیلے میں زیادہ تر شادیاں اسی طرح ہوتی ہیں۔ عام طور پر لڑکا اور لڑکی آپس میں شادی کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ پھر گاؤں سے بھاگ کر کسی قریبی گاؤں میں جاتے ہیں اور وہاں کے چوہدری سے ملتے ہیں۔ جو ان کے والدین کو بلاتا ہے۔ اگر والدین راضی ہو جائیں تو شادی ہو جاتی ہے۔ اگر وہ راضی نہ ہوں تو لڑکا اور لڑکی واپس چلے جاتے ہیں اور بطور جرمانہ انھیں بھاری دعوت دینا پڑتی ہے۔ سریندرا اور بنو رانی بھی اسی طرح

بھاگ گئے کہ وہ شادی کر سکیں۔"

"پھر کیا ہُوا راموخان؟" اختر نے دِلچسپی سے پوچھا۔

"گاؤں بھر میں طُوفان آگیا سرکار۔ اور کیا ہوتا؟ اِتنا بڑا پاپ تھا یہ۔ لوگ تو دنگ رہ گئے۔"

"لیکن پاپ کیسے ہُوا؟" اختر بولا "اگر شادی کا طریقہ یہی ہے۔"

کاشی مل ایک دفعہ پھر بولا۔ "پاپ یُوں تھا حضُور کہ بنو رانی اور سرنیدرا آپس میں چچا زاد تھے۔ ہمارے قبیلے میں ماموں زاد بچوں میں تو شادی جائز ہے لیکن چچا زاد بچوں میں شادی جائز نہیں کیونکہ وُہ سگے بہن بھائی سمجھے جاتے ہیں۔ خُون کا رِشتہ جو ہُوا۔"

"کمال ہے۔" اختر بڑبڑایا۔ "لیکن بھاگنے سے پہلے اُنھوں نے اپنا ارادہ ظاہر نہ کیا تھا؟"

"نہیں سرکار۔" راموخان بولا "ہماری شادیاں راز میں ہی ہوتی ہیں۔ باقی اتنا ضرور ہے کہ کلکتہ سے واپس آنے کے بعد جو ایک سال وہ گاؤں میں رہے۔ اس میں میں نے اکثر چاندنی رات میں انھیں کرنافلی کے کنارے بیٹھے دیکھا۔ بارش میں ان کے اکٹھا گانے کی آواز سُنی۔ پہاڑی چوٹی پہ قدمبا کے درخت تلے ان کو ہنستے کھیلتے دیکھا اور جوہڑ میں ان کو نہاتے پایا۔ وُہ ایک دُوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ یہ سب عشق کی چھیڑ چھاڑ ہے۔ وہ تو جس روز بھاگے میرے ذہن میں یہ ساری باتیں گھُوم گئیں اور تب مجھے پتہ چلا کہ سرنیدرا اور بنو رانی کتنے بدل گئے ہیں۔"

"پھر کیا ہُوا راموخان؟" اختر نے بڑی دِلچسپی سے پوچھا۔ وُہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور لائٹر سے سگریٹ سُلگا لیا۔

"ہونا کیا تھا حضور۔ شادی تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ جس گاؤں میں یہ بھاگ کر گئے تھے۔ وہاں کے چوہدری نے شادی کرنے سے اِنکار کر دیا۔ اور بجائے ان کے والد کو

وہاں بلانے کے وہ ان دونوں کو لے کر یہاں آ گیا۔ بات بھی تو ایسی تھی حضور۔ اس میں ماں باپ کے علاوہ گاؤں والوں کی عزت کا بھی تو سوال تھا۔

"پھر گاؤں کے ہر چھوٹے بڑے نے ان کو سمجھایا کہ یہ جوانی کی حماقت ہے۔ لیکن وُہ تو جناب مانتے ہی نہ تھے۔ دونوں کہتے تھے کہ ہم نے کتنے مہینے کی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔ کلکتہ میں ہم نے ہر قوم کے آدمی دیکھے۔ کسی کے ہاں بھی چچا زاد بچوں میں شادی ممنوع نہیں۔ جو چیز کلکتہ میں پاپ نہیں۔ وہ یہاں کیسے ہو گئی۔ پاپ تو پرماتما کے خلاف ہوتا ہے شہر یا خطّے کے خلاف نہیں ہوتا۔ اور پرماتما تو ہر شہر میں وہی ہے"

"چند روز بعد پروہت نے اعلان کیا کہ سریندرا اور بنورانی نے پاپ کیا ہے۔ اگلے بدھ کو یہ پگوڈا میں آکر اگنی قربانی دیں۔ اور برت رکھیں۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب ان کو اپنی ضد چھوڑنا پڑے گی۔ بدھ وار کو پگوڈا کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بُدھا کے بُت کے سامنے پروہت بیٹھا تھا۔ سامنے آگ جل رہی تھی۔ لوگ خاموشی سے انتظار کر رہے تھے۔ کہ دروازے میں سے سریندرا اور بنورانی داخل ہوتے۔ آہستہ آہستہ آہستہ سریندرا لوگوں کی طرف مڑا۔ ان کو گہری نظر سے دیکھا۔ اور بڑے حوصلے سے بلند آواز میں بولا:

"ہم قربانی نہیں دیں گے۔"

لوگ ہڑبڑا اُٹھے۔ عورتوں نے عذاب کے خوف سے چیخیں ماریں۔ پروہت اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "قربانی تمھیں دینا ہوگی۔ تم نے پاپ کیا ہے۔"

سریندرا خاموشی سے پروہت کی طرف مڑا۔ ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور پُر اعتماد آواز میں بولا "ہم نے پاپ نہیں کیا مہاراج۔"

"یہ پاپ ہے۔ اپنی بہن سے شادی کی کوشش پاپ ہے۔ یہ بدھ کے حکم کے خلاف پاپ ہے۔" پروہت چلّایا۔

"نہ تو یہ بدھ کے خلاف پاپ ہے اور نہ دھرم کے خلاف۔ یہ صرف ان لوگوں

کی نظروں میں پاپ ہے۔ جو اپنے احکام دھرم کا نام لے کر نافذ کرتے ہیں۔"

"بنورانی تمہاری بہن ہے۔ تمہارا دھرم اس سے شادی کی اجازت نہیں دیتا۔"

"دھرم اور رسوم مختلف ہیں مہاراج" سریندرا کہنے لگا۔ "دھرم نے ایک ہی رشتے کو بہن کہا ہے۔ رسوم نے دھرم کے نام پر چچا کی لڑکی کو بھی بہن بنا ڈالا۔ . . . . . .

. . . . دھرم بدھا کا فرمان ہے۔ رسم لوگوں کی حجت ہے۔ رسم کو دھرم سے نہ ملائیے سرکار۔ بکری کی کھال میں بھیڑیئے کو پہچانیئے۔"

"خاموش!!" پروہت چلایا۔ "یہ میرا کام ہے کہ دیکھوں بکری کون ہے اور بھیڑیا کون ہے۔ تمہارا نہیں۔"

سریندرا لاجواب ہو کر سوچنے لگا۔ تب بنورانی آگے بڑھی۔ اور ہاتھ جوڑ کر بولی "مہاراج آپ بے شک دھرم کو بہتر سمجھتے ہیں لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ ہماری شادی سے گاؤں کو کتنا فائدہ ہوگا۔ اس سکول کی ڈالی ڈالی کو میں نے اور سریندرا نے مل کر سنوارا ہے۔ ہم نے سر جوڑ کر تجویزیں سوچیں اور ہاتھ ملا کر کام کیا ہے۔ اب ہم ایک ہسپتال کھولنا چاہتے ہیں۔ ہمارے دماغ میں خیالات ہیں۔ اور ہاتھوں میں کام کرنے کی ہمت ہے۔ لیکن میں سریندرا کے بغیر یہ کام نہیں کر سکتی۔ اور سریندرا میرے بغیر کام نہیں کر سکتا۔ ہم دونوں مل کر گاؤں کو جنت بنا دیں گے۔ یہاں کے بچوں کی زندگیاں سنور جائیں گی سرکار۔ کیا دھرم بڑی اچھائی کے لیے چھوٹی برائی برداشت نہیں کر سکتا؟"

"دھرم نہ بڑی اچھائی جانتا ہے نہ چھوٹی برائی۔ پاپ چھوٹا ہو یا بڑا۔ وہ پاپ ہی ہے۔" پروہت بولا۔ پھر اس نے بڑی طنزیہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھا اور بولا "اگر کوئی مذہب کا عالم ہوتا تو میں اس سے بحث بھی کرتا لیکن کلکتہ کی نالیاں چاٹنے والے جب بدھ کے احکام پر نکتہ چینی کرنے لگیں تو بحث لاحاصل ہے۔ کان کھول کر سن لو کہ اگر کل شام تک تم قربانی پر راضی نہ ہوئے اور اپنی ضد نہ چھوڑی تو آئندہ پیگوڈا میں داخل نہیں ہو سکتے اور کوئی شخص جو بدھ کا نام لیتا ہے۔ تمہارے ساتھ

واسطہ نہیں رکھے گا۔"

"اس کے بعد سارا گاؤں سہما سہما تھا حضور۔ جیسے کسی رعایا کے محبوب بادشاہ کا آہستہ آہستہ دم نکل رہا ہو۔ لوگ سرگوشیوں میں دُکانوں پر سریندرا اور بنورانی کے بارے میں بات کرتے تھے۔ پہاڑی کی ڈھلان پر سارا دن کوئی کھیلنے والا نظر نہ آیا۔ ماؤں نے بچوں کو گھروں سے باہر نہ آنے دیا۔ سب لوگ اگلی شام کا انتظار کر رہے تھے۔
"سکول کے کمروں میں بنورانی کا باپ اور میں ان دونوں کو مسلسل سمجھا رہے تھے۔ وُہ کونے میں بیٹھی زار قطار رو رہی تھی۔ بچوں کی کتابیں اس کے ارد گرد بکھری ہوئی تھیں۔ سریندرا کمرے میں بے تابی سے ٹہل رہا تھا۔ ہماری ساری باتوں کا جواب ان کے پاس ایک ہی تھا۔ کہ وُہ ایک دُوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور بات مجھے بھی کچھ ایسی ہی لگتی تھی سرکار۔ بچپن سے ان کو اکٹھے دیکھا۔ میرے کندھوں پر وُہ اکٹھے بیٹھے۔ ایک تکلیف پر دونوں اکٹھے ہنسے۔ سکول چلایا تو اکٹھے مل کر۔ دونوں ایک جان بنے تھے سرکار۔ اور اب دھرم کی آری سے کاٹ کر دو کر دینا مجھے بھی کچھ جچتا نہ تھا۔ وُہ بھی تلے ہوئے تھے ایک تو اندھے پریم کا جوش۔ دُوسرے علم کی عقل۔ دونوں انھیں اُکساتے کہ تم ایک دُوسرے کے ہو۔ سریندرا اڑی ضدی تھا۔ اُس نے فیصلہ کر دیا کہ اگر یہ شادی نہ ہو سکی تو وُہ فوج میں چلا جائے گا۔ ان دنوں برہما میں جاپانی لڑ رہے تھے۔ فوج میں ضرورت تھی۔ وُہ آسانی سے جا سکتا تھا۔ لیکن بنورانی یہ سُن کر ڈھاڑیں مار اُٹھتی "سریندرا تم چلے گئے تو سکول مجھ سے نہیں چلے گا۔ میرے لیے دُنیا میں کیا رہ جائے گا۔" ساری رات ہم ان کو مناتے رہے لیکن بے سُود۔"

"اگلی شام وہ گاؤں چھوڑ کر جا رہے تھے۔ سریندرا۔ بنورانی اور اُس کا باپ۔ جھٹپٹے کے وقت میں اُن کو گاؤں سے باہر تک چھوڑنے آیا۔ درختوں کی سائیں سائیں۔ جھینگروں کا شور۔ اُن کے تھکے تھکے بوجھل قدم۔ پیٹھ پر تھوڑا سا سامان۔ سب کی آنکھوں میں آنسو۔ مجھے اب تک وُہ نظارہ نہیں بھولا۔ جب چلنے سے پہلے بنورانی اور سریندرا

سکول کے دروازے سے لپٹ کر روتے۔ کتابوں کو سینے سے لگایا۔ اور کھیل کے میدان میں بے سُدھ ہو کر بیٹھ رہے۔ جب چلے تو مردوں نے دکانوں پر بیٹھے انھیں جاتے دیکھا۔ عورتوں نے دروازوں سے سر نکال کر باہر جھانکا۔ کئی ایک کے دِلوں میں آنسو تھے سرکار۔ لیکن کوئی اُنھیں آنکھوں تک نہ لاتا تھا۔ دھرم کے خوف سے بعض دفعہ انسانیت بھی مر جاتی ہے۔

"شال کے درختوں کے پاس گاؤں کی آخری پہاڑی سے جب ہم نیچے اُتر رہے تھے۔ تو نچلی پہاڑی پر ایک مکان کے صحن میں کاشا کھڑی تھی۔ بڑی پیاری بچی تھی سرکار۔ چھ سات برس کی عمر۔ سکول میں سب سے ذہین۔ بھولی بھالی سُندر۔ بنو رانی کو دیکھتے ہی بھاگی آئی۔ "بی بی۔ بی بی۔ سکول کب کھُلے گا؟" بنو رانی تو اس پر بچھ ہی گئیں حضور۔ بھینچ کر گلے لگا لیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ "میری بچی۔ میری کاشا" وُہ بے سُدھ ہوتی جا رہی تھی۔ سریندرا نے کاشا کو اس سے علیحدہ کیا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور آنکھیں پونچھتے ہُوئے بولا "ابھی چھٹیاں کرو کاشا۔ جب ہم پھر آئیں گے تو سکول کھلے گا۔" اور پھر میری طرف ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ کر بولا "پروہت کو اپنا دھرم منوانے کے لیے تو اور بھی کئی آدمی مِل جاتے چاچا۔ لیکن ہمیں تو دُوسری زندگی نہیں ملے گی۔ ایک ہی زندگی تھی۔ اس میں بھی کوئی سفید کام نہ کر سکے۔" پھر میں کاشا کو لے کر آ گیا۔ وُہ درختوں اور ٹیلوں کے درمیان غائب ہو گئے۔

"اس کے بعد وُہ کسی گاؤں میں نہ ٹِک سکے۔ اِدھر اُدھر سے لوگوں سے پتہ چلتا رہا۔ کہ وُہ جہاں بھی گئے لوگوں کا سلوک اچھا نہ ہوتا۔ اور وُہ چلے جاتے۔ مجھے سال بھر تک پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہیں؟ پھر ایک دفعہ میں خاص بھومی بن کی طرف گیا تو سریندرا سے اچانک مُلاقات ہو گئی۔ بڑی محبت سے ملا وُہ۔ کیا کیا مُصیبتیں اُٹھائیں ان بیچاروں نے۔ یہ تو بڑی لمبی داستان ہے حضور۔ لیکن قُدرت نے بنو رانی پر جو سب سے بڑا ظلم کیا وُہ یہ تھا کہ اس کا باپ مر گیا۔ جنگلوں میں سریندرا اور وُہ ہاتھیوں کے ساتھ لکڑی کے

تنے اُٹھا کر دریا میں ڈال لینے کا کام کرتے تھے۔ ایک دن ہاتھی نے سونڈ میں تنا اُٹھا کر چھوڑ دیا۔ اور جب وہ پہاڑی کی ڈھلان سے لُڑھکتا ہُوا نیچے گرا تو اپنے ساتھ بنو کے باپ کو بھی لے گیا۔ اور پھر بے چاری کے ایک بچہ بھی ہُوا لیکن جنگلوں میں دایہ کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے ایک ہی گھنٹے بعد مر گیا۔ بڑا غم کرتی تھی بے چاری۔ میں ملا تو رو کر کہنے لگی "چاچا بُدھ مہاراج تو بڑے نرم دِل تھے۔ نہ معلوم مجھ سے کیوں اتنا سخت بدلہ لے رہے ہیں۔"

"میں کبھی کبھار اُن کو ملنے جایا کرتا تھا۔ کیا کرتا گاؤں میں تو دِل نہ لگتا تھا۔ اور گاؤں میں اب رہا ہی کیا تھا۔ بچے پھر گلیوں میں آوارہ پھرتے رہتے۔ سر سیدرا کے لگائے ہُوئے جھولے بارشوں میں جُھک کر ٹُوٹ گئے۔ چُونے کے نشان بارش سے مٹے تو کوئی لگانے والا نہ تھا۔ گھنٹی بچے اُتار کر لے گئے۔ سکول کے دونوں کمرے بند پڑے تھے۔ گاؤں کی ساری چہل پہل غائب ہو گئی تھی سرکار۔ گزشتہ زمانہ تو بس ایک سہانا خواب معلوم ہوتا تھا۔

"ایک دن شام کے وقت جب میں کھیت سے آ کر لیٹا۔ تو ایک دم گاؤں میں شور مچ گیا۔ کاشا ناچتی ہُوئی آئی اور خُوش ہو کر بولی "چاچا اب سکول کُھل جائے گا۔" ایک دو اور بچے میرے پاس دوڑتے آئے۔ "چاچا سر سیدرا اور بنو رانی آ گئے۔ وہ گھاٹ پر تمہیں بلاتے ہیں۔" میں اسی طرح اُٹھ کر بھاگا گیا۔ گھاٹ کی سیڑھیاں پھلانگ کر جب نیچے اُترا تو جھٹپٹے کے اندھیرے میں مجھے بنو رانی کا پیلا چہرہ کشتی میں نظر آیا۔ مایوس اور غم سے نڈھال۔ میں فصل کی وجہ سے گزشتہ دو ماہ سے ان کی خبر کو نہ جا سکا اُسے دیکھ کر میرا دِل دھک سے رہ گیا۔ لوگوں کو ہٹا کر آگے بڑھا۔ وہ کشتی کے فرش پر بیٹھی تھی۔ سر سیدرا اُس کی گود میں سر رکھے بے ہوش پڑا تھا۔ سر پر پٹی اور چہرہ بالکل سفید۔ یہ دیکھ کر میں اتنا گھبرایا کہ کچھ پوچھ بھی نہ سکا۔ اِرد گرد لوگ جمع تھے۔ میں نے اُن کی طرف دیکھا۔ بنو نے مجھے دیکھا پھر متواتر دیکھتی رہی۔ بالآخر تھکی ہُوئی آواز

میں بولی۔ "میں نے سریندرا کے لیے گاؤں چھوڑا تھا چاچا۔ اب اسی کی خاطر تمہارے آگے جھولی پھیلانے آئی ہوں۔" میرا گلا رُندھ رہا تھا۔ میں بات سُن نہ سکا۔ آگے بڑھ کر سریندرا کو اُٹھانے لگا۔ تو بنورانی اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرتی ہوئی صاف آواز میں کہنے لگی۔ "یہ بھی ہاتھی سے زخمی ہو گیا تھا چاچا۔ کئی دن گھر میں پڑا رہا۔ پھر اس زور سے بخار آنے لگا۔ زخم پک گیا ہے ..... میرے پاس پیسہ بھی نہیں۔ کیا کروں۔"
میں سریندرا کو اُٹھا چکا تو بنو نے میرے پاؤں پر اپنا کانپتا ہوا سر رکھ دیا۔ اس کی بغیر آنسو کے گرم آنکھیں میری انگلیوں پر انگاروں کی طرح لگیں۔ "اسے کسی طرح بچا لو چاچا۔" وُہ تھکے ہوئے انداز میں بولی۔ لیکن اس کی آواز میں نہ لجاجت تھی نہ جذبات۔ شاید اور احساسات کی تاب نہ تھی۔ کہاں تک روتی سرکار آنسو بھی تو ختم ہو جاتے ہیں۔ دو ایک آدمیوں نے ہاتھ لگایا۔ دھیرے دھیرے ہم سیڑھیاں چڑھ کر اسے دریا کے کنارے سکول میں لے گئے۔ لوگ ہمدردی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کوئی انجانی طاقت ان کو مراساں کر دیتی اور وُہ کھسکنے کی فکر کرتے رہتے۔ میں نے بنو کو کھانا دیا اور پھر بستر وغیرہ لگا کر میں نے کہا کہ رانگامتی سے وید کو بلا لاؤں۔ ہمارے گاؤں میں تو کوئی اچھا نہ تھا۔"
"رات کے اندھیرے میں میں نے کشتی لی۔ پہاڑوں کی ڈراؤنی بلندیوں کے درمیان کرنافلی میں بارش میں بھیگتا ہوا چلاتا رہا۔ میرے بازو شل ہو رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے سریندرا کا بیمار چہرہ تھا اور کانوں میں اس کے بچپن کے قہقہے گونج رہے تھے۔ کناروں سے گیدڑ اور باگھ آواز لگاتے۔ بجلی چمکتی تو میں راستہ دیکھتا۔ آدھی رات کے بعد رانگامتی پہنچا۔ بڑی مُشکل سے وید کو راضی کیا۔ تیار کرایا۔ اور جب واپس بالوکھائی پہنچا تو سُورج شی شو کے درختوں سے بھی اُونچا آچکا تھا۔"
"چند لوگوں کے درمیان گھاٹ پر بنورانی بیٹھی تھی۔ تختہ لگایا گیا۔ پہلے وید اُترا، پھر میں اُتر کر سیڑھیاں چڑھے۔ اور یہ سب کچھ بنورانی ایسی لاتعلقی سے دیکھتی رہی جیسے کوئی ناواقف اجنبی لوگوں کی برات دیکھتا ہے۔" سریندرا کدھر ہے بنو؟" میں نے

پوچھا تو وہ گھاس کا ایک تنکا چبانے لگی۔ دوبارہ پوچھا تو پرے پہاڑیاں دیکھنے لگی۔ پھر لوگوں نے مجھے بتایا کہ سریندرا گزشتہ رات مر چکا ہے اور اب جلانے کے لیے لاش مانگتے ہیں تو کہتی ہے کہ لاش دریا میں بہادی ہے۔ میں نے پوچھا تو تنک کر بولی "جیتے جی تو یہ لوگ اسے اپناتے نہ تھے چاچا اور اب مرنے کے بعد میں کیسے اس کو ان کے حوالے کر دیتی۔" اور وہ اٹھ کر سکول میں چلی گئی۔

"میں نے زندگی میں بڑے بڑے غمگین لوگ دیکھے ہیں حضور۔ لیکن بنو رانی کو دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ غم کیا ہوتا ہے۔ وہ روتی تو نہیں لیکن اس کے جسم کا رواں رواں نڈھال تھا۔ بوجھل آنکھیں۔ تھکی تھکی چال، ستا ہوا چہرہ اور بکھرے ہوئے میلے بال۔ بات کرتی تو کسی غار میں سے آواز آتی۔ کسی طرف دیکھتی تو دیکھتی ہی رہتی۔ سکول کے پرانے شاگردوں تک کو بھول گئی۔ میں نے کتنی دفعہ کہا کہ میرے گھر میں آ رہو، لیکن وہ سکول میں بیٹھی دریاں بنتی رہتی۔ پروہت پھر اس سے کہہ رہا تھا کہ اس نے لاش کو جلایا کیوں نہیں۔ ایک روز میرے پاس آیا۔ کہنے لگا کہ بنو کو گاؤں سے نکال دو۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ فقط ہاتھ سے پکڑ کر اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ اور اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ میرا بس چلتا تو مار ڈالتا اسے۔ لیکن کیا کرتا مندر کا پروہت تھا۔ لیکن میں اکیلا کیا شے تھا حضور۔ اس نے چند بااثر لوگوں کو ساتھ ملایا اور ایک دفعہ پھر بنو رانی کو گاؤں سے نکال دیا۔ اس دفعہ زیادہ لوگ تو نہیں چاہتے تھے لیکن پروہت کے آگے بول نہ سکتے تھے۔ اب کے میں نے بھی بنو رانی کے ساتھ گاؤں چھوڑا اور خاص ٹھوسی بن میں جا کے بس گئے۔ وہ تو قدرت نے ہماری مدد کی ورنہ ہم اب بھی وہیں ہوتے۔ ہوا یوں کہ ہمارے جانے کے چند روز بعد سخت طوفان آیا۔ دریا چڑھ کر بالو کھاتی کے مکانوں میں گھس آیا۔ بارش اور آندھی سے مکانوں کی چھتیں الٹ گئیں۔ کئی درخت ٹوٹ گئے۔ کئی آدمی مر گئے۔ پروہت بھی اپنے مکان کی چھت کے نیچے دب کر مر گیا۔ تب لوگوں نے سوچا کہ بنو رانی پر ظلم کی وجہ سے یہ عذاب آیا ہے۔ وہ ہمارے پاس آئے

اور ہم پھر سے گاؤں واپس آ گئے۔ تب سے سرکار بنورانی یہیں رہتی ہے اور سکول میں بیٹھ کر دریاں بُنتی رہتی ہے۔ کئی برس گزار دیے ہیں۔ لوگوں سے الگ تھلگ ہے۔ اکثر عبادت کرتی ہے۔ بعد میں جب کبھی طوفان آیا بالوکھائی محفوظ رہا، اور لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ بنورانی کی موجودگی کی وجہ سے ہے اِسی وجہ سے اسے چھوڑنا نہیں چاہتے۔"

رات کے دو بج رہے تھے۔ رامو خاں اور کاشی مل کے جانے کے بعد اختر سو نہ سکا تھا اور لانچ میں گدیلے پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی بند آنکھیں جل رہی تھیں۔ اور شام کے واقعات ایک روشن عکس کی طرح ذہن کے تاریک پردے پر ناچ رہے تھے۔ رامو خاں کے قِصّے نے اُسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ان افسروں میں سے نہیں تھا جو افسری کرتے کرتے اِنسانیت کو بھول جاتے ہیں۔ کئی دفعہ اُس نے اپنی کنپٹی پر آنسو کا گرم گرم قطرہ کانوں کی طرف جاتا محسوس کیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اِصلاح کی بے لوث کوشش کس طرح مذہب کے نام پر تباہ ہو گئی۔

فضا بہت اُداس تھی۔ ساتھ کشتی میں دو سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ کناروں پر پہاڑوں کی سیاہ بلندیاں نشہ میں مست بھوت کی طرح دم سادھے کھڑی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کو چہرے پر سہارتے ہوئے اختر کوئی طریقہ سوچ رہا تھا جس سے بنورانی کی مدد کر سکے۔ وہ اس کے مسلے ہوئے دِل کو مزید ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن اپنی ذمّہ داریوں کے پیشِ نظر اُسے کوئی حل نہ ملتا تھا۔ وہ خود مجبور تھا۔ بے بس تھا۔ اس کا رواں رواں بنورانی کے لیے رو رہا تھا۔ لیکن جس انتظامیہ مشین کا وہ پرزہ تھا اس کا عمل اسے مجبور کرتا تھا کہ وہ بنورانی کے دِل کو مسل ڈالے۔ ایک عام فرد قانون کے سامنے کتنا مجبور ہے اس نے سوچا خواہ یہ قانون مُلک کا ہو، مذہب کا، سماج کا یا خاندان کا۔ ایک لمحہ بھر کے لیے اسے پروہت بھی بے قصور نظر آیا۔ چکر سا آنے پر وہ پھر لیٹ گیا۔ اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا کہ بنورانی کی مدد کیسے کی جا سکتی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے وسیع

اختیارات اُس پر قہقہے لگا رہے ہیں اور مذاق اُڑا رہے ہیں۔

دروازے پر بے تحاشا دستک سے اختر کی آنکھ کھل گئی۔

"کون ہے؟"

"جلدی سے باہر آئیے حضور!" باہر سے کاشی مل، اردلی اور کئی لوگوں کی آوازیں آئیں۔ اختر نے لپک کر ڈریسنگ گون اُٹھایا۔ اور پہنتا ہوا باہر نکلا۔ صُبح ہو گئی تھی۔ لانچ کنارے لگی تھی۔ کچھ لوگ جمع تھے۔ کاشی مل تختے کے ذریعہ کنارے پر اُترتا ہوا بولا "میرے ساتھ آئیے حضور۔" اختر اس کے پیچھے چل پڑا۔ گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ سکول کی طرف مُڑا۔ دروازے پر بہت لوگ جمع تھے۔ اختر کو دیکھ کر بھیڑ چھٹ گئی اور وہ اندر چلا گیا۔ کمرے میں تازہ مٹی کی بُو اس کے نتھنوں میں گھُسی۔ کاشی مل نے لالٹین بلند کی اور اختر نے دیکھا کہ سر سیدرا کی قبر پھٹی پڑی ہے۔ بیچ میں ہڈیوں کا ایک پنجر ہے۔ جس کے سرہانے کے طور پر چند نہایت بوسیدہ اور پرانے رجسٹر سر کے نیچے پڑے ہیں۔ اس پنجر کے پہلو میں بنورانی سیدھی لیٹی ہے۔ اس کے سینے میں خنجر پیوست ہے اور کپڑے خُون سے لت پت ہیں۔

وُہ کافی گھنٹے پہلے مر چکی تھی۔ بالو کھائی کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اور کچھ لوگ دفعِ بلا کے لیے دُعائیں پڑھ رہے تھے۔

(۱۹۵۹ء)

مثبت منفی

ہونے کو تو قریشی صاحب کے پاس سب کچھ تھا لیکن انھوں نے اُسے کبھی اہمیت ہی نہ دی تھی۔ کوٹھی تھی، کار تھی، اچھا عہدہ تھا۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ یہ سب چیزیں کوئی عصائے پیغمبری تو ہیں نہیں کہ آدمی اینڈتا پھرے۔ سینکڑوں کوٹھیوں والے ہیں۔ ہزاروں کاروں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ یہ تو نصیبے کی باتیں ہیں۔ موقع بنا، ہاتھ پاؤں ہلائے، تقدیر ہنسی تو دولت برس پڑی۔ اور جو قسمت نے اُلٹی کروٹ لی تو پھر سے نصیبے کی دھوپ چھاؤں میں سُتّھنیاں کھانے لگے۔ دھن دولت تو پنچھی پکھیرو ہے۔ کبھی ایک کی چھت پر اور کبھی دُوسرے کی منڈیر پر۔ اصل چیز تو شرافت ہے۔ جس پر قریشی صاحب کو بڑا ناز تھا۔ فلک سو کج رفتاری کرے، تقدیر اپنا سارا ترکش خالی کر دے، لیکن شرافت کو آنچ نہیں۔ یہ رگوں میں رچی ہوتی ہے، خاندانی ورثہ ہے۔

جسے مِل، مِل گئی۔ جسے نہیں مِلی ہمیشہ محروم رہا۔ زمانے اور حالات کی قلابازیاں بھی اسے نہیں پکڑ پاتیں۔ ویسے تو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں کے نصیبے جاگے، گنگو تیلی راجہ بھوج بن گئے، موقع شناسوں نے ہتھیلی پر سرسوں جماڈالی، نالیوں میں دبکنے والے کاروں میں پھیل پھیل کر بیٹھے، خاک نشین شیش محل میں سے جھانکنے لگے، لیکن شرافت نہ کسی کو ملی نہ کسی سے چھن سکی۔ جو پہلے رذیل تھے بعد میں سونے کی گلوریاں کھاتے ہوئے بھی رذیل ہی رہے اور جو فی الاصل شریف تھے حالات کی جس بھٹی میں بھی گرے کُندن ہی رہے۔

اسی قسم کے خیالات اور دلائل کی بنا پر قریشی صاحب اپنی خاندانی اور شخصی شرافت پر ناز کیا کرتے۔ جن برائیوں سے پرہیز کو شرافت سمجھا جاتا ہے۔ قریشی صاحب عمر بھر ان سے دامن بچاتے رہے۔ اسی کوٹھی میں انھوں نے آنکھ کھولی۔ لڑکپن گزارا۔ جوانی بِتائی۔ دُلہن لائے۔ والدین کو دفن کیا۔ چار بچوں کے باپ بنے۔ لیکن کیا مجال جو کوئی اُن میں تِنکا برابر نقص نکال سکا ہو۔ اس عرصہ میں اینٹ روڑے بدل گئے۔ لیکن ان کا طرزِ عمل قائم رہا۔ جوانی کے بھنور دل میں دُھوم مچاتے رہے لیکن قسم لے لیجیے جو کبھی نگاہ بھٹکی ہو۔ اور جو کسی عورت نے نظر بھر دیکھا تو چہرے پر سُرخی اور دل میں لاحول کے بادل اُمنڈ آئے۔ شراب کو سُونگھا تک بھی نہیں۔ بھلا بُرا نشہ بھی کبھی نہیں کیا۔ پان سگریٹ تک پر ہمیشہ چار حرف بھیجے۔ چائے کسی نے پلادی تو بسم اللہ لیکن خود کبھی طلب نہ کی سینما عُمر میں ایک دفعہ دیکھا، جب حج کی فلم آئی تھی۔ دنگے فساد کو دُور ہی سے سلام۔ مذہب کا یہ حال کہ نمازیں پڑھ پڑھ کر گھٹنے کڑکڑا اُٹھے۔ تسبیح گویا نظامِ شمسی کا حصّہ تھی کہ کبھی رُکتی ہی نہ تھی۔ وظیفوں کا وِرد تارے گن گن کر کرتے مولود ہُوا تو سونا حرام۔ قرآن کے حافظ، سُنّت کے عامل اور شرع کے پابند تھے گفتگو کے فقروں میں حدیثیں اور قرآنی حوالے پروتے رہتے کسی بندۂ خُدا سے بیر نہ تھا سوائے ایک شخص کے۔ اور وہ تھا منگلو۔

دراصل منگلو سے قریشی صاحب کی عداوت کوئی شخصی تنازعہ نہ تھی۔ بلکہ اُن کی شرافت ہی کی دلیل تھی۔ منگلو کم بخت کی حرکتیں ہی ایسی تھیں کہ ہر شریف آدمی اُس کے پاس سے دامن سمیٹ کر اور پائنچے اُٹھا کر گزرتا تھا۔ پچیس برس کی عمر میں ہی ہر اُس گھاٹ کا پانی پی چکا تھا۔ جس کا چالیس سالہ قریشی صاحب کو علم بھی نہ تھا۔ جوئے کے روپیوں کی چھنک دو بار ہتھکڑیوں کی جھنکار بن چکی تھی۔ رگوں میں خون کی بجائے دیسی شراب بہتی تھی۔ ایکٹرسوں کی ننگی تصویریں اکھاڑے میں بھی اُٹھائے پھرتا۔ اور جو ایک دفعہ بوڑھے باپ نے سڑک پر لڑکیوں کو چھیڑنے پر مار کر گھر سے نکال دیا تھا تو ایک رنڈی کا دربان بن بیٹھا تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے قریشی صاحب کا جنھوں نے پولیس کی مدد سے اُسے وہاں ٹکنے نہیں دیا تھا ورنہ تو وہ آج کل کوئی بُرا بھلا دھندا کرتا ہوتا۔ جب دیکھو نیلے کالے کپڑے پہنے، ہونٹوں پہ پان کا رنگ جمائے، چوڑا چکلا سینہ پھیلائے پھرتا ہوتا۔ اگر قریشی صاحب نے کہا "منگلو میاں کبھی اللہ کو بھی یاد کر لیا کرو۔ دو سنّت پڑھنے سے گھس تو نہیں جاؤ گے۔" تو ہنس کر بولا:

"حضور! مقصد تو نماز کا بھی حور حاصل کرنا ہے۔ اور جسے اس دنیا میں حوریں مل جائیں وہ کیوں اگلے جہاں کے لیے اُدھار کرتا پھرے۔ جو رب یہاں دیتا ہے وہاں بھی دے گا۔"

قریشی صاحب کو غصّہ تو بہت آیا۔ لیکن اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگے۔

"دیکھو منگلو تمھارا باپ اور دادا انتہائی شریف انسان تھے۔ اگر تمھیں اپنا خیال نہیں تو کم از کم اُن کی عزّت کا ہی خیال کر لیا کرو۔ یہ کوئی اچھے لچھن نہیں۔"

منگلو ران سہلاتے ہوئے بولا۔ "حضور جو بننا تھا بن چکے۔ اب تو نیا جنم لیں تبھی شریف بن سکیں گے۔"

"ارے نہیں! یہ تمھاری غلط فہمی ہے" قریشی صاحب بولے "اگر اب بھی بُرے لچھن چھوڑ دو تو تم شریف ہی ہو۔"

منگلو بے اختیار ہنس پڑا "واہ بابو جی! صرف چند چیزیں نہ کرنے سے میں شریف بن جاؤں گا؟ وہ شرافت سالی کیا ہوتی جو مریض کے پرہیز کی طرح ہے؟"

اور جب قریشی صاحب اس پرہیز کے فوائد پر لمبا لیکچر انڈیلنے لگے تو منگلو بازو کے پٹھوں کو ٹٹولتا ہوا مسکرا مسکرا کر سنتا رہا اور پھر بولا "حضور مائی باپ ہیں، جو مرضی ہے کہہ لیں۔ لیکن مولا نے جب یہاں جینے کے لیے بھیجا ہے تو جینے کا مزہ اسی میں ہے کہ ہر پانی میں ڈبکی لگا کر اسے چکھیں۔ جو گھڑی آئے گی اس سے اسی سمے نپٹ لیں گے خواہ مخواہ پہلے ہی آدھی زندگی کاٹ کر ایک طرف پھینک دی تو کیا مزہ رہا۔"

اور قریشی صاحب استغفار پڑھتے ہوئے مطالعۂ حدیث میں گم ہو گئے۔ ان کا بس چلتا تو آج سے عرصہ پہلے منگلو کو اپنی کوٹھی سے نکال چکے ہوتے لیکن منگلو ان کے بوڑھے ملازم خیر دین کا لڑکا تھا۔ اور ملازم بھی وہ جس کے باپ دادا قریشی صاحب کے خاندان کی چاکری کرتے آئے تھے۔ اتنے سالوں میں تو ندی کا پتھر بھی پانی میں گھل جاتا ہے، خیر دین خاندان کا فرد کیسے نہ بنتا۔ چنانچہ قریشی صاحب جب کبھی منگلو کو نکالنے لگتے۔ بوڑھا خیر دین اُن کے پاؤں پکڑ لیتا اور قریشی صاحب شرافت اور وضعداری سے مجبور ہو کر چپ ہو رہتے۔ پھر بھی منگلو کو سخت حکم تھا کہ نوکر دل والے حصے سے گزر کبھی کوٹھی کی طرف آنے کی کوشش نہ کرے۔ لچے لفنگے کے تو پاؤں بھی بھرشٹ ہوتے ہیں۔ کوٹھی کے دروازے سرشام ہی بند ہو جاتے تھے لیکن منگلو رات گئے تک بازار میں پھرتا رہتا۔ چوراہے میں کھڑا ہو کر دھوتی گھٹنوں تک اٹھائے قوالیاں گاتا، فلمی تانیں الاپتا، دوستوں کے ساتھ قہقہے لگاتا۔ رات کے دو بجے کے قریب دیوار پھلانگ کر اندر آتا اور نشے میں ماہیا گاتا اپنی کوٹھڑی میں چلا جاتا۔

ایسی حرکتوں پر قریشی صاحب جتنی لعن طعن کرتے کم تھی۔ وہ ہر وقت شرم میں ڈوبے رہتے کہ ایسا ننگِ انسانیت شخص ان کی اپنی کوٹھی میں رہ رہا ہے۔ وہ اس کے باپ کو دیکھتے تو انگلی دانتوں میں دے لیتے اور خدا کی قدرت پر سر دھننے لگتے۔ جو

سونے کے اندر سے مٹی نکلنا ہے۔ باپ ایسا شریف کہ اس کے پسینے سے فرشتے وضو کریں اور بیٹا ایسا رذیل کہ شیطان بھی شاگردی کرے۔ جب دیکھو الٹی سیدھی حرکتیں کرتا پھرے۔ وہ تو اس کے بوڑھے باپ نے پاؤں پر گر کر قریشی صاحب کا ہاتھ روک لیا ورنہ وہ ہنٹر سے اس کی کھال ادھیڑ دیتے۔ جب وہ عورت والا قصہ ہوا تھا، کم بخت نے نہ قریشی صاحب کی عزت کا خیال رکھا نہ باپ کی سفید داڑھی کا۔ آپ ہی سوچیے سردیوں کی رات کے دس بجے، جب بارش ہو رہی تھی اور قریشی صاحب اپنی بیٹھک میں چند معزز دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے، ایک جوان، خوبصورت عورت ان کی کوٹھی میں رات بسر کرنے کی اجازت مانگے تو وہ کیسے مان لیتے۔ اگر اس کے شرابی خاوند نے اس وقت مار کر اسے گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ اور وہ بارش میں اپنے ایک سالہ بچے کو لے کر کہیں دور نہیں جا سکتی تھی تو اس کے قریشی صاحب تو ذمہ دار نہ تھے۔ یہ کیا ضروری تھا کہ وہ عورت سچ کہہ رہی تھی۔ اور اگر بالفرض سچ ہو بھی تو اس کی کیا شرط تھی کہ ارد گرد بیٹھے ہوئے مہمان کل کو قریشی صاحب کی نیت پر شبہ نہیں کریں گے۔ زمانہ بھی تو اتنا خراب ہے۔ ساری رات وہ عورت ان کے ساتھ رہے تو نہ جانے کیسے کیسے قصے مشہور ہو جائیں گے۔ دنیا میں ایک نہیں ہزاروں دکھیا عورتیں ہیں لیکن ان کی خاطر اپنی شرافت اور عزت کا جھٹکا کرانا بھی تو عقلمندی نہیں۔ چنانچہ قریشی صاحب نے نوکروں کو آواز دے کر کہا کہ اس عورت کو فوراً باہر نکالیں۔ اتفاق سے نوکر کوئی موجود نہ تھا۔ خیر دین گاؤں گیا ہوا تھا۔ چنانچہ انھوں نے مجبوراً منگلو کو بلایا۔ اور جب وہ اس سسکتی ہوئی عورت کو باہر لے گیا تو قریشی صاحب اور ان کے دوست دیر تک زمانے کی خرابی کا ذکر کرتے رہے جس میں شرافت سے رہنا دن بہ دن مشکل ہوتا جاتا تھا۔

پچھلی رات کو قریشی صاحب تہجد پڑھ رہے تھے تو برآمدے میں سرسراہٹ سن کر وہ باہر آئے۔ انھوں نے دیکھا کہ برآمدے کے شفاف ٹھنڈے فرش پر کوئی کمبل اوڑھے کونے میں دبکا ہوا ہے۔ برف کی سل پر نیند کہاں؟ سونے والا محض جھلو کے

کھا رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی نے ہڑبڑا دیا۔

"ارے منگلو! تو یہاں کیا کر رہا ہے؟" قریشی صاحب حیران ہو کر بولے۔ اور منگلو خجالت آمیز انداز میں چُپ چاپ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا "اپنے کمرے میں کیوں نہیں سویا؟"

منگلو خاموشی سے ٹارچ کی طرف دیکھتا رہا۔ اور اپنے خمار سے ڈگمگاتے ہُوئے جسم کو سنبھالتا رہا۔

"ارے بولتا کیوں نہیں؟" قریشی صاحب نے اس کا کان کھینچا۔

منگلو نے ان کے پاؤں پکڑ لیے "سرکار میں نے آج تک کسی کی منّت نہیں کی، لیکن آج آپ کی کرتا ہُوں۔ وُہ بے چاری بڑی دُکھیا معلوم ہوتی ہے۔ اس کڑاکے کی سردی میں وہ اور اس کا بچّہ یقیناً مر جاتے۔ اگر میں انھیں اپنے کمرے میں نہ سلاتا۔"

قریشی صاحب کی آنکھوں میں خُون اُتر آیا۔ نمک حرام گود میں بیٹھا داڑھی کھینچتا ہے۔ تہجّد کے وظیفوں کی بجائے اُن کی زبان سے گالیوں کا لاوا پھٹ نکلا۔ تسبیح کی بجائے پاؤں کی ٹھوکریں ٹخ ٹخ بج اٹھیں۔ منگلو لڑھکتا ہُوا برآمدے سے باہر جا گرا۔ "نمک حرام باہر نکل کر مر۔ اگر نیند کا اِتنا ہی متوالا ہے تو جا اس فاحشہ کو گھر سے باہر نکال ورنہ جدھر جی چاہے جا کر مُنہ کالا کر۔ خبردار جو یہاں قدم رکھا۔"

اور جب تیسرے روز منگلو کے باپ خیر دین نے قریشی صاحب سے ڈاکٹر کی فیس کے لیے کچھ روپے مانگے کیونکہ منگلو کو ساری رات باہر لان میں گزارنے کی وجہ سے نمونیہ ہو گیا تھا تو قریشی صاحب نے یہ کہتے ہُوئے صاف انکار کر دیا کہ ایسے ننگِ انسانیت کا مر جانا ہی بہتر ہے۔ لیکن منگلو اپنا علاج کرنا جانتا تھا۔ اس کے سڈول پٹھوں اور کسرتی رگوں میں جب دیسی شراب کا سیلاب بہا تو وُہ چند دنوں میں بھلا چنگا ہُوا۔ چوراہے میں کھڑا نان کباب کھا رہا تھا۔

کباب والا منگلو کا اکھاڑے کا یار تھا۔ اس سے اُلٹے سیدھے مذاق کر لیا کرتا

تھا۔ چنانچہ جب منگلو عورتوں کے ایک تانگے پر نظریں جمائے سیخ سے اُتار کر کباب کھا رہا تھا۔ تو وہ اپنے ایک گاہک کو آنکھ مار کر بولا "یار منگلو تمہارا قریشی صاحب کہتا ہے کہ تیرا اس لونڈیا پر دِل آگیا تھا جو تو نے پناہ کا ڈھونگ رچایا۔" تو منگلو نے کباب والی سیخ زمین پر پٹخ دی، مُنہ کا نوالہ تھوک دیا اور فضا میں تین چار بھپکے بکھیر کر بولا:

"ارے میں بھلا اس کی طرح شرافت کا قیدی ہوں جو کُھل کر دِل بھی نہ بہلا سکوں۔ قسم پیر کی جس لونڈیا پر منگلو کا دِل آئے گا۔ سچ کہتا ہوں چوراہے میں چوم چوم کر سالی کا بھرتہ بنا ڈالوں گا۔"

اِسی قسم کی باتوں کی وجہ سے منگلو اور قریشی صاحب ایک دُوسرے کو ناپسند کرتے تھے۔ اگر حالات ایسے ہی رہتے تو ایک نہ ایک دن اُن دونوں کا ٹکراؤ یقینی تھا۔ لیکن وقت کی ہوائیں تو میلوں دُور اُگے ہوئے تنکوں کو بھی اکٹھا اُڑنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں جب مُلک کے بٹوارے میں مختلف افراد کو قومیت کی کڑاہی میں یکجا ہونا پڑا تو منگلو اور قریشی صاحب بھی دیوار کی اینٹوں کی طرح کندھے سے کندھا مِلا کر کھڑے ہو گئے۔ جس آبادی میں قریشی صاحب رہتے تھے وہاں تین چار کوٹھیاں مُسلمانوں کی تھیں۔ اور اِرد گرد غیر مسلموں کی گھنی آبادی تھی۔ اس کے بیچ بیچ چند غریب مُسلمانوں کے اِکّا دُکّا مکانات تھے۔ برسوں سے ہمسائیگی کے بندھن اُن کو جکڑے ہوئے تھے۔ اور گو مکان اب بھی وُہی تھے، مکین بھی پُرانے تھے، لیکن فضا نئی تھی۔ جس سے خلوص سُکڑ گیا تھا۔ آشنائی دن بہ دن سمٹ رہی تھی۔ اور آپس کے تعلقات دیمک زدہ درخت کی طرح کھوکھلے ہو گئے تھے جو ایک ہی جھونکے پر سرنگوں ہونے کو تیار تھے۔

اور پھر ایک روز اس جھونکے کے اوّلین سانس ماحول کی پیشانی کو چھونے لگے۔ کسی رنڈی کے کوٹھے پر ایک سکھ نے شراب کے نشے میں منگلو سے اُلجھ کر کہا: "سالو مُسلو لے جاؤ اپنے اسلام کو پاکستان میں۔ یہاں تو جو مُسلمان بچے گا اس کی لاش سے ہم اسلام کی چِتا سجائیں گے۔" وہ تو لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ ورنہ منگلو اس سکھ

کا قیمہ کر ڈالنا۔

پیر چڑے شاہ کی درگاہ پر شام کے وقت منگلو پانچ آنے کا تیل اور موتیے کے ہار لے کر گیا۔ وہ نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور ایک کونے میں بیٹھ کر قوالی سنتا رہا۔ کافی دیر بعد اٹھا۔ جوتی اٹھا کر باہر نکلنے لگا تو دہلیز سے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر ماتھے پر لگائی اور زیر لب بولا "پیر جی اسلام کو بچانا۔"

شام کی نماز ادا کر کے قریشی صاحب تسبیح ہاتھ میں لیے باہر لان میں نکلے تو منگلو نے سامنے آ کر سلام کیا۔ انھوں نے تیوری چڑھا کر اسے دیکھا اور پھر ان کی نظر اس کی جیب پر پڑی۔ ایک ننگی امریکن ایکٹرس کی تصویر آدھی باہر جھانک رہی تھی۔ ان کے چہرے سے نفرت ٹپکنے لگی۔ منگلو نے ان کی نظر کا اندازہ کر کے فوراً تصویر کو جیب میں گھسیڑا اور بولا "حضور ایک ضروری بات کرنا ہے۔"

جواب دینے کی بجائے قریشی صاحب منگلو کو ناگواری سے دیکھنے لگے۔

"جی ہندو اور سکھ عنقریب ہم لوگوں پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔"

قریشی صاحب کی تسبیح چھوٹ گئی اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "کیا کہا؟" وہ چلائے۔

"جی آج میں نے ساری کنسوہ لی ہے۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر اُن کا ارادہ ہے"

پھر منگلو اور قریشی صاحب کافی دیر تک سر جوڑ کر باتیں کرتے رہے اور جب باتیں ختم ہوئیں تو قریشی صاحب منگلو کے دوست بن چکے تھے۔

رات ہوئی تو منگلو سر پر لوہے کی ٹوپی اور ہاتھ میں لاٹھی لیے مسلمانوں کے مکانوں پر پہرہ دے رہا تھا۔ اپنی قماش کے دو تین ساتھی بھی اُس کے ساتھ تھے۔ گلی کے ناکوں پر اور سڑک کے موڑ پر وہ درختوں کے سایہ میں چھپ چھپ کر ہندوؤں اور سکھوں کی حرکات دیکھتے۔ رات ہی رات میں انھوں نے کچے تالاب کے کنارے پڑی ہوئی سینکڑوں اینٹیں مسلمانوں کے گھروں میں پہنچا دیں۔ جو حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے منڈیروں کے ساتھ چن دی گئیں۔

اگلے روز منگلو ہر گھر میں چونا اور گندھک لے کر گیا اور لوگوں کو سکھایا کہ کس طرح باورچی خانے کی پھکنی میں بھر کر بطور بندوق استعمال کر سکتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں اُس نے چاقو، بلم اور لاٹھیاں تقسیم کیں۔ اپنے گھر میں پڑی ہوئی شراب کی خالی بوتلوں میں چونا اور گندھک بھر کر لوگوں کو دیئے کہ وقت آنے پر ان میں پانی ڈال کر کارک مضبوطی سے بند کر کے باہر پھینک دیں تو یہ بم کی طرح پھٹیں گے۔

مسلمانوں کا وقت انتہائی بے چینی سے کٹ رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں گھبرا کر کبھی قریشی صاحب باہر جھانکتے تو منگلو ہاتھ میں لاٹھی لیے ہوئے سایہ کی طرح اندھیرے میں سے نکل کر قریب آتا اور تسلی دیتا "جب تک منگلو زندہ ہے قریشی جی کوئی سالا مسلمانوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔" گھبراہٹ میں قریشی صاحب کو پتہ بھی نہ چلتا کہ منگلو کے منہ سے شراب کے بھبکے نکل رہے ہیں۔ وہ اُسے ہمدردانہ سمجھاتے: "دیکھو منگلو تم پہرہ دیتے وقت ہندوؤں کے علاقے میں نہ جایا کرو۔ ادھر ہی رہا کرو۔" منگلو دبی ہنسی ہنستا۔ "چھوڑیے قریشی جی۔ کیوں فکر کرتے ہیں۔ ہم نے تو زندگی کا پورا مزہ لے لیا ہے۔ اب مر بھی گئے تو کیا ہے؟ اور اگر ایک منگلو کے مرنے سے اسلام بچ جائے تو بسم اللہ۔ میں ادھر ان لوگوں کی ٹوہ لینے جاتا ہوں۔ اور اس میں مسلمانوں کا ہی فائدہ ہے۔"

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مسلمانوں کی بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا۔ گنے چنے چند مکانوں کی کوئی تنظیم تھی نہ طاقت۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کر سکتے تھے کہ آپس میں مل کر آنے والے بھیانک وقت کا ہلکے انداز میں ذکر کرتے رہیں۔ منگلو رات کو پہرہ دیتا اور دن کو مسلمانوں کے گھروں میں جا کر ان کی ہمت افزائی کرتا۔ اُس نے چار تعویذ اپنے مضبوط بازوؤں پر باندھ لیے تھے اور ہر وقت چاقو اپنے پاس رکھتا۔

صبح صبح قریشی صاحب نماز پڑھ کر وظیفہ کر رہے تھے۔ وہ آیت کریمہ کا سوا لاکھ پورا کرنا چاہتے تھے تاکہ آفات سے محفوظ رہیں۔ ایک دم دروازہ دھڑاک سے کھل گیا۔ اور منگلو خشمگیں انداز میں اندر داخل ہوا۔ بڑی دلجمعی سے اُس نے دروازہ بند کیا۔ اندر

سے زنجیر چڑھائی۔ قدم قدم چلتا آگے آیا۔ پاؤں کھول کر کھڑا ہو گیا اور قریشی صاحب کو گھورنے لگا۔

"کیا ہے منگلو؟" بڑی مشکل سے قریشی صاحب کے خشک حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی، کیونکہ منگلو کے انداز سے وہ اندر ہی اندر ڈر رہے تھے۔

منگلو کی آنکھیں اُبل رہی تھیں، توازن ڈگمگا رہا تھا۔ منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی لیکن وہ پورے ہوش میں تھا۔ "قریشی جی میں یہ کبھی نہیں ہونے دوں گا۔۔۔۔ ۔۔۔۔ منگلو کے جیتے جی آپ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔"

"کیا بات ہے منگلو؟"

"میں وکیل نہیں قریشی جی کہ بہت باتیں کر سکوں۔ میں تو اپنی بات ایک زبان سے کرتا ہوں اور وہ ہے چاقو کی زبان۔ اسی زبان سے میں کہہ رہا ہوں کہ اگر آج رات آپ نے یہاں سے چھپ کر بچ نکلنے کی کوشش کی، تو کسی سکھ کی کرپان سے پہلے منگلو کا چاقو آپ تک پہنچ جائے گا۔"

"منگلو!!" قریشی صاحب چلائے۔

"منگلو ونگلو کچھ نہیں قریشی جی۔ میں صاف آدمی ہوں۔ آپ کے اپنے گھرانے کے لیے تو ایک ٹرک اور کار آ سکتی ہے جو رات رات میں آپ کو مع سامان یہاں سے نکال لے جائے لیکن آپ نے یہ نہیں سوچا کہ ان مسلمانوں کا کیا ہو گا جن کے پیچھے بھیڑیے منہ کھولے بیٹھے ہیں۔"

"لیکن میں اتنے آدمیوں کے نکالنے کا انتظام کیسے کر سکتا ہوں؟ میرا۔۔۔۔۔"

"ہا ہا ہا۔" منگلو بے اختیار ہنس پڑا۔ "آپ اپنے گھر کی سوئی اور نمک مرچ کی ڈبیا تک لے جانے کا انتظام کر سکتے ہیں اور ان آدمیوں کا نہیں کر سکتے وہ آپ کے باورچی خانے کے چمٹے سے تو زیادہ مہنگے ہیں۔ جو آپ لے جا رہے ہیں اور اُن کو چھوڑ رہے ہیں"

قریشی جائے نماز سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اندر کی طرف مڑتے ہوئے سخت

ناگواری میں بولے "میں نے کسی کا ٹھیکہ نہیں لیا ہُوا۔"

"ہُوں!!" منگلو الفاظ چبا چبا کر بولا۔ "ٹھیکہ..... نہیں.... لیا اور قریشی جی وہی ٹھیکہ تو میں آپ کو دینے آیا ہُوں۔"

چررررر۔ فضا میں آواز اُبھری اور منگلو بازو بھر لمبا چاقو کھول کر ہاتھ میں پکڑے تھا۔ "ٹھیکے کی شرائط آپ کو اِس قلم سے لکھنا ہوں گی قریشی جی۔ آپ لوگ نمازیں پڑھ پڑھ کر خُدا سے حُوروں کے لیے سودا بازی کرتے رہتے ہیں تو اب آپ کو عادت ہو گئی ہے کہ ہر جگہ سودا بازی کریں۔"

منگلو اُچھل کر میز پر چڑھ بیٹھا اور چاقو ہاتھ میں اُچھالتا ہُوا بولا "سودے کی شرط نمبر ایک یہ ہے قریشی جی کہ آپ ٹرک میں جو سامان لے جا رہے ہیں، وہ سارے کا سارا یہیں رہے گا اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگلے جہاں میں آپ کو اس سے ستر گُنا ملے گا۔ اگر میرے وعدے پر اعتبار نہیں تو کسی حدیث میں پڑھ لیجیے گا۔ دُوسری شرط یہ ہے کہ یہاں شہر کے مُسلمانوں کی کُل نفری چالیس ہے۔ خالی ٹرک میں وہ لوگ جیسے بھی ہوں کھڑے ہو جائیں اور آپ انھیں اسلام کا سامان سمجھ کر لے جائیں۔ اگر یہ شرط منظور نہیں تو......" منگلو نے زور سے چاقو اچھالا جو اُلٹ کر میز کی شفاف سطح میں کُھب کر کھڑا ہو گیا۔ "..... تیسری شرط یہ ہے۔"

قریشی صاحب چُپ تھے۔

منگلو اطمینان سے نیچے اُترا۔ کھینچ کر میز سے چاقو نکالا تو چمکیلی سطح پر ایک لمبی سی بدنُما لکیر کُھد گئی اور قریشی صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا: "ٹھیکہ دینے والا جواب نہیں مانگا کرتا، وہ صرف شرائط بتاتا ہے، جسے ٹھیکہ منظور ہوتا ہے کر لیتا ہے ورنہ نہیں۔ اب میں تو چلا قریشی جی۔"

"ٹھیرو۔" قریشی صاحب کانپتی ہُوئی آواز میں بولے اور آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ "دیکھو میں تمھیں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ باقی لوگوں کی بات تم رہنے دو۔"

"واہ قریشی جی خوب سمجھے آپ مجھے۔ میں کیا اپنی جان بچانے کے لیے یہ ڈرامہ کھیل رہا تھا؟ سوال اس وقت منگلو کی جان کا نہیں بلکہ اسلام کی آن کا ہے۔ سکھ کہتے ہیں وہ مسلمانوں کی لاشوں سے اسلام کی چتا سجائیں گے۔ اگر ایک مسلمان بھی اُن کو مل گیا تو وہ یہ سمجھیں گے کہ اس سے انھوں نے اسلام کے پھندے میں سوراخ کر دیا ہے۔ اور میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ لوگ اسلام کو اتنا کمزور سمجھیں کہ اس سے کھیل سکیں۔ منگلو اس وقت جائے گا جب سب مسلمان یہاں سے چلے جائیں گے۔۔۔۔۔۔"

دروازہ کھول کر منگلو باہر نکلنے لگا تو مڑ کر دبی آواز میں بولا "مجھے ابھی اور کام کرنے ہیں۔ آپ سب گھروں میں کہلوا دیں کہ وہ اندھیرا پڑنے پر ایک ایک کر کے آئیں اور آپ کی کوٹھی میں چھپ جائیں۔ اُن کو یہاں سے نکالنا آپ کا کام ہے۔"

شام کے وقت قریشی صاحب کی کوٹھی میں ہُو کا عالم تھا۔ تاریکی چھانے پر ایسا لگتا تھا جیسے قبرستان ہو۔ آہستہ آہستہ کیڑوں کی طرح رینگتے ہوئے لوگ ایک ایک کر کے دبے پاؤں آنے لگے اور درختوں اور کھمبوں کے سائے میں سمٹ کر بیٹھتے گئے۔ مصیبت کے وقت انسان فطرتاً تنظیم پسند ہو جاتا ہے اس لیے کوئی گڑبڑ نہ ہوئی۔

عشاء کے وقت منگلو تیزی سے کوٹھی میں داخل ہوا اور معتبر آدمیوں کو ایک طرف لے جا کر بولا "غضب ہو گیا قریشی جی۔ ابھی ابھی دیکھ کر آیا ہوں شہر سے باہر جانے والی سڑک پر ہندوؤں اور سکھوں کا پہرہ ہے۔"

سب کے چہرے خزاں زدہ پتوں کی طرح مرجھا گئے۔ سر جوڑ کر مشورے کرنے لگے۔ سرگوشیوں میں بحث ہوتی۔ سب اپنی اپنی رائے دے رہے تھے لیکن کوئی حل نظر نہ آتا تھا۔ بچے، عورتوں اور بوڑھوں سمیت چالیس نہتے افراد کی بساط ہی کیا ہوتی ہے؟ منگلو برآمدے کی سیڑھیوں پر لاٹھی کا سہارا لیے سر جھکائے تھا۔ کافی دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے جیب سے شراب کی بوتل نکالی اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔ بعد ازاں منہ پونچھتا ہوا اٹھا اور لاٹھی تولتا ہوا بولا "قریشی جی یہ آپ کے بس کا روگ نہیں۔ آپ اپنا پروگرام جاری رکھیں

سڑک صاف کرنے کا میں ذمّہ لیتا ہوں۔ آپ یہاں ٹرک میں بیٹھ کر انتظار کریں اور ٹھیک ایک بجے یہاں سے چل دیں۔ خواہ یہاں حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ راستہ اللہ نے چاہا تو آپ کو صاف ہی ملے گا۔ کہیں رُکے بغیر شہر سے نکل جائیں۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ کوئی آپ کا پیچھا نہیں کرے گا۔ شہر سے نکل کر پٹرول پمپ سے ایک میل آگے پتھر کے پاس میرا انتظار کریں۔ اگر میں دو بجے تک پہنچ گیا تو بہتر، ورنہ آپ چل دیں۔ لیکن ایک بجے سے پہلے یہاں سے ہرگز نہ چلیں۔"

سب نے مشکوک نگاہوں سے ایک دُوسرے کو دیکھا۔ لیکن منگلو کی آواز میں اعتماد تھا اور دُوسرا کوئی حل نہ تھا۔ اِس لیے اس سکیم پر فیصلہ ہو گیا۔ منگلو نے اپنے اکھاڑے کے ایک دوست کو بلایا اور کونے میں لے جا کر سرگوشیوں میں مشورے کرنے لگا۔ پھر دونوں اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ منگلو کو گئے ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں تارے اُداسی بکھیر رہے تھے۔ مہیب سنّاٹے میں دِل دھک دھک کر رہے تھے۔ موت و حیات میں لٹکی ہوئی مایوس نظریں اُوپر اُٹھتیں، ہونٹ کپکپاتے، ٹانگیں لرزتیں اور ہر لمحہ اعصاب میں نیا تناؤ پیدا کرتا۔ ساڑھے بارہ بجے یاس کی تصویریں دھڑکتے دِلوں سے رینگ رینگ کر ٹرک میں چڑھیں اور پھر سکوت چھا گیا۔

قریشی صاحب بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔ ہر سیکنڈ اذیّت سے بھرپور تھا۔ ایک بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ تناؤ کھنچ سا گیا تھا۔ دبے دبے سانس ہر لحظہ تیز ہو رہے تھے اور اکثر نسوانی پنڈلیوں میں آرے سے چل رہے تھے۔

یک لخت سنّاٹا چیخ اُٹھا۔ بندوقوں کے تابڑ توڑ فائر فضا کو چیر گئے۔ عورتیں اور بچے ایک دم چلّائے لیکن مردوں نے فوراً چُپ کرا دیا۔ پہلے لوگوں نے سمجھا کہ ہندوؤں نے حملہ کر دیا ہے اِس لیے سب دبک گئے۔ لیکن بندوقوں کی آوازیں دُور سے آ رہی تھیں۔ عورتیں مُنہ بھینچ کر رونے لگیں۔ کسی نے کلمہ پڑھا۔ کوئی کانپ گیا۔ کوئی کسمسا کر رہ گیا۔

کسی نے کہا چل دینا چاہیے۔ کسی نے کہا ٹھیرنا چاہیے۔ کچھ دور سے شور و غوغے، چیخوں اور بندوقوں کے چلنے کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد سفید سفید دھوئیں کی زبانیں تاریک فضا میں اُٹھنے لگیں اور پھر ہلکی ہلکی روشنی اُس دھوئیں کی بنیادوں کو روشن کرنے لگی۔ جو بعد میں شعلے بن گئی۔

"ہندوؤں کے بازار میں آگ لگ گئی۔" خیر دین خوشی سے گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

"یہ منگلو کا کام ہے۔" قریشی صاحب بولے۔

"پہرہ دینے والے ہندو یقیناً اِدھر بھاگ گئے ہوں گے۔" کسی نے کہا۔

ایک بج رہا تھا۔ فضا میں شور اُڑ رہا تھا۔ گولیاں ابھی تک چل رہی تھیں۔ آہستگی سے ٹرک اور کار روانہ ہو گئے۔ شہر کا راستہ صاف تھا۔ باہر نکل کر قریشی صاحب نے ٹرک کو روانہ کر دیا۔ پیچھے تعاقب کرنے والا کوئی نہ تھا اِس لیے قریشی صاحب پتھر کے قریب کار روک کر منگلو کا انتظار کرنے لگے۔

بڑا نازک وقت تھا۔ گولیوں کی آوازیں اب بھی کافی دور تھیں لیکن ہر آواز کے ساتھ اُن کے دل دہل جاتے۔ پُراسرار تاریکی میں ہر درخت پر ان کو سکھوں کے جتھے کا گمان ہوتا۔ قریشی صاحب سٹیرنگ پر ہاتھ رکھے تشویش سے کانپ رہے تھے۔ ان کی نظریں بار بار گھڑی دیکھتیں اور پھر سڑک پر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر منگلو کا سراغ لگاتیں۔ کار کا اِنجن چل رہا تھا۔ دو بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔

تھوڑی دیر بعد منگلو گولی کی سی تیزی سے درختوں کے جھنڈ سے نکل کر کار کی طرف لپکا۔ اُس نے ایک لنگوٹ باندھا ہوا تھا اور کالے جسم پر تیل کی مالش کی تھی۔ دھونکنی کی طرح چلتا ہوا سانس اُس کے مُنہ سے الفاظ چھین لیتا تھا۔

منگلو کے بیٹھتے ہی کار تیزی سے روانہ ہو گئی۔

پسینے اور تیل سے شرابور منگلو کے جسم پر چھوٹی بڑی بلیسیوں خراشیں تھیں۔ دائیں بازو میں گولی لگنے سے خون ٹپاٹپ نکل رہا تھا۔ اس کے گرد اس نے کپڑا لپیٹا اور جب

سانس قدرے درست ہُوا تو اُس نے بتایا کہ وہ اور اُس کا ساتھی زمین دوز بدرو کے راستے ہندوؤں کے بازار میں گھُس گئے اور بھاگتے ہُوئے منگلو دوکانوں پر تیل چھڑکتا جاتا تھا اور اُس کا ساتھی آگ لگاتا جاتا تھا۔ ہندوؤں نے گولیوں کی بارش کی اور اس کا ساتھی مارا گیا لیکن منگلو بچ گیا۔

کہانی ختم کرنے کے بعد منگلو نے زور سے انگڑائی لی اور نکھر کر بولا: "سرکار آج بڑے بڑے نر آگ میں بھون کر رکھ دیئے۔" اور پھر کہنی پر جما ہُوا خون کھُرچتے ہُوئے بولا: "کیوں جی کوئی آدمی رہ تو نہیں گیا؟"

"نہیں بھئی سب آگئے۔" قریشی صاحب نے رفتار تیز کرتے ہُوئے کہا لیکن پیچھے سے ان کی چھ سالہ بچّی بول پڑی: "رحمت درزی....."

اور قریشی صاحب کو مجبوراً بتانا پڑا کہ انھوں نے آدمی بھیجا تھا لیکن رحمت درزی نشے میں چوُر تھا۔ گھر کے سب دروازے بند تھے اور وُہ کسی کی بات نہ سُنتا تھا۔ اُنھوں نے نہایت قابلِ قبول بہانہ گھڑ دیا۔ دراصل قریشی صاحب نے اُس کی طرف آدمی بھیجا ہی نہ تھا، کیونکہ وہ اس سے سخت نفرت کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بہت عیاش اور آوارہ تھا اور مشہور تھا کہ وہ اپنی بیوی سے پیشہ کرواتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایسے لوگ پاکستان میں جائیں۔

"گاڑی روکو!" وہ ایک دم چلّایا "گاڑی واپس لے چلو۔"

"کیا ہُوا منگلو؟"

"ہمیں اُن کو بچانا ہوگا۔"

"منگلو پاگل نہ بنو۔ ہندو سکھ اب بیدار ہیں اور ایک آوارہ آدمی اور اُس کی فاحشہ بیوی کے لیے اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالو۔" قریشی صاحب نے سمجھایا۔

"اپنی جان کی....." منگلو نے گالی دی۔ "وُہ فاحشہ ہے تو کیا ہُوا قریشی جی۔ اللہ اور رسول کا نام تو لیتی ہے۔ ہندو سکھ تو اُسے مسلمان سمجھ کر مار دیں گے اور کہیں

گے ہم نے اسلام کی ہتک کی ہے۔" قریشی صاحب چپ تھے۔

"دیکھیے قریشی جی آپ گاڑی شہر سے باہر روکیے۔ میں بدرو کے راستے انجن نکال لاؤں گا۔" گاڑی چلتی رہی۔

"گاڑی روکو۔" منگلو اتنے زور سے چلایا کہ قریشی صاحب کا ہاتھ سٹیرنگ پر کانپ گیا۔ انھوں نے منگلو کو ایک دفعہ پھر سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ سٹیرنگ پر جھپٹا تو انھوں نے مجبوراً بریک لگا دی اور منگلو دروازہ کھول کر باہر لپکا۔

"ٹھیرو منگلو کہاں جاتے ہو؟" انھوں نے منگلو کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا لیکن اُس نے اس زور سے جھٹکا دیا کہ اس کا چھریرا ہوا جسم قریشی صاحب کے ہاتھ سے پھسل گیا اور منگلو لڑکھڑا کے باہر جا گرا ——— "منگلو! منگلو!" وہ باہر نکل آتے۔

سیدھی سڑک کی گم ہوتی لمبائی پر شہر جانے والی سمت میں ایک دھبہ تیزی سے اندھیرے میں تحلیل ہو رہا تھا۔ قریشی صاحب نے چند لمحے سوچا، پھر کار میں بیٹھے اور پاؤں دباتے ہوئے ان کے منہ سے نکلا "پاگل" اور پھر شہر سے مخالف سمت میں اُنھوں نے کار پوری رفتار پر چھوڑ دی۔

(۱۹۵۸ء)

کردار

ٹرین ایک بھاری گھسیٹ سے رُک گئی۔

اسلم نے اُٹھ کر دروازہ کھولا اور ہینڈ بیگ ہاتھ میں لیے اُترنے لگا۔ نیلے کپڑوں والے ایک آدمی نے لپک کر فرشی سلام کیا۔ اُترنے میں اسلم کا پاؤں ذرا لڑکھڑایا تو وہ فوراً دونوں ہاتھ اُٹھا کر بولا:

"بسم اللہ۔ یا اللہ فضل۔"

پھر جھپٹ کر اُس کے ہاتھ سے بیگ لے لیا اور پاس کھڑا خوشامد سے ہنسنے لگا۔

دُوسری طرف سے عملے کے لوگ آ رہے تھے۔

"آئیے جی آئیے"۔ وہ ہاتھ پھیلاتے ہُوئے دو قدم اُن کی طرف بڑھا۔ اور پھر اسلم

کی طرف واپس بھاگا۔

"یہ ہیں حضور شاہ جی۔ ہمارے ٹکٹ بابو۔ اللہ خوش رکھے بڑے نیک آدمی ہیں۔"

اسلم نے ہاتھ ملایا۔

"اور یہ ہے جی بشیرا —— سگنل مین اور پھاٹک مین —— ابے سیدھا چل رے بشیرے —— نئے صاحب سے مل رہا ہے۔ اور چلا بھی نہیں جاتا۔"

اسلم نے حیرت سے اُن دونوں کو دیکھا۔

"اور حضور یہ باقی سب آپ کی رعیت ہیں۔ یہ پانی بھرنے والا —— یہ جھنڈی والا —— یہ بھنگی —— یہ میٹ۔"

"اور تم کون ہو؟" اسلم پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"میں جناب کا خادم کانٹے والا ہوں —— اللہ دتہ نام ہے۔ گاڑیاں شنٹ بھی کر دیتا ہوں —— اس سٹیشن پر سب سے پرانا آدمی ہوں —— جناب پندرہ برس ہو گئے ہیں یہاں مجھے —— جو صاحب بھی آتے ہیں۔ اُن کا تابعدار ہوں —— ابے کھڑے کیا دیکھتے ہو" اس نے اسلم کی "رعیت" کو ڈانٹا۔ "نکالو اندر سے سامان"

اور وہ سب جھٹ سے اندر کو بھاگے۔

اسلم اللہ دتہ کی چرب زبانی پر حیران ہوتا دفتر کی طرف چلا۔ وہ یہاں بطور سٹیشن ماسٹر تبدیل ہو کر آیا تھا۔ جب اُس نے جگہ کا جائزہ لیا تو کافی مایوس ہوا۔ یہ چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ جس پر معمولی سا پلیٹ فارم تھا۔ اُس پہ دو کمرے تھے۔ ایک سٹیشن ماسٹر کا۔ اور دوسرا بابو کا۔ سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں سوئچ بورڈ اور تار کا سامان بھی تھا۔ بابو کے کمرے سے ٹکٹیں بیچی جاتی تھیں اور متفرق رجسٹر بھی رکھے تھے۔ سٹیشن ویٹنگ روم وغیرہ کی سجاوٹ سے پاک تھا۔ اس کی بجائے پیپل کا بڑا درخت تھا۔ جس کے نیچے پرندوں کی بیٹ سے بھرے چند بنچ پڑے تھے۔ ساتھ پانی کا نل تھا جس کے پاس کھمبے کے اُوپر شیشے کے چوکور ڈبے میں ٹوٹی ہوئی چمنی والا لمپ تھا۔ اور اُوپر تیر لگا تھا جس پر

"قبلہ" لکھا تھا۔ سارے سٹیشن کی یہی کائنات تھی۔ گاڑی کے گزرنے کے لیے ایک لائن پلیٹ فارم کے ساتھ بچھی تھی اور دوسری ویسے ہی ساتھ بچھائی تھی جو یا تو شنٹنگ کے کام آتی یا گاڑیوں کے کراس کے وقت استعمال ہوتی تھی۔

اسلم تھوڑی دیر دفتر میں بیٹھا جائزہ لیتا رہا۔ کام کچھ زیادہ نہ تھا۔ سارے دن میں دو گاڑیاں آتی تھیں۔ ایک شام کو اور ایک صبح کو۔ شام والی گاڑی کے ساتھ دوسری گاڑی کا کراس بھی ہوتا تھا۔ دونوں گاڑیاں مخلوط تھیں۔ یعنی بنیادی طور پر مال گاڑیاں تھیں لیکن ان کے ساتھ چار، پانچ ڈبے مسافروں کے بھی لگ جاتے تھے۔ سٹیشن چھوٹا تھا۔ قریب منڈی بھی کوئی نہ تھی۔ اس لیے وہاں سے زیادہ سامان بھی لادا نہیں جاتا تھا۔ خیال یہی تھا کہ صبح اور شام کے کام کے علاوہ باقی دن فارغ گزرے گا۔

اتنے میں اللہ دتہ اندر آ گیا۔ بڑی پلیٹ میں کچھ مالٹے اور سنگترے لا کر بڑی خاطر سے اُس نے اسلم کے سامنے رکھے اور خود پاس کھڑا ہو کر مکھیاں ہلانے لگا۔

"ارے اللہ دتہ کیوں لے آئے یہ سب کچھ؟"

"جناب تھوڑی دیر تک تو مہمان ہیں ہمارے، اس کے بعد آپ افسر اور ہم ماتحت آپ ہماری کوئی چیز کھا لیں گے تو ہم بھی دُنیا میں سر اُٹھا کر چل سکیں گے۔"

اسلم مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور سنگترہ اُٹھا کر کھانے لگا۔ اُس نے پہلی دفعہ اللہ دتہ کو غور سے دیکھا۔ وُہ گٹھیلے جسم کا ٹھنگنا سا مرد تھا۔ عُمر کوئی چالیس سال۔ سر کے بال کافی گھنے۔ چھوٹا سا ماتھا۔ جس کے نیچے قدرے کھُبی ہوئی بے حد چمکدار آنکھیں۔ چوڑے دہانے پر خوشامدانہ مُسکراہٹ حسبِ ضرورت بڑی تیزی سے نمودار ہو جاتی۔ اور پھر غائب ہو جاتی۔ کندھوں میں دھنسی ہوئی چھوٹی سی گردن اور نیچے چوڑا سا جسم۔ اسلم سنگترے کھاتا رہا۔ اور وہ ہاتھ ہلا ہلا کر اُسے حالات بتاتا رہا۔ کہ یہاں فلاں صاحب سٹیشن ماسٹر تھے۔ ان کے بعد فلاں آئے۔ فلاں کے وقت گاڑی کا حادثہ ہُوا۔ فلاں کے وقت میں ریلوے کے وزیر کا اِدھر دورہ ہُوا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اسلم کھا چکا تو اللہ دتہ کہنے لگا۔

"حضور ذرا کوٹھی بھی ملاحظہ کر لیں۔"

کوٹھی کے لفظ پر اسلم مسکرایا۔ لیکن اس کے ہمراہ کوارٹر دیکھنے چلا۔ مکان دیکھ کر اُسے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ اتنے چھوٹے سٹیشن پہ ہو بھی کیا سکتا تھا۔ دو کمرے۔ سامنے چھوٹا سا برآمدہ۔ تنگ سا آنگن۔ جس کے دروازے پہ ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ انجن کے دھوئیں سے رنگی ہوئی دیواریں۔ اسلم کمرے میں داخل ہوا۔ تو ایک دروازہ دُوسرے کمرے میں کھلتا تھا اور دُوسری طرف ایک بند کھڑکی تھی۔

"اچھّا تو یہ باہر کھلتی ہے؟" اسلم کھولنے لگا۔

"نہیں جناب۔" اللہ دتہ بولا۔ "یہ باہر نہیں کھلتی۔ ساتھ میرا کوارٹر ہے۔ اس سے ملاتی ہے۔ اس کی چٹخنی بھی اُدھر ہی ہے۔ اس طرف سے نہیں کھل سکتی۔ میں ہمیشہ سے صاحبوں کے ساتھ رہتا رہا ہوں۔ تاکہ ہر طرح کی خدمت کر سکوں۔"

اسلم کو تعجب ہوا کہ کانٹے والے اور اسٹیشن ماسٹر کے مکان کو ملایا کیوں گیا ہے اور وُہ بھی ایسے کہ کوٹھڑی کانٹے والے کے مکان سے کھل جاتی ہے۔

"جناب کوئی پندرہ سال پہلے حاجی علی احمد صاحب اسٹیشن ماسٹر آئے تھے۔ اُن کی عیال داری بہت تھی اور میں اپنا کوارٹر چھوڑ کر شہر چلا گیا تھا۔ انھوں نے بیچ میں کھڑکی بنوائی تھی۔"

اسلم کے دل میں پہلے خیال آیا تھا کہ اس کو میخ لگا کر بند کر دے لیکن اب اُس نے سوچا کہ یہ اچھّی تجویز ہے۔ جب وُہ بیوی بچّوں کو لے آئے گا تو ممکن ہے اُسے بھی ساتھ والے کوارٹر کی ضرورت پڑے۔ وُہ کچھ دیر کوارٹر دیکھتا رہا اور پھر بولا:

"کیوں بے اللہ دتہ یہاں کوئی قلی وغیرہ کھانا بنانا بھی جانتا ہے؟"

"نہیں حضور ایسا قُلی تو کوئی نہیں —— لیکن اللہ نے چاہا تو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ میری بیوی آ کر دو ٹیم کھانا بنا دے گی۔ آپ کی بھی خدمت کرے گی اور بیگم صاحب

کی بھی ـــــــ ہم تو پرانے خدمتگار ہیں حضور۔"

وہ تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر اللہ دتہ نے لپا جھپ بستر لگا دیا۔ اور خود چلا گیا۔

اسلم کچھ دیر لیٹا رہا۔ گھر کی فضا غیر مانوس سی تھی۔ خالی خالی کمروں میں اس کے سامان کے بنڈل بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ وہ سگریٹ سلگا کر چت لیٹا ہوا کبھی چھت کی کڑیوں پر جالے یا گانٹھ کے نشان دیکھنے لگتا۔ کبھی کسی دیوار کے اکھڑے ہوئے پلستر پر نظریں گاڑے بیوی بچوں کے متعلق سوچنے لگتا۔

شام کو وہ گاؤں کی سیر کے لیے نکلا۔ عام رواج کے برعکس یہاں کا ریلوے سٹیشن بالکل گاؤں کا حصہ تھا۔ اور سٹیشن ماسٹر اور عملہ کے کوارٹروں کے ساتھ ہی گاؤں کی آخری گلیاں آملتی تھیں۔ وہ ایک گلی سے دوسری گلی میں چلتا گیا۔ زیادہ تر کچے مکان تھے۔ جن کی ایک آدھ دیوار پکی تھی۔ کچی گلیاں۔ ان کے بیچ سے گزرتی ہوئی آزاد منش نالیاں۔ جن کی چوڑائی حیرت انگیز طور پر سمٹتی اور پھیلتی جاتی تھی۔ کہیں متروکہ جائیداد کا ناکارہ ملبہ۔ کہیں دیواروں پہ اپلے چپکے ہوئے۔ کہیں کوڑے کے ڈھیر۔ ساتھ ہی ننگ دھڑنگ بچے کھیلتے ہوئے۔ کسی چھوٹی سی کوٹھڑی میں مونگ پھلی اور برفی کی دکان۔ جس کی اہمیت ساتھ لٹکے ہوئے لیٹر بکس سے بڑھ گئی تھی۔ ایک گلی میں سے نکلا تو آگے بازار تھا۔ جس میں پندرہ بیس دکانیں تھیں۔ نیلی کیتلیوں اور پیلی پیالیوں والی چائے کی دکان۔ بنولے۔ کھلی اور دال چنے کی دکان۔ سبزی کی دکان جہاں کپوڑے بھی بنتے تھے۔ لوہار کی دکان۔ موچی کی دکان۔ حکیم صاحب کی دکان جہاں کاپیاں، پنسلیں اور جنتری بھی ملتی تھی۔ ٹاٹ کی آڑ کے نیچے حجام بھی تھا۔ اور اسی طرح کی چند اور دکانیں۔ سٹیشن ماسٹر نیلی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مزے مزے چل رہا تھا کہ پھل کی ایک کافی بڑی دکان نے اس کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ حیران ہوا کہ اتنے چھوٹے بازار میں پھل کی اتنی بڑی دکان کیسے آ گئی۔ ایک دم پھل والا ہڑبڑا

کر اُٹھا۔

"سلام جناب۔"

اسلم بڑا حیران ہُوا۔" ابے اللہ دِتّہ تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"حضور یہ بھی پیٹ پالنے کا ذریعہ ہے۔ تنخواہ سے تو گزارہ سے نہیں چلتا۔ ساتھ یہاں بھی کام کرنا پڑتا ہے۔"

"اور اسٹیشن کی ڈیوٹی پر کیا کرتا ہے؟"

"پتی ہے حضور میری۔ شو کے ماشکی کے ساتھ۔ جب میں نہیں ہوتا۔ وہ بیٹھتا ہے۔ دونوں جناب کے نوکر ہیں۔ مالکوں کی مہربانی سے گزر بسر ہو جاتی ہے۔"

"ہُوں" اسلم نے کہا اور آگے بڑھنے لگا۔

"حضور دکان پر آئے ہیں کچھ پھل چکھتے جائیں۔"

پھل کی بجائے اسلم اُس کی آنکھوں کی ٹمٹماتی چمک دیکھنے لگا۔

"نہیں میاں مجھے نماز سے دیر ہو رہی ہے۔" کہتا ہُوا اسٹیشن ماسٹر آگے بڑھ گیا۔

اگلے دن صبح کی گاڑی چلوا کر اسلم فارغ ہُوا تو مُلاقاتی آنے شروع ہُوئے۔ چھوٹے شہر میں سرکاری مُلازم کی کافی عزت ہوتی ہے۔ کچھ غرض مند اور علاقے میں اُونچی ناک رکھنے والے ضرور اُن سے راہ و رسم رکھتے ہیں۔ اسلم بھی اس رواج کو جانتا تھا۔ اِس لیے جو بھی آیا اس سے خندہ پیشانی سے پیش آتا رہا۔ دو نمبردار ملنے آئے۔ ملک۔ چوہدری اور ہر قسم کے لوگ باری باری آئے۔ آڑھتی۔ سکول ماسٹر۔ سرپنچ اور امام مسجد ملنے آئے خاندانی حکیم بھی چھڑی سمیت آئے۔ جب بھی کوئی مُلاقاتی آتا۔ دِتو پہلے اندر اطلاع کرنے آتا اور دو چار جملوں میں اس کا تعارف کرا دیتا۔ پھر اسلم اُن سے ملتا۔ پچھلی ملازمت کا ذکر ہوتا۔ آئندہ قیام کے لیے اچھی اُمیدوں کا اِظہار کیا جاتا۔ اور پھر لوگ "ہر خدمت" کا وعدہ کر کے چل دیتے۔

سب سے آخر میں دِتو ایک چِٹ لایا جس پر لکھا تھا "ملک رحمت علی تاجر۔"

"کون ہے یہ؟" اسلم نے پوچھا تو دِتّو تعریفی انداز میں بولا۔

"یہاں کا مشہور کاروباری ہے جناب۔ اور افسروں کا بڑا خدمتگار ہے۔ سارے سٹیشن ماسٹر اس سے بڑی مہربانی کرتے رہے ہیں۔ یہ بھی اُن کی بڑی تابعداری کرتا ہے۔ بہت اچھا آدمی ہے حضور۔"

"بلاؤ۔"

چالیس پینتالیس برس کا بھاری بھر کم آدمی اندر داخل ہُوا۔ دو فُٹ کا طُرّہ۔ سیر بھر کی مُونچھیں۔ صاف سُتھری اچکن۔ سفید دُھلی ہُوئی لٹھے کی دھوتی۔ نیچے سے زری والی جُوتی کی پیچ دار نوکیں جھانکتی ہُوئی۔ اور ہاتھ میں چمڑے کے بٹوے والی چاندی کی چھتری ــــــ

وُہ اسلم سے بڑے ادب سے ملا۔ باتیں شروع ہوئیں تو اسلم کو معلوم ہُوا کہ وہ علاقہ کا زمیندار ہے۔ سوڈا کمپنی کا ایجنٹ ہے۔ شہر کی سگرٹ اور کھاد کی ایجنسی بھی اُس کے پاس ہے۔ ڈپو بھی اُس کا ہے اور چند ایک چھوٹے موٹے کاروبار اور بھی کرتا ہے۔

"آپ نئی جگہ آتے ہیں۔ بچّوں کے آنے پر ایک بھینس بھجوا دوں گا ــــــ جب وُہ خشک ہو جائے گی تو دُوسری بھجوا دوں گا۔"

مگر اسلم نے انکار کر دیا۔

وہ جانے لگا تو دِتّو نے بڑے ادب سے اس کی لاٹھی اُٹھا کر اُسے دی۔ دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا اور پھر ساتھ باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسلم نے ویسے ہی جالی میں سے باہر جھانکا تو ملک صاحب اور دِتّو بڑے کھُل مِل کر باتیں کر رہے تھے۔

دو تین روز بعد شام کی گاڑی لیٹ تھی۔ کافی انتظار کے بعد آئی۔ کراس والی گاڑی رُکی کھڑی رہی۔ اور اسلم مصروف رہا۔ اس لیے شام کو بہت دیر سے فارغ ہونے کے بعد گھر کو لوٹا۔ باورچی خانے میں دِتّو کی بیوی اللہ وسائی کھانا پکا کر گھر جا چکی تھی۔ وہ کھانا بنانے کے لیے روزانہ آتی تھی۔ اور دِتّو کے ساتھ مِل کر اُسے کھلاتی تھی ــــ

بعدازاں باورچی خانے میں برتن دھونے کے بعد واپس چلی جاتی تھی۔ اسلم کا خیال تھا، مہینہ پورا ہو جانے پر اُسے کچھ تنخواہ دے دے گا۔

اللہ وسائی تیس بتیس سال کی بھرپور عورت تھی۔ جو صُورت سے زیادہ اپنی تندرستی سے دُوسرے کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ شکل بھی بُری نہ تھی۔ رنگ کیسا بھی ہو گول چہرے کو کون کافر بُرا کہہ سکتا ہے۔ اسلم نے دو چار دفعہ اُسے ایک آدھ نظر دیکھا تھا اور بس۔ اس سے زیادہ کی نہ تو اس میں ہمّت تھی اور نہ خواہش۔

آج دیر ہونے کی وجہ سے وہ جا چکی تھی۔ اور دِتو کھانا کھلانے لگا۔ اِتنے میں اللہ وسائی نے بچّہ بھیج کر دِتو کو کوارٹر میں بلایا۔ وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں مٹھائی کا بڑا سا خوان تھا۔ جو اُس نے اسلم کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا لے آئے دِتو؟"

"جناب آج ملک رحمت علی یہ چھوڑ گیا تھا۔"

"کیوں لیا تھا مجھ سے پوچھے بغیر؟" اسلم غصّہ سے بولا۔

"حضور مجھے تو پتہ نہیں۔ اللہ وسائی گھر پر تھی وہاں ہی چھوڑ گیا ہے ——— اکثر لاتا رہتا ہے حضور ——— افسروں کا تابعدار ہے۔"

"کیوں لاتا رہتا ہے؟"

"آخر حضور افسر بھی تو مہربانی کرتے ہیں۔ اس کا منوں سامان آجاتا ہے۔ کتنی دفعہ اُوپر تلے ہو جاتا ہے تو ہم نے پُوچھا نہیں۔ اب یہ تھوڑی تابعداری بھی نہ کرے تو کیا بات ہوئی؟"

اسلم اب ساری بات سمجھ چکا تھا۔

"کان کھول کر سُن لو دِتو۔ میں رِشوت کھانا حرام سمجھتا ہُوں۔ اور ملک رحمت علی سے صاف کہہ دو کہ مجھ سے کسی مہربانی کی توقع نہ رکھے۔ نہ مجھے اس کی خدمت کی ضرورت ہے۔"

دِتو ایک دم حیران ہو کر اسلم کو دیکھنے لگا۔ جیسے وہ کوئی بہت ہی عجیب چیز ہے۔

"حضور یہ کون سی رشوت ہے۔ سبھی سٹیشن ماسٹر یہ کرتے رہے ہیں۔ بڑے داڑھیوں والے بھی جو پنج وقتی نمازی تھے۔"

"چلو بک بک نہ کرو میری داڑھی نہیں ہے۔ اور میں رشوت بھی نہیں لیتا۔ یہ مٹھائی اُٹھا کر لے جاؤ۔ اور اُسے واپس کر دو۔"

وُہ غصّہ سے مُڑ کر اندر چلا گیا۔ اللہ دِتہ کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ اور وُہ گہری سوچ میں ڈوبا ہُوا تھال اُٹھا کر گھر کو چل دیا۔

چند روز تک اسلم کام کا جائزہ لیتا رہا۔ تو اُسے معلوم ہُوا کہ چھوٹی موٹی بے قاعدگیاں کثرت سے ہوتی رہتی ہیں۔ مٹی کے تیل، فینائل اور کوئلہ وغیرہ کی کاغذوں میں بہت کھپت تھی۔ گو اصل استعمال بہت کم نظر آتا تھا۔ اِس لیے اُس نے وقتاً فوقتاً پڑتال شروع کر دی اور ملازموں کو ٹوکنے لگا۔ اللہ دِتہ اب اس سے کچھ دب گیا تھا۔ اس کی چرب زبانی بھی نسبتاً کم تھی۔ دُوسرے قلیوں اور ملازموں پر بھی رُعب قدرے کم ڈالتا تھا۔ اور اس کی شخصیت میں جو انگارے سے دہکتے تھے۔ اُن پر راکھ کی ہلکی سی تہہ چڑھ گئی تھی۔

ایک دن اسلم اچھے مُوڈ میں تھا کہ کہیں سے اللہ دِتہ نمودار ہو گیا۔

"ارے دِتو پانی تو پلاؤ۔"

دِتو جھٹ سے گلاس لے کر بھاگا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ناکام واپس آ گیا۔ مٹکے سب خالی تھے۔ اور پانی کا نل خراب تھا جس کی مرمّت ہو رہی تھی۔

"ارے ستیاناس! مجھے تو بڑی پیاس لگی تھی ——— اچھا جا بھاگ کہ انجن والے سے پانی لے آ۔ گاڑی بھی قسمت سے کھڑی ہے۔"

دِتو حیران ہو گیا۔ "جناب وُہ تو گرم ہو گا۔"

"تو کیا ہُوا۔ ابھی رکھ دیں گے تو ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"لیکن جناب، اگر اجازت ہو، تو گاڑی کھول کر پھلوں کے کسی ٹوکرے سے سنگترے

وغیرہ نکال لوں۔"

"ایں" اسلم کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔"حرامزادے مجھے چوری کا مال کھلاتا ہے ——— خبردار جو ایسی بات پھر کبھی کی ——— بھاگ یہاں سے اور جا کر انجن سے پانی لا۔"

اور وہ تو ایک دم غائب ہو گیا۔

چند دن گزر گئے۔ اسلم نئی جگہ پر اب جم چکا تھا۔ مقامی لوگوں سے کچھ راہ و رسم ہو گئی تھی اپنے ملازموں کے کام کی رفتار کا اندازہ بھی ہو چلا تھا۔ نئی جگہ کی اجنبیت بھی ختم ہو گئی تھی۔ اور وہ اب بیوی بچوں کے بغیر کچھ اداسی محسوس کرتا تھا۔ دفتر میں فارغ بیٹھے ہوئے یا رات کو اندھیرے کمرے میں چت لیٹے ہوئے وہ اکثر حساب لگاتا رہتا کہ اس کی لڑکی کے امتحان میں ابھی اتنے دن باقی ہیں۔ وہ فارغ ہو تو فوراً بیوی کو لے آئے تاکہ گھر میں کچھ رونق ہو۔ اور اللہ وسائی کی تنخواہ کا بوجھ بھی ہلکا ہو۔

ایک شام پہلی گاڑی آ چکی تھی۔ لیکن کراس کرنے والی کچھ لیٹ ہو گئی تھی۔ ڈرائیور اور گارڈ سے وہ کاغذات لے چکا تھا۔ اور دونوں سے باہر کی خبروں پر تبصرہ کر کے قریباً سب موضوع ختم کر چکا تھا۔ گاڑی رکنے کے بعد کی ابتدائی ہمہ ہمی ختم ہو چکی تھی۔ اور اب بیشتر لوگ یا تو کسی بنچ پر بیٹھ چکے تھے یا کھڑکیوں کے قریب ٹہل رہے تھے۔ بچوں کے ساتھ سفر کرنے والے زنانہ ڈبوں کی کھڑکیوں سے لگے ہوئے بیویوں کی نہ ختم ہونے والی فرمائشیں پوری کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اکا دکا فقیر ادھر ادھر گھوم کر ایک ایک مسافر سے کئی کئی بار ناگواری کا اظہار سن چکے تھے۔ کئی کئی بار پھیرے لگانے کے بعد خوانچے والوں کی پھرتی مدھم پڑ گئی تھی۔ اور قلی اپنے پیسے گننے میں مصروف تھے۔ اسلم نے ٹیلیفون پر پچھلے سٹیشن سے بات کی تو پتہ چلا کہ ابھی گاڑی کے آنے میں کافی دیر ہے اور وہ پلیٹ فارم پر گھومتا ہوا گاڑی کے آخری سرے تک نکل گیا۔ وہاں اسے شک سا پڑا کہ لائن کا کانٹا ٹھیک نہیں بدلا گیا۔ لیکن قریب سے دیکھا تو وہ درست تھا۔ اور اسلم

واپس مڑا۔

پلیٹ فارم کے ساتھ والی پٹڑی پر گاڑی کھڑی تھی۔ اور کراس کرنے والی اس سے ملحق لائن پر آنے والی تھی۔ سگنل سے پار پٹڑی کی سیدھ میں نظریں جمائے دُوسری گاڑی کے دُھوئیں کو اُفق میں ڈھونڈتا ہُوا وُہ آہستہ آہستہ واپس آنے لگا۔ اور غیر ارادی طور پر دُوسری پٹڑی پر چلنے لگا۔

وُہ ایک دم ٹھٹکا...... گاڑی کی پچھلی طرف ایک ڈبّے کے پاس پہیوں کے نیچے سے دِتّو پھل کا ایک ٹوکرا شوکت ماشکی کو دے رہا تھا۔ شوکا اسے لے کر تیزی سے شہر کی طرف بھاگا۔ اسلم نے آواز دی۔ مگر اُسی وقت انجن بھاپ چھوڑنے لگا۔ اور اُس کی آواز شور میں دب گئی۔ پُورا سراغ لگانے کے لیے اسلم فاصلہ دے کر شوکے ماشکی کے پیچھے چلنے لگا۔ تھوڑا تعاقب کرنے پر اُس کے خدشات درست نکلے۔ شوکا ماشکی بازار میں دِتّو کی دُکان پر پھل لے گیا تھا۔ ـــــــ اتنے میں گاڑی کی وِسل سُنائی دی اور اسلم واپس بھاگا۔

وُہ پلیٹ فارم پر پہنچا تو گاڑی رُک چکی تھی۔ اُس نے بھاگم بھاگ کارروائی پُوری کی۔ دونوں گاڑیوں کو چلوایا۔ اگلے سٹیشنوں پر روانگی کی اِطلاع دی اور پھر اطمینان سے دِتّو کی تلاش شروع کی۔ مگر وہ دونوں غائب تھے۔

شام کھانے پر اسلم دتّو پر برس پڑا۔

"اُلّو کے پٹھے۔ بدمعاش۔ حرامی۔ گاڑی میں سے پھل چراتے شرم نہیں آتی۔ حرکتیں تم کرتے ہو اور نام میرا بدنام ہو گا۔"

مگر دِتّو صاف مُکر گیا "کیسا پھل حضور؟ کونسی گاڑی؟"

"شوکا سؤر کِدھر ہے؟" اسلم دہاڑا۔

"وُہ تو جناب ماتم ہو گیا ہے۔ ادھر گیا ہے۔" دِتّو سکون سے بولا۔

"کہاں ماتم ہُوا ہے؟ بلاؤ اسے۔"

"وہ تو جناب ڈھوک پر گیا ہے۔ یہاں سے تین میل دُور۔"

اسلم نے طیش میں آکر برتن پھینک دیے۔ دِتو کو اپنی زبان میں ہر گالی دے ڈالی۔ اور صُبح سویرے پولیس کے حوالے کر دینے کا فیصلہ سُنا کر اُسے باہر نکال دیا۔ پولیس کا نام سُن کر دِتو گھبرایا۔ مگر کان لپیٹ کر چل دیا۔

رات اسلم چارپائی پر لیٹا تو دیر تک سوچتا رہا۔ کہ دِتو کے خلاف کیا کارروائی کرے کہ اُس کے ساتھ دُوسروں کو بھی نصیحت ہو۔ وُہ آج تک جہاں بھی رہا تھا اُس نے حُسنِ کارکردگی اور دیانتداری میں بڑا نام پایا تھا۔ لیکن اب اگر اُس کا ماتحت عملہ آزادی سے من مانی کرتا رہا تو اسلم مُفت میں بدنام ہو جائے گا۔ اُس نے یہ بھی سوچا کہ کل سے دِتو اور اللہ وصائی کا داخلہ بند کر دے اور اپنی بیوی کو تار دے کر بُلالے۔ لڑکی اتنے دنوں تک ماموں کے گھر ٹھہر سکتی ہے۔ اس قسم کے پروگرام بناتا سو گیا ——————

دھرتی کے گہرے سینے میں کوئی مدھم سی گُونج اُبھری۔ جو. . . . . . . آہستہ. . . . آہستہ. . . . . قریب آتی گئی. . . . . . . اسلم بیدار ہُوا تو وہ چوکھٹ کا کھٹکا تھا . . . . نیند سے لدی ہُوئی آنکھوں میں چھوٹی سی درز ہُوئی. . . . . . روشنی کی کرنیں گھُومتے دماغ سے جا ٹکرائیں. . . . . . . اور. . . . اسلم نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

کمرے میں لیمپ کی روشنی تھی۔

اُس نے سر اُٹھایا تو لیمپ کے پاس اللہ وصائی کا چہرہ نظر آیا۔ دونوں کوارٹروں کی درمیانی کھڑکی کھُلی تھی۔ اس میں اللہ وصائی لیمپ ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی۔ اسلم کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ مسکرائی اور اُلٹے ہاتھ سے کھڑکی بند کر کے آہستہ آہستہ اسلم کی طرف بڑھنے لگی۔

اس کا دوپٹہ غائب تھا۔ گریبان کے اُوپر والے بٹن کھُلے تھے۔ اور لیمپ کی روشنی میں جسم کی قوسیں بہت نمایاں تھیں۔ سر کے بال ڈھیلے ڈھالے تھے۔ چمکتی آنکھوں اور

مسکراتے ہونٹوں سے وہ اسلم کی طرف ٹکٹکی باندھے قدم بہ قدم آگے آ رہی تھی۔

"کیا بات ہے اللہ وصائی؟" اسلم ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ آگے آئی۔ آہستگی سے میز پر لیمپ رکھا اور سڈول بازو سینے پر باندھ کر مسکرانے لگی۔

مرد کسی ایسے دقوعے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ ہو۔ اور اُسے اچانک سپردگی میں ڈوبی ہوئی عورت کا سامنا کرنا پڑ جائے۔ تو اس کی زندگی کا ایسا لمحہ ہوتا ہے جس میں اس کی خالص شخصیت بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس کا ردِ عمل سوچ، بناوٹ اور پالیسی سے خالی ہوتا ہے اور اس کے سارے ماضی کا نچوڑ اس ایک لمحے میں ٹپک پڑتا ہے۔ ان معاملات میں ناتجربہ کار سیدھا سادا مرد کسی سحر زدہ کی طرح بھاگ نکلنا چاہتا ہے۔ مگر اس میدان کا شاطر مزے سے ہاتھ بڑھا لیتا ہے۔ اسلم بھی اللہ وصائی کا مطلب سمجھ گیا اور اس کی شخصیت کے سارے اجزا غیر شعوری طور پر اس صورتِ حال سے نکلنے کے لیے کلبلانے لگے۔

"اِس وقت کیا کرنے آئی ہو؟" اُس نے گھبرا کر پُوچھا۔

"میں نے کہا" وہ ہنسی "آپ تھک گئے ہوں گے۔ ذرا پاؤں دبا آؤں۔" اور وہ پائنتی کی طرف بڑھی۔

"نہیں نہیں" اسلم چھلانگ لگا کر چارپائی سے کودا "مجھے کوئی ضرورت نہیں ——— تھکاوٹ نہیں ——— تم جاؤ ......"

وہ کونے میں جا کھڑا ہوا اور ہاتھ سے جانے کے اشارے کرنے لگا۔

اللہ وصائی نے اُسے نظر بھر کر دیکھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ جیسے پتلا بادل رینگتا رینگتا چاند کو ڈھانپ لے ——— پہلے مسکراہٹ غائب ہوئی ——— پھر آنکھیں بجھ گئیں ——— جسم ڈھیلا پڑا ——— اور چہرے پر شکست اور مایوسی چھا گئی۔

"بابوجی آپ ـــ دِتّو کو پولیس کے حوالے نہ کریں ـــ ہمارا تو کاروبار ہی گاڑی کے پہیئے سے چلتا ہے ـــ آپ . . . . . رات کو جب چاہیں . . . . کھڑکی پر تھاپ دے دیں . . . . . مم مم میں آجاؤں گی . . . . پہلے بھی کتنی افسروں کی اسی طرح سیوا کرتی رہی ہوں . . . . . ."

مرد کا لہجہ گڑ رچکا تھا۔ اب اسلم میں افسر بیدار ہو گیا۔

"نکل جاؤ یہاں سے ـــ تم لوگوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے ـــ دفع ہو جا ـــ فاحشہ کتنی ـــ خبردار جو اب اس گھر میں قدم رکھا ـــ کل صبح میں دیکھتا ہوں تم اس گھر میں کیسے رہتے ہو ـــ کمینے ـــ ذلیل . . . ."

اور وہ گالیاں دیتا رہا۔ اللہ وسائی کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ اور وہ ایک دم لیمپ اٹھا کر چلی گئی۔

کھڑکی دھم سے بند ہو گئی۔

گھپ اندھیرے میں اسلم گُم سُم سا ہو گیا۔ جس طرح مٹھائی کے ٹکڑے پر چار طرف چیونٹیاں رینگتی ہیں۔ اِس طرح اس کے ذہن پر احساسات کے "انے بانے ایک دوسرے کو روندتے ہوئے رینگ رہے تھے۔ تھوڑی پشیمانی۔ کافی حیرت اور قدرے پچھتاوا۔ اس کے لاشعور میں گڈمڈ تھے۔ مگر بظاہر وہ سخت غصّہ میں تھا۔ اور اُس کی اخلاقی حسیات بُری طرح مجروح تھیں کہ اللہ وسائی نے اُسے اس قماش کا آدمی کیوں سمجھا؟ ایک دم وہ طیش کھا کر اُٹھا اور کھڑکی پر گھونسہ مار کر چلایا۔

"سؤر کے بچّے دِتّو ـــ کل دس بجے تک یہ کوارٹر خالی کر دو۔ ورنہ پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ اور نوکری سے نکلوا دوں گا۔"

اُسے یقین تھا کہ دِتّو وہاں موجود ہے۔

واپس جا کر چارپائی پر لیٹا۔ مگر اُسے کافی دیر تک نیند نہ آئی۔ اس کی سابقہ شریفانہ زندگی اور نیک نامی کی شہرت بار بار آ کر جھنجوڑتی۔ اس قسم کی حرکت کی وجہ سے بدنامی

کے تصور سے ہی وُہ کانپ اُٹھتا۔ اسلم متوسط طبقے کی مضبوط اخلاقی تنظیم کا پروردہ تھا۔ جس کی زندگی میں شادی سے پہلے جنسی تسکین کے مواقع اوّل تو آئے ہی نہیں۔ اور اگر چند ایک امکان کی حد میں آئے بھی تو وُہ اُن سے فائدہ نہ اُٹھا سکا تھا۔ اس لیے اس کی اخلاقی نیک نیتی کو اس طلاطم سے صدمہ پہنچنا قدرتی تھا۔ وُہ دیر تک بستر میں پہلو بدلتا رہا۔ پھر اُٹھ کر ایک گلاس پانی پیا اور صحن میں ٹہلنے لگا جس سے اعصاب کو کچھ تقویت ہُوئی اور وُہ پھر آ کر لیٹ گیا۔

صُبح اسلم ذرا دیر سے بیدار ہوا۔ باورچی خانہ سے برتنوں کے کھڑکنے کی مخصوص آواز نہ آتی تھی۔ اور سارے گھر میں خاموشی تھی۔ بستر پر لیٹے لیٹے ہی اُسے پتہ چل گیا کہ اللہ وصائی کام پر نہیں آئی۔

گاڑی کے آنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ اور وہ آرام سے تیار ہونے لگا۔

"پرواہ نہیں" وُہ شیو کا برش زور سے داڑھی پر رگڑتے ہُوئے بڑبڑایا "چند دن سٹیشن کی دکانوں سے کام چل جائے گا۔ اور پھر گھر کے سب لوگ آجائیں گے ......"

نہانے کے بعد جسم پر تولیہ رگڑتے ہوئے اُس نے سوچا کہ بیوی کو خط لکھ کر جلد از جلد آنے کی تاکید کرے۔ تاکہ یہ سب جھمیلے ختم ہوں۔

کپڑے پہن کر وُہ گھر سے جلدی نکلنے لگا تاکہ سٹیشن پر ناشتہ کرے۔ مگر دروازے پر ہی ملک رحمت علی مل گیا۔ اپنی چکیلی چھڑی اُٹھا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے مؤدب سا سلام کیا۔

"آئیے ملک صاحب" اسلم خُوش خلقی سے بولا۔ "آج آپ سویرے سویرے کدھر گھوم رہے ہیں؟"

"بس جی ویسے ہی ذرا اسلام کو حاضر ہو گیا تھا۔" ملک رحمت علی نے محتاط سا جواب دیا۔ دونوں طرف سے مزاج پُرسی ہُوئی اور اسلم گھڑی دیکھتے ہُوئے بولا:

"میں ذرا اسٹیشن جا رہا ہوں۔ کوئی کام تو نہیں کیا؟"

"نہیں جناب کام تو نہیں۔ آپ کا بھی وقت قیمتی ہے۔ لیکن اگر چند لمحے رُک جائیں۔ تو جلدی جلدی ایک چھوٹی سی عرض کر لوں۔"

"جی فرمائیے۔"

ملک رحمت علی نے چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور بات کرتے کرتے جِھجک گیا۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"جی نہیں خاص تو نہیں ...... لیکن ذرا ...... اندر چلے چلیں تو مجھے اطمینان رہے گا۔" اسلم ناگواری سے اُسے اندر لے آیا۔

"جی وہ ......" اُس نے گلا صاف کیا "میں حاضر ہُوا تھا کہ دِتّو کو معافی دے دیں ـــــ نادان ہے ـــــ بے وقوف ہے ـــــ نوکروں سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں ـــــ مالک کا کام ہی معافی دینا ہے۔"

اسلم نے تیز نظروں سے ملک رحمت علی کو گھُورا

"دِتّو آپ کے پاس گیا تھا کیا؟"

"جی وُہ تو سویرے سے میرے گھر بیٹھا رو رہا ہے۔ مجھے جگایا بھی اُسی نے ہے۔ وہ بڑا نادم ہے ـــــ دراصل غریب آدمی ہے۔ عرصہ سے پھل کا کاروبار کرتا ہے۔ اور اسی طرح سے کرتا ہے۔ اس کی دو وقت کی روٹی چل جاتی ہے۔ اور گاؤں والوں کو اچھا پھل مِل جاتا ہے ـــــ گویا سب کا بھلا ہے ـــــ وُہ بھی اس گاؤں کا رہنے والا ہے۔ سب مِل جل کر گزارہ کر لیتے ہیں۔ اس کو یہاں نوکر بھی میں نے کرایا تھا۔ پندرہ برس سے یہیں کام کر رہا ہے۔ کبھی کوئی ناخوشگوار بات نہیں ہُوئی ـــــ دُنیا کے کاروبار تو اسی طرح چلتے ہیں۔"

اسلم نظر جما کر ملک رحمت علی کی بات سُنتا رہا۔ جو سوٹی سے فرش کریدتا ہُوا ایسے دھیمے دھیمے بات کر رہا تھا۔ جیسے ٹرین سے پھل چرانا کوئی غیر معمولی بات ہی نہیں۔

"مگر ملک صاحب میں یہاں کا انچارج ہوں۔ اور جانتے بوجھتے ہوئے پھل چرانے کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں؟"

"ہا ہا ہا!" ملک رحمت علی خوشامد سے ہنسا "آپ بہت سادے اور شریف انسان ہیں۔"

اسلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ منفوٹا آگے جھکا۔ "مگر آپ جاننے کی کوشش ہی کیوں کرتے ہیں —— اگر وہ اپنا ضمیر گندہ کرتا ہے تو آپ کی بلا سے —— آپ کیوں اس کیچڑ میں آتے ہیں —— آپ نے کون سا یہاں ساری عمر بیٹھ رہنا ہے —— یہی کوئی چھ مہینے سال کی بات ہے —— پھر کوئی دوسرا افسر آجائے گا —— آپ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈال کر یہ چیزیں روک بھی دیں گے تو پھر شروع ہو جائیں گی —— میں دتو کو سمجھا دوں گا۔ کہ جب تک آپ ہیں۔ ذرا احتیاط سے کام لے اور ہاتھ روک کر رکھے۔"

اب اسلم سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ کھڑا ہو گیا۔ "دیکھیے ملک صاحب میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ لیکن آپ سے درخواست کروں گا کہ میرے محکمانہ انتظام میں دخل نہ دیں —— دتو کو میں کہہ چکا ہوں کہ میں اس کے خلاف محکمہ میں رپورٹ کر دوں گا —— اور اگر ضرورت پڑی تو پولیس کو بھی کیس دینا پڑے گا —— ابھی سٹیشن پر جا کر میں ذرا انکوائری کر لوں تو کچھ فیصلہ کر دوں گا —— بہر حال یہ تو ہوتا ہی رہے گا۔ مگر اسے کوارٹر آج ہی خالی کرنا پڑے گا —— اس معاملہ میں کسی کی بات نہیں مانوں گا۔"

ملک رحمت علی بڑی توجہ سے اسلم کی بات سنتا رہا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایک چھپا ہوا تمسخر تھا۔ جو مونچھوں کی ہلکی سی حرکت سے بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے اسلم کے غصے کو اور بڑھا دیا اور وہ باہر کی طرف چلنے لگا۔ مگر رحمت علی اپنی جگہ پر اڑا رہا۔ اور دو قدم چل کر اسلم کو بھی رکنا پڑا۔

"جناب مجھے غلط سمجھے" ملک رحمت علی آہستگی سے بولا "میرا مقصد ہرگز آپ کے کام میں دخل دینا نہ تھا۔ میں تو ہمیشہ سے افسروں کا خدمت گزار و تابعدار رہا ہوں۔ آپ آج بھی اور آئندہ بھی مجھے اپنا خیر خواہ پائیں گے۔ اور........"

اُس نے کھنکار کر گلہ صاف کیا...... "میں نہیں چاہتا کہ دِتو اُلٹی سیدھی باتیں لوگوں سے کرتا پھرے۔"

"مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ وہ کیا بکتا ہے......"

ملک رحمت علی کی آنکھوں میں طنزیہ مسکراہٹ کا ننھا سا شرارہ کانپا "ابھی تو بات اُس کے اور میرے درمیان ہے۔ اور میں نے اُسے سختی سے منع کیا ہے۔ کہ کسی سے ذکر نہ کرے لیکن...... اگر حالات نہ سدھرے...... تو ظاہر ہے۔ میں اس کو روک نہیں سکوں گا۔"

"مگر ملک صاحب میں نے کب کہا کہ آپ اسے روکیں۔ اُسے کہنے دیں جو وہ کہتا ہے۔"

"جی نہیں آپ نے تو نہیں کہا۔ مگر ہمارا بھی تو کوئی فرض ہے نا کہ آپ کی عزّت کا خیال رکھیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ آپ اُسے معاف کر دیں گے تو بات بالکل باہر نہ نِکلے گی۔"

اس نے معنی خیز نظروں سے اسلم کو دیکھا۔

"بات کونسی چھپی ہے جی" اسلم بولا "میں ابھی جا کر کھلی انکوائری کروں گا۔ اور سب کو پتہ چل جائے گا کہ وہ چور ہے۔"

"جی نہیں....." اس نے پھر گلا صاف کیا۔ اور ذرا رک کر احتیاط سے بولا۔

"میرا مطلب دُوسری بات سے ہے ——— وہ ابھی تک میرے سینے میں ہے۔ اور اِنشاء اللہ راز میں رہے گی ——— دِتو کا مُنہ میں خود بند کر لوں گا ——— میرا کہنا وہ ٹال نہیں سکتا۔"

اسلم نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تو وہ آنکھیں نیچی کر کے بولا "دِتو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے........ کہ...... کل سہ پہر کو جب اس کی بیوی باورچی خانہ میں کھانا پکا رہی تھی تو...... تو...... آپ نے...... (اُس نے گلا صاف کیا)...... یعنی کچھ زبردستی کی کوشش کی......"

اسلم ایک دم سُرخ ہو گیا۔ "یہ کیا بکواس ہے ملک صاحب۔"

"جی اب مجھے تو علم نہیں" ملک رحمت علی مصنوعی سنجیدگی سے بولا "دِتو یہی کہتا ہے۔"

"مگر یہ بکواس ہے —— بہتان ہے —— اس کی بیوی تو فاحشہ ہے —— بدمعاش ہے —— وہ تو...... وُہ تو...... رات کو خُود میرے کمرے میں چلی آئی تھی اور میں نے بڑی مُشکل سے اُسے دفع کیا۔" اسلم بے چارگی سے چلایا۔

"ہا ہا ہا" ملک رحمت علی زور سے طنزیہ ہنسا "آج کل تو یوسف زلیخا کے قِصّے نہیں ہوتے بادشاہو۔"

"مگر آپ نے کیسے یقین کر لیا اس کی بات پر۔" اسلم جزبز ہو کر بولا "وُہ جھوٹا ہے —— کمینہ ہے —— بدکردار ہے......" اور وُہ غُصّے میں کوستا ہُوا تیزی سے کمرے میں چکّر لگانے لگا۔

ملک رحمت علی آنکھوں میں دھیمی دھیمی مسکراہٹ لیے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے لاٹھی سنبھالی اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف چلا۔ نکلتے نکلتے تھوڑا سا رُکا۔ گردن موڑی۔ اور معنی خیز انداز میں بولا۔

"میں آپ کا خیر خواہ ہُوں —— میری بات مان لیں —— آپ جانتے ہیں کہ آپ یہاں نئے آئے ہیں۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ آپ کس قسم کے آدمی ہیں۔ اس لیے دِتو جو کہے گا۔ وُہ مانی جائے گی —— اگر آپ چاہیں تو بات راز میں رہ سکتی

ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور وہ باہر نکل گیا۔

اسلم کا خون اس دھمکی پر کھولنے لگا "تم سب ذلیل ہو۔ کمینے ہو۔ میں تمہیں ٹھیک کر دوں گا۔" وہ ہوا میں دروازے کی طرف گھونسے ہلاتا ہوا پکارا اور میز پر سے فونٹین پن اُٹھا کر جیب میں گھسیٹرتا ہوا باہر کو لپکا۔

ابھی سٹیشن سے کچھ دُور ہی تھا کہ گھنٹی بجنے لگی۔ گاڑی کا وقت بالکل قریب تھا۔ دیہاتی لوگ اپنی اپنی گٹھڑیاں سنبھالے لائن کے قریب ہو گئے تھے۔ دو چار قلی پلیٹ فارم کے کنارے بیٹھے تھے۔ عورتیں صندوقوں پر بیٹھی بچوں کو اپنے پاس روک رہی تھیں۔ ایک دو خوانچے والے ننانڈ کے پلڑوں میں سودا سجائے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ دو تین بچے نل مُنہ سے لگا کر پانی پینے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو اُن کے گریبانوں سے ہوتا ہوا پیٹ پر کُرتہ تر کر رہا تھا۔

اسلم تیزی سے کمرے کی طرف گیا۔ ٹیلیفون پچھلے سٹیشن سے ملایا تو گاڑی چل چکی تھی۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس نے ٹکٹ بابو کے کاغذات پر سرسری سی نظر ڈالی ٹکٹ بابو ایک دیہاتی کو یقین دلا رہا تھا کہ کرایہ ایک روپیہ پندرہ آنے ہی ہے۔ مگر دیہاتی کو اصرار تھا کہ وہ ہمیشہ ایک روپے بارہ آنے دیتا ہے۔

"اوئے بابا" اسلم دھاڑا "ٹکٹ لینا ہے تو لے، ورنہ چل ہٹ یہاں سے۔"

بُوڑھے دیہاتی نے جھٹ سے تین آنے رکھ دیے۔ جو اس نے پہلے ہی مُٹھی میں دبائے ہوئے تھے اور بڑبڑایا۔ "توبہ اللہ کیا زمانہ آگیا ہے۔"

"چل بھاگ" اسلم بولا "کھڑکی سے پرے ہو کر زمانہ دیکھیو۔"

ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اور اسلم ادھر متوجّہ ہو گیا۔

گاڑی آگئی اور اسلم اس کے ہنگامے میں کھو گیا۔

تھوڑی دیر بعد کراس والی دوسری گاڑی بھی پہنچ گئی۔ ٹیلیفون آیا تھا کہ اُس کا ایک ڈبہ اُتار کر دوسری گاڑی کے ساتھ لگانا ہے۔ کچھ وقت اُس میں لگ گیا۔

دونوں گاڑیاں چلی گئیں تو ایک ریلوے انجنیئر وہاں بھٹیلہ پر پہنچ گیا۔ اور اسلم دو گھنٹے ان کے ساتھ مصروف رہا۔ ان تمام ہنگاموں میں دِتو کے خلاف انکوائری کا کام التوا میں پڑ گیا۔ دوپہر کے قریب اسلم فارغ ہوا تو سوچنے لگا کہ دِتو کے خلاف کیا کارروائی کی جائے۔

سب سے پہلے اُس نے اپنے بُکنگ کلرک کو بُلایا اور اس سے پوچھا کہ کیا اُس نے کل دِتو کو پھل چراتے دیکھا ہے۔

کلرک نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کبھی پہلے دیکھا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"کبھی اس قسم کی شکایت سُنی ہے؟"

کلرک خاموش رہا۔

"دِتو کی شہرت کیسی ہے؟"

کلرک پھر خاموش تھا۔

اسلم نے دو چار سوالات اور بھی کیے اور سٹیشن کے باقی عملہ سے بھی پوچھا۔ مگر سب کا رویّہ اس قسم کا تھا کہ اس موضوع پر بات کرنے سے بچنا چاہتے تھے۔

تھوڑی انکوائری کے بعد اسلم کو اندازہ ہو گیا کہ دِتو کے خلاف کوئی بھی کھُل کر بات کرنے کو تیار نہیں۔ چنانچہ اُس نے مزید وقت ضائع کرنے کی بجائے ایک رپورٹ لکھی کہ اللہ دِتا کانٹے والا شہر میں پھل کی دکان کرتا ہے۔ اور کل میں نے اسے گاڑی میں سے پھل چراتے دیکھا ہے۔ اسے فوراً یہاں سے تبدیل کیا جائے۔ کیونکہ اس کاروبار میں یہاں کے بااثر لوگ بھی شامل ہیں۔ رپورٹ لکھ کر اُس نے ہیڈ کوارٹر کو بھجوا دی۔

پھر اُس نے دتو کو بُلوایا۔ تاکہ اس سے پوچھے کہ کوارٹر خالی ہوا یا نہیں۔ مگر وہ

غائب تھا۔ اسلم نے سوچا کہ اب یہ تبدیل تو ہو ہی جائے گا۔ اِس لیے بار بار کیا مُنہ لگانا۔ دو ایک روز پڑا رہنے دو اِسی جگہ اِسے۔ پھر خُود ہی چلا جائے گا۔

دو تین روز گزر گئے۔ دِتو صرف ڈیوٹی پر آتا اور پھر غائب ہو جاتا۔ اسلم قریباً سارا دن سٹیشن پر گزارتا تاکہ دِتو یا اللہ وصائی کا سامنا نہ ہو۔ ان دِنوں میں اُس نے لوگوں کے رویہ میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ گاڑی کے وقت سے کچھ پہلے اور کچھ بعد میں آ کر بیٹھنے والے درباری قسم کے لوگ غائب ہو گئے تھے۔ بازار میں کوشش سے سلام کرنے والے راہگیر اب ہاتھ اٹھانے کی بجائے اس کی طرف چبھتی ہوئی ٹکٹکی سے دیکھتے۔ عورتیں اُسے سڑک پر آتا دیکھتیں تو یا تو کسی گلی میں مُڑ جاتیں یا سڑک کے دوسرے کنارے ہو جاتیں۔ جن لوگوں سے اس کا سرکاری طور پر واسطہ پڑتا وہ کُچھ عجیب سے محتاط نظر آتے۔

اسلم جانتا تھا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ دتو ضرور لوگوں میں کوئی افواہ پھیلا رہا ہے مگر وُہ کیا ہے؟ اس کا اُسے علم نہ تھا۔ نہ معلوم وہی بات تھی جو ملک رحمت علی نے اسے کہی تھی یا کوئی اور تھی۔ بہر حال وہ کسی سے پُوچھنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ اِس طرح بدنامی اور بات بگڑنے کا زیادہ اِحتمال تھا۔ تین دن اسی اُلجھن میں رہا۔ اور ادھیڑ بُن کی وجہ سے فیصلہ نہ کر سکا۔ کہ دتو کو کوارٹر سے باہر نکالے یا نہیں۔

چوتھے روز جب گاڑی آ کر رُکی۔ تو اُس میں سے عُثمان اُترا۔ اسے ریلوے بورڈ کے مینیجر نے انکوائری کے لیے بھیجا تھا۔ اس کے پاس اسلم کی بھیجی ہوئی رپورٹ تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور بھی چیز تھی۔ یہ گاؤں کے کئی لوگوں کی طرف سے درخواست تھی۔ جس میں اسلم کے خلاف شکایت تھی کہ اس نے زبردستی اللہ وصائی کو ناجائز تعلقات پر مجبور کیا اور اسی وجہ سے دِتو کو تنگ کر رہا ہے۔

عرضی پر ملک رحمت علی کے دستخط نہ تھے۔ مگر اس کے مختارِ خاص مُنشی اور دیگر ملازموں کے تھے۔ دِتو، شو کے ماشکی اور شہر کے چند اور لوگوں نے بھی دستخط کیے تھے۔

درخواست میں اسلامی اخلاق کے نام پر حکومت کو نیک افسر بھرتی کرنے کی اِستدعا کی تھی۔

دُوسرے دن انکوائری شروع ہوئی۔ عثمان نے دِتو کے بیان لیے۔ اللہ وسائی کے بیان لیے۔ عرضی پر جن لوگوں کے دستخط تھے ان کو بھی بلاکر پُوچھا۔ ملک رحمت علی سے طویل بات چیت کی۔ اور بعد ازاں سارا معاملہ اسلم سے بھی زیرِ بحث رہا۔ اور یہ سارا سلسلہ تین دن تک چلتا رہا۔

اسی اثناء میں یہ بات شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ دِتو، شوکا اور ملک رحمت علی ہر جگہ لوگوں سے جاکر اپنی کہانی سُناتے جو اُنھوں نے عرضی میں لکھی تھی اور بڑے فخر سے کہتے کہ انکوائری اُنھوں نے کروائی ہے۔ اور اب چند دن بعد سٹیشن ماسٹر تبدیل ہو جائے گا۔ چھوٹے سے قصبے میں اِتنی بڑی بات چُھپی کیسے رہتی۔ لوگوں کی باتیں کندھے اُچک کر ایک سے دُوسرے تک گئیں۔ اور عورتوں کی کُھسر پُھسر کے ذریعے سات تہ خانوں میں چُھپی ہوئی کنواریوں کو اصل قِصہ سے بہت زیادہ باتیں پتہ چل گئیں۔ اللہ وسائی شہر میں نکلتی تو مرد اُسے نفرت سے دیکھتے۔ جوان لڑکیوں کے مُنہ میں پانی بھر آتا۔ اور عورتیں" دفع۔ دفان" کہنے کے باوجود آنکھوں کے کونوں اور پلو کی آڑ سے اُسے دُور تک دیکھتی رہتیں۔

سٹیشن ماسٹر اتنے دن باہر نہ نکلا۔ وہ زیادہ تر اپنے کوارٹر میں رہتا۔ جہاں عثمان اس کے پاس ٹھہرا تھا۔ اور اِس بات پر خوش تھا کہ اس کی رپورٹ پر دِتو کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے۔ اب دِتو کو کوارٹر سے نکالنا بے سود تھا۔ انکوائری میں دُودھ کا دُودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ اور پھر دِتو خُود ہی تبدیل ہو جائے گا۔ گو ملک رحمت علی گاؤں میں ڈنکے کی چوٹ کہتا تھا کہ وہ دتو کے ساتھ ہے۔ اور کوئی مائی کالال اُسے تبدیل نہیں کر سکتا۔ وہ شہر کے لوگوں سے بھی بار بار کہتا تھا کہ سرکاری نوکر تو باہر کے لوگ ہوتے ہیں۔ آج یہاں کل وہاں۔ مگر ہم سب نے تو یہاں رہنا ہے۔ اِس لیے سب دِتو

کی حمایت کریں۔ خواہ مخواہ کیوں باہر والوں کی وجہ سے آپس میں ناچاقی ہو۔
انکوائری ختم ہو گئی۔ عثمان چلا گیا۔ لوگوں کی چہ میگوئیاں مدھم پڑ گئیں ــــــ ایک ہفتہ بعد اُوپر سے آرڈر آیا کہ اسلم انکوائری میں بے قصور ثابت ہوا تھا۔ اور دِتّو کو فہمائش کی گئی تھی۔ کہ اگر اب اس کے خلاف پھل چرانے کی شکایت آئی تو اُسے برطرف کر دیا جائے گا۔ اسلم کو تھوڑا ملال ضرور ہوا کہ دِتّو کا تبادلہ کیوں نہیں ہوا۔ مگر پھر بھی اُسے خوشی تھی کہ وہ بے قصور ثابت ہو گیا ہے۔ کرسی کی پُشت پر پھیلتے ہوئے اُس نے زور سے انگڑائی لی اور بڑبڑایا۔
"بالآخر حق کی فتح ہوتی ہے۔"
اُس نے آرڈر کی کئی ایک نقول کرا کر سٹاف کو بانٹ دیں سٹیشن پر مختلف جگہوں پر چسپاں کر دیں۔ اور شہر کے معتبر لوگوں کو بھجوا دیں۔ ایک نقل بذریعہ ڈاک ملک رحمت علی کو بھجوا دی اور بڑے سکون سے شام کو گھر واپس آ گیا۔
اب اسلم شہر میں نکلتا تو خواہ مخواہ لوگوں سے بات کرنے ٹھہر جاتا۔ اور بات کو ہیر پھیر کر انکوائری کی طرف لاتا۔ پھر بتاتا کہ وہ خود بے قصور ثابت ہو گیا ہے۔ اور یہ سب دِتّو اور ملک رحمت علی کی شرارت تھی۔ وہ یہ سب کچھ بڑے فخر سے بتایا کرتا۔ کیونکہ پچھلے کئی سالوں سے پھل کی چوری ہو رہی تھی۔ اور دیگر قواعد کی خلاف ورزی ہو رہی تھی۔ اور اس نے آ کر یہ روک دیا تھا۔ مگر لوگوں کے ردِ عمل سے اُسے صحیح پتہ نہ چلتا تھا کہ آیا وہ بے قصور سمجھتے ہیں یا ابھی تک اللہ وصائی کا آشنا سمجھتے ہیں۔ کچھ دن بعد اُسے عجیب سی بے چینی ہونے لگی کیونکہ وہ محسوس کرتا تھا کہ لوگوں کے سلاموں میں اب اُس کے لیے وہ احترام نہیں جو پہلے تھا۔ اور ملنے والوں کی بے تکلفی میں بھی ایک پردہ سا تھا۔
چند روز بعد اسلم ڈیوٹی پر تھا۔ صبح کی ٹرین پلیٹ فارم کے ساتھ داخل ہو رہی تھی کہ اُسے گارڈ کے خانے میں رشید بھی نظر آیا۔ یہ اس کا سکول کا دوست تھا۔ اور اب ریلوے میں کام کرتا تھا۔ گاڑی رُکتے ہی وہ دوڑا گیا اور جا کر رشید کے گلے لگ گیا۔

"ارے ظالم بڑے دن بعد نظر آئے۔ کہاں گم رہتے ہو؟"

"میاں تمہاری شہرت کے غبار تلے چھپا تھا۔ ہم غریبوں کو کون جانتا ہے۔"

"کیسی شہرت؟"

"اچھا اتنے بڑے بڑے سعر کے بھی مارتے ہو۔ اور پھر ہم سے پوچھتے ہو۔"

"چلو بکواس نہ کرو اور آکر چائے پیو۔"

"چائے پینے کون آیا ہے۔ ہم تو تمہارا حرم دیکھنے آئے ہیں۔"

دونوں ہنسنے لگے۔ اسلم بھی مذاق کا جواب مذاق سے دیتے ہوئے بولا "تم جیسے نامحرم تو ہمارے حرم میں نہیں آسکتے۔"

"ارے واہ" رشید اس کی پیٹھ پر دھپ مار کر بولا "انکوائری آفیسر تو نامحرم نہیں اور ہم نامحرم ہیں ؟؟؟ ایں؟"

اسلم جھینپ گیا۔ اور رشید قہقہہ مارنے لگا۔ وُہ کمرے کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اور اندر جاکر چائے پینے لگے۔

رشید نے چائے کی لمبی چسکی لی۔ سٹول گھسیٹ کر ٹانگیں اُس پر رکھیں۔ کرسی کی ٹیک پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں اور گھونٹ نگل کر بولا:

"بڑی عمدہ چائے ہے ــــــ یار سچ بتانا۔ اُس نے بنا کر بھیجی ہے؟"

"کیا بکواس کر رہے ہو۔" اسلم مصنوعی غصّے سے بولا۔ "اُس لے کس نے؟"

"اللہ قسم عثمان بڑی تعریف کرتا تھا اُس کی ــــــ کہتا تھا کیا ہاتھ مارا ہے ظالم نے ــــــ سچ مانو وُہ تو ابھی تک نشے میں ہے۔"

اسلم "فضول بات" کہہ کر چائے پینے لگا۔

"ایک بات بتاؤ اسلم" رشید پیالی رکھ کر بولا "سکول کے زمانے میں تو تم بڑے صوفی، مولوی، پرہیزگار، عبادت گزار اور پتہ نہیں کیا کیا ہوتے تھے۔ مگر بھئی اب کے تو تم نے کمال کر دیا۔"

"میں تو اب بھی صوفی ہی ہوں۔"

"ہاں ہاں۔ ضرور ہو۔ مگر۔۔۔۔۔" رشید اُنگلی سے میز بجا کر گانے لگا۔

"مجھ سے پہلی سی عبادت میرے اللہ نہ مانگ"

اسلم بھی ہنسنے لگا۔ رشید کافی دیر تک اِس قسم کی چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ اسلم پہلے تو مذاق سمجھتا رہا۔ مگر بعد میں رشید نے سنجیدگی سے بتایا کہ ہیڈ کوارٹر کے عام لوگوں کا خیال یہی ہے کہ چونکہ عثمان خود بھی ان معاملوں میں تیز ہے۔ اِس لیے اسلم نے عثمان کو بھی اللہ وصائی سے مستفید کروا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس نے یہ رپورٹ دی ہے

اسلم کے تن سے ایک دم جان نکل گئی۔ اس کی آنکھیں پیالی میں گڑی رہیں۔ رنگ سُرخ ہو گیا۔ اور دماغ میں بُلبلے سے اُٹھنے لگے۔ اُس نے ایک دم چائے کا بڑا سا گھونٹ لیا تو گلے میں گرم سا گولہ دیواروں کو دھکیلتا ہوا نیچے اُتر گیا۔ اور وُہ آنکھیں جھپک کر رشید کی غلط فہمی دُور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

رشید تو قائل ہو گیا۔ مگر اُس کا خیال تھا کہ محکمے کے عام لوگوں کے دِل سے یہ خیال نکالنا قریباً قریباً ناممکن تھا۔ کیونکہ ساری انکوائری کے باوجود اللہ دتّہ اب بھی اُسی جگہ تھا۔

"وُہ تو ملک رحمت علی کے رسُوخ کی وجہ سے ہے۔" اسلم بولا۔

"اب کسی کو کیا پتہ کہ وہ تمہارا رسُوخ ہے۔ یا ملک رحمت علی کا؟"

اسلم نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

اسلم سارا دن رشید سے بات چیت کرتا رہا۔ مگر اس کا دماغ ماؤف سا تھا جیسے وہ صرف اُوپر کی سطح سے سوچ رہا ہے۔ اور اس سے نیچے سب کچھ سُن تھا۔

شام کی گاڑی سے رشید واپس چلا گیا۔ اسلم نے بڑی بے دلی سے کاغذات مکمل کیے۔ ضابطے کی باقی چیزوں سے فراغت کی۔ اور پھر بوجھل قدم گھسیٹتا اپنے کوارٹر کو چلا۔ پلیٹ فارم کے آخری سرے پر بکنگ کلرک نے پیچھے سے آواز دی۔ اسلم نے

مُڑ کر دیکھا تو وُہ ایک خط دکھا رہا تھا۔

"یہیں لے آؤ۔" اسلم نے لٹکی ہُوئی آواز میں کہا اور ڈھیلا سا کھڑا ہو گیا۔

کلرک خط لے آیا۔ اسلم نے دیکھے بغیر جیب میں ڈال لیا۔ کیونکہ اس کا کسی کام پر دل نہ لگتا تھا۔

کمرے میں جا کر اُس نے لیمپ روشن کیا۔ اور کپڑے تبدیل کیے بغیر دھم سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میز پر کہنیاں ٹکا کر دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر وُہ سوچنے لگا۔ رشید کے مذاق۔ محکمے کے لوگوں کے اندازے۔ شہر کے لوگوں کی نظروں میں احترام کی کمی۔ دتو کا گستاخانہ رویّہ۔ اللہ وصائی کی حرکات ـــــــ یہ سب خیالات اس کے ذہن میں باری باری سر اُٹھا رہے تھے۔ جیسے تیز بارش میں پکّے فرش پر بُلبلے اِدھر اُدھر سے نمودار ہوتے ہیں تھوڑا تیرتے ہیں اور غائب ہو جاتے ہیں۔

وُہ سوچنے لگا۔ سوسائٹی کیا ہے؟؟ ـــــ میں کیا ہُوں؟؟ ـــــ کردار کیا ہے؟؟ یہ میرا اپنا طرزِ عمل ہے یا میرے بارے میں لوگوں کا تاثّر ہے؟؟؟ ـــــ نیکی یا بدی میں خود کرتا ہُوں یا سوسائٹی مجھ سے کراتی ہے؟؟؟ ـــــ

نہ معلوم کتنے ہی سوال آندھی کے بگولوں کی طرح اس کے دماغ میں آئے۔ اور اُن کو دُوسرے بگولے دھکیل کر لے گئے۔ کسی وقت اُسے اللہ وصائی کا جسم اور رات کی تنہائی یاد آتے تو ایک ہلکا سا پچھتاوا اس کے دماغ میں رینگنے لگتا کہ جب لوگ اس کے بارہ میں یہی خیال کرتے ہیں تو اس نے یہ موقعہ کیوں گنوایا؟ اگر وہ دُنیا کی نظروں میں بدکردار تھا تو اُس کی اپنی نیکی کس کام کی ہے؟؟؟

کافی دیر تک وُہ ایسے ہی گم سُم رہا۔ لیمپ کی روشنی میں اس کے چہرے پر جا بجا تاریکی کے گڑھے تھے اور وُہ کسی بُت کی مانند بے جان بیٹھا تھا۔

معاً اُسے خط کا خیال آیا ـــــ اُس نے جیب سے نکالا ـــــ چاک کیا ـــــ کڑکڑاتا ہُوا کاغذ کھولا۔ تو اُس کی بیوی کی تحریر آنکھوں کے سامنے

ناچنے لگی :

میرے سرتاج سلامت رہو۔

کل میں عثمان کی بیوی سکینہ سے ملی تھی۔ اُس نے بتایا کہ عثمان صاحب کسی انکوائری کے سلسلہ میں تمھارے پاس آئے تھے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا کہ تمھارے خلاف بھی ایسے الزام ہو سکتے ہیں۔ اور پھر ——— سچ بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ انکوائری میں ثابت ہو گیا تھا۔ مگر عثمان نے محض تمھیں بچانے کی خاطر یہ رپورٹ دی کہ الزام غلط ہے۔ حالانکہ اُسے انکوائری میں یقین ہو گیا تھا کہ تمھارے اُس عورت . . . .''

اسلم آگے نہ پڑھ سکا۔ ''عورت'' کا لفظ پھولنے لگا ——— سطریں ہولے سے تیرنے لگیں ——— الفاظ ایک جھٹکے سے درہم برہم ہو گئے ——— اور آنسو کے قطرے اُس کی پلکوں پر لرزنے لگے۔

خط میز پر رکھا تھا۔ سامنے لیمپ تھا۔ خط کے دونوں طرف اسلم کی کہنیاں ٹکی تھیں۔ ہاتھوں میں سر تھاما ہوا تھا۔ اور شیشے کے سے شفاف قطرے آنکھوں سے نکل نکل کر لیمپ کی روشنی میں ٹوٹتے تاروں کی طرح خط پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ نہ معلوم اسلم کتنی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا ——— لیمپ کے شعلے نے دو تین بے چین انگڑائیاں لیں۔ ایک دو بھبکے لیے اور تڑپ کر بجھ گیا۔ کمرے کی تاریکی میں ٹپ ٹپ کی آواز ٹھہر ٹھہر کر اُبھرتی ——— پھر وقفہ زیادہ ہوتا گیا ——— اور پھر یہ آواز بھی بند ہو گئی۔

کافی دیر اسی طرح سناٹے اور تاریکی میں گزر گئی

ایک ہلکی سی سرسراہٹ کمرے میں اُبھری ——— چارپائی چرچرائی

جیسے کوئی اٹھا ہے ——— پاؤں کی گھسٹتی ہوئی چاپ کھسکی ——— دیوار کو ٹٹولنے کی آہٹ ہوئی ——— ایک ہاتھ کھڑکی سے ٹکرایا ——— دو تین لمحے خاموشی رہی ——— اور ——— پھر کھڑکی پر تھاپ کی آواز تاریکی میں گونجنے لگی۔

(۱۹۶۳ء)

وقار

دو روز سے سعیدہ اپنی سب چنچل حرکات بھول چکی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ گلی کے بچے فوج مارچ کھیلنے میں اس کے ڈھول ڈھپے کے بغیر تنظیم نہیں قائم رکھ سکتے۔ اور نہ ہی پانی کے نل پر ہاتھ رکھ کر ان میں سے کوئی اتنی کامیابی سے دوسروں پر پانی کا فوارہ پھینک سکتا ہے جس طرح سعیدہ پھینکتی تھی۔ لیکن ان کے بار بار بلانے کے باوجود وہ سب کو گھڑک کر بھگا دیتی۔ اس کا برقعہ سِل رہا تھا۔ اور اسے قطعاً اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ بچوں کی قطار میں جا کر ہلڑ مچا سکے۔ کالی ہملٹن اس کے گھٹنوں پر بکھری تھی۔ اماں سے پوچھ پوچھ کر وہ نشان لگاتی۔ اور پھر تھوک میں بھگو کر دھاگا سوئی میں پروتی اور سر نیہوڑا کر سینا شروع کر دیتی۔ ننھے برقعے کے شوق میں اس کے ہاتھ جھپا جھپ چلتے گئے۔ کپڑے میں سے پھسل کر سوئی بازو بھر ہوا میں لہرا جاتی۔ دانت سے دھاگا

کاٹنے سے گردن کی نسیں اکڑ جاتیں کہ کہیں کپڑے کو تھوک نہ چھو جائے۔ اور چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو پورا پھیلا کر بار بار کپڑے کو سہلاتی کہ اس میں سلوٹ نہ پڑے۔ تین روز بعد جب برقعہ سل گیا تو وہ ہفتہ بھر نقاب لہراتی پھرکی کی طرح اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ ہمجولی بچّوں کے گروہ کے پاس سے گزرتی تو اندر ہی اندر ہنستی، زور سے برقعہ لپیٹ لیتی۔ اور جب کوئی قریب آتا تو ہاتھ نکال کر زور سے چٹکی لیتی۔ اور اگر وہ بدلہ لینا چاہتا تو برقعہ ایک طرف پھینک کر بیچ چوراہے میں اُس کی مرمّت کر دیتی۔

چند روز تو سعیدہ نے بڑے شغف سے برقعہ پہنا۔ لیکن اس کے بعد اس کا سارا چاؤ چوپٹ ہو گیا۔ کیونکہ برقعے کے باہر امّاں ایک اور خول چڑھانے پر تلی ہوئی تھیں۔ اور اسے بار بار یاد دلاتیں کہ بیٹی اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ برقعہ تک اوڑھنا شروع کر دیا ہے۔ اب بچپن والی اُچھل کود چھوڑ دو۔ لڑکیوں کو یہ زیب نہیں دیتا۔ وُہ دوپٹہ لیے پیچھے پیچھے پھرا کرتیں۔ پل بھر کو بھی تو اُسے نجات نہ تھی دوپٹے سے۔ کبھی امّاں صندوق کے پیچھے سے اُٹھا کر لا رہی ہیں۔ تو کبھی میلے کپڑوں کی الماری میں سے کھینچ نکالا ہے۔ کبھی سیڑھیوں کے کونے میں اٹکا ہوا ملا ہے تو کبھی تمباکو کی طرح باٹ کر کوٹھے کے عین درمیان پڑا ہے۔ دوپٹے سے تو وہ کسی نہ کسی طرح نپٹ لیتی لیکن امّاں کو تو جیسے اس سے ضد سی ہو گئی تھی۔ ہر وقت سنسر لگا رکھا ہے۔ اری رانڈ کسی وقت تو نچلی بیٹھ۔ کیوں منڈیر پر سے جھانک جھانک کر پیٹ گھسا رہی ہے۔ سیڑھیوں پر چڑھنا ہے تو آہستہ چڑھ۔ یہ کیا سٹرک کوٹ رہی ہے ——— اری مُردار تیری عُمر ہے اب رسّی کودنے کی ——— جا رکھ دے رسّی اُدھر لکڑیوں والی کوٹھڑی میں۔ اور خبردار جو اب بھنتے چنے کی طرح اُچھلی ——— اری کیا ہو گیا تجھے، مُنّے کو کھلانا ہے تو آرام سے کھلا۔ یہ کیا گھنٹے بھر سے اُسے بھینچ رہی ہے۔ ——— مرجائے تو، یہ ستون کے ساتھ چمٹ کر اُوپر کیوں چڑھ رہی ہے۔ ساری سفیدی کا ستیاناس کر ڈالے گی ——— توبہ اللہ لڑکی ہے یا چھلاوہ۔ پھر تو

نے مارا جمن کی چند با پر طمانچہ کیڑے پڑیں تیرے ہاتھوں میں ——— یا اللہ مجھے موت دے یا اس کلموہی کو۔ اری تیرے لیے اب کسی بزاز سے یاری لگاؤں جو ہر روز سکول سے کپڑے پھاڑ آتی ہے۔ کیوں دھینگا مشتی کرتی ہے اتنی، کبھی گریبان لٹکا ہے تو کبھی پائنچے کا پھریرا بنا ہے۔ دوپٹہ ہے تو وہ تار تار۔ روز روز نئے کفن کی ضرورت ہے اسے۔ اس لڑکی کا تو رواں رواں اچھلتا ہے، حالانکہ قد میں مجھ سے دو ہاتھ اوپر ہی ہے۔ نامراد شیشے میں اپنا جسم اور حرکتیں دیکھ۔

اماں کی جھڑکیاں بالآخر رنگ لائیں۔ سعیدہ کے تھرکتے بازوؤں کو بظاہر سکون مل گیا تھا دوپٹے کا حلقہ دن بدن چہرے کے گرد تنگ ہونے لگا۔ اور اس کی تڑ تڑاتی ہوئی حرکتوں میں کچھ ٹھہراؤ سا پیدا ہو گیا۔ جیسے شوخ ندی کے سامنے بند سا لگ جائے۔ اور پانی کی سطح بالکل ہموار ہو جائے۔ گو سطح کے نیچے رو ئیں اب بھی مچلتی تھیں۔ ننھے ننھے بھنور گھومتے تھے۔ اور مچھلیاں سپاٹے بھرتی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی بلبلا سطح پر سر اٹھاتا تو اماں کی نوکیلی نظروں سے ٹکرا کر پھٹ جاتا۔ جمن سر منڈواتا تو ایک چپت کا عزم اب بھی اس کے ہاتھ کھجلانے لگتا۔ منے کو بھینچنے میں اب بھی وہ فرحت محسوس کرتی۔ بچیوں کو رسی کودتے دیکھ کر اس کا خون بھی تال سے حرکت کرنے لگتا۔ ہوادار کوٹھے کی وسعت سے اس کی پنڈلیوں میں اب بھی کبوتر سے اڑنے لگتے۔ لیکن یہ سب کچھ ساکت جسم کے اندر ہوتا۔ جیسے بظاہر پرسکون کیتلی کے اندر پانی تیزی سے ابل رہا ہو۔ شوں۔ شوں۔ شوں۔ اسی طرح اس کا جسم بالکل پرسکون اور ساکت رہتا، لیکن اس کے دل و دماغ میں ایک مسلسل شوں، شوں گونجتی رہتی۔

"سعیدہ۔ اری۔ سعیدہ۔" اور وہ سوتی بن گئی۔ اسے پتہ تھا کہ اماں کسی کام کے لیے تو بلا نہیں رہیں محض پرکھنا چاہتی ہیں۔ کیونکہ جب سے اماں کی سہیلی گئی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھیں۔ لیکن بظاہر بڑی لاتعلقی ظاہر کر رہی تھیں۔ بچی تو تھی نہیں۔ بیسیوں سہیلیوں سے ایسی وارداتوں کے متعلق دبی گھٹی ہنسی کے درمیان

بات چیت کر چکی تھی۔ اسے کچھ شک پڑ گیا۔

"سو رہی ہے۔" ابا بھی دھوکا کھا گئے۔

پھر امی نے سارا دفتر کھول دیا۔ سہیلی کی شہادت سے لڑکے کا حلیہ بیان کر ڈالا۔ گورا چٹا۔ اونچا لمبا۔ وجیہہ وغیرہ وغیرہ۔ تین سو تنخواہ۔ نیا نیا پروفیسر۔ ترقی کی اُمید۔ اسے امی کے بتانے کا انداز بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ گویا لڑکے کو اپنی تسبیح میں پرو لیں گی۔ لیکن ابا دم سادھے حقّہ گڑگڑا رہے تھے۔

"میں تو برادری میں کروں گا۔" وہ بالآخر بولے۔

"یہ تو مجھے پتہ ہے۔ لیکن برادری میں اب لڑکا کون سا ہے۔ سعیدہ سے سب چھوٹے ہیں یا بچپن سے بندھ گئے ہیں۔ میں تو خود کہتی تھی کہ بچپن میں ہی اسے بڑی خالہ کے ہاں مانگ دیتے۔ لیکن اُس وقت بھی تمھارے اصول رکاوٹ بن گئے۔" سعیدہ کا رواں رواں تن گیا۔ ابا نے حقّے کی گڑگڑ پر ساری برادری ذہن میں کھنگال ڈالی لیکن کوئی جواب بن نہ آیا۔

"برادری نہ سہی باہر ہی سہی۔ لیکن ہوں تو سیّد۔ میں تو سیّدوں کے علاوہ کہیں نہیں کروں گا۔ ہر خاندان کا اپنا وقار ہوتا ہے۔" ابا کا جواب بھی فیصلہ کُن تھا اور امی بھی پچانوے فی صدی اس خیال کی حامی تھیں۔ وہ فوراً قائل ہو گئیں۔ اور پھر پھر کرتی چلیں صراحی کی طرف۔ دو گلاس پانی نے سارا جوش ٹھنڈا کر دیا۔ اور وہ عشا کی نماز ضائع جانے کا افسوس کرتی ہوئی خراٹوں میں گھٹنے لگیں۔

اس روز سے سعیدہ کے اندر ہونے والی شوں شوں ختم سی گئی۔ اور اس کی جگہ انتظار نے لے لی۔ جیسے کیتلی کا پانی اُبلنے سے پہلے اُسے آگ سے ہٹا لیا جائے اور بلبلے باہر آنے کو دم سادھ لیں۔ ایک سُلگتی ہوئی انتظار اس کے جلتے ہوئے خون میں گھلنے لگی۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک تارا ٹوٹے تو نظریں خواہ مخواہ آسمان کی طرف لگی رہتی ہیں اور پھر اگلے چند سالوں میں سعیدہ کی آنکھیں اُوپر اُٹھی رہیں اور تارے ٹوٹتے

رہے۔ ایک کے بعد دُوسرا۔ تیسرا۔ چوتھا۔ پانچواں۔ چھٹا۔۔۔۔

صغیرہ کی امی آئیں۔ سعیدہ کے سر پر لمبے لمبے پیار دیے۔ اماں کے ساتھ کانوں میں بحث کرتی رہیں اور اماں خواہ مخواہ سعیدہ کو دُوسرے کمرے میں کام بتاتی رہیں لیکن امّی نے ابّا کا پڑھایا ہُوا سبق خُوب رٹا ہُوا تھا۔ جب صغیرہ کی امّی واپس گئیں تو اُنھوں نے سعیدہ کے سلام کا جواب بھی نہ دیا۔ پیار تو ایک طرف رہا۔

کراچی سے بڑی خالہ کی چِٹھی آئی۔ جو امّی نے خلافِ معمُول سعیدہ کی بجائے ابّا سے پڑھوائی۔ چند روز امّی اور ابّا وقتاً فوقتاً دبے الفاظ میں اس چِٹھی کا ذِکر کرتے رہے۔ لیکن چند روز بعد جب ابّا اس کا جواب لکھنے بیٹھے تو ان کے چہرے سے خاندانی وقار ٹپک رہا تھا۔ اور سعیدہ پھر مایوس ہو گئی۔

خالہ پٹھانی امّی کی پُرانی سہیلی تھیں۔ اکثر آتی تھیں۔ ایک دفعہ تین روز ان کے ہاں رہیں۔ لیکن اس کے بعد نہ آئیں۔ ایک روز سعیدہ نے ان کی ناراضگی کی وجہ پُوچھی تو امّی جُھک کر مشین کی سُوئی میں دھاگا ڈالنے لگیں۔ "بیٹی سیّدوں اور پٹھانوں کا کیا مِلاپ"۔ اس غوطے میں سے اُنھوں نے جواب دیا۔ اور سعیدہ خاموش ہو کر اپنے بُرقعے کا پلیٹ کھولنے لگی جو اب کافی تنگ ہو گیا تھا۔۔۔۔

برادری میں کسی کی شادی ہو رہی تھی۔ دھپ۔ دھپ۔ دھپ ڈھولک پکاری شوں۔ شوں۔ شوں۔ سعیدہ کے اندر بُلبلے پھُوٹے۔ شادی کی خوشی میں پابندی کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ سعیدہ بھی کھُل کھیلی۔ "آؤ ری کِکلی کھیلیں"۔ وہ ہاتھ پھیلاتے ہُوئے پکاری۔ ایک اور شوخ سی چیز، ہاتھ پھیلائے، جھُومتی ہوئی آگے لپکی اور پاؤں کے مرکز کے گرد ہوا میں لہراتی چوٹیوں کے دائرے گھُوم گھُوم گئے۔

"با۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ بس۔" اُس کی پارٹنر ہانپ گئی۔

"ارے تھک بھی گئیں؟" سعیدہ ہاتھوں سے تالی بجا کر بولی۔

"لو بیٹی اب ہر اک کی تمھارے جیسی صحت تو نہیں ہوتی۔ ماشاءاللہ! تم کیوں

تھکنے لگیں۔" ایک تماشبین بی بی بولیں۔ سعیدہ نے اندرونی غرور سے اپنے صحت مند سراپا پر چور نظر ڈالی اور بازو جھلاتی دو چھلانگوں میں لڑکیوں کے ایک گروہ میں دھنس گئی۔ اگلے لمحے اس کا قہقہہ سب سے نمایاں کھنک رہا تھا۔

"ہا چھپکلی" سعیدہ نے ربڑ کا چھوٹا ٹکڑا لڑکیوں پر پھینکتے ہوئے بہلاوا دیا۔ چیں۔ چاں۔ اوئی۔ ہائے اللہ۔ ایک بھگدڑ مچ گئی۔ اِدھر اُدھر سے دو ایک بوڑھیاں لپکی آئیں۔ سعیدہ ہنستی ہنستی لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

"ہائے بیٹی کچھ عقل کرو۔ تم کیوں سینگ کٹا کر بچھڑوں میں مل رہی ہو۔ اپنی ہم عمروں میں بیٹھا کرتے ہیں بیٹی۔" ایک بڑی بی بولی۔ سعیدہ ہلدی ہوگئی۔

"کون ہے یہ؟" خود ساختہ قسم کی نانی دادی نے پوچھا۔

"اپنی صالحہ کی لڑکی ہے یہ۔"

"اچھا بیٹی جیتی رہو۔ شادی تو ہوگئی ہوگی تمھاری۔ کتنے بچے ہیں اس وقت؟" اور سعیدہ گلنار ہوگئی۔

"ابھی تو نہیں ہوئی شادی۔" کسی دوسری نے اِطلاع بہم پہنچانے کا نسوانی فرض پورا کیا۔

"ہائے اللہ میں مرگئی۔ ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔" کسی اور بوڑھی کا تعجب پھٹ پڑا۔" ہائے تو کیا صالحہ بڑھاپے میں اس کا سہاگ رچائے گی۔ میری رشیدہ اللہ رکھے اس سے تین سال چھوٹی ہے اور اس وقت ماشاءاللہ چار بچوں کی ماں ہے۔" اُس نے ایسے فخر سے کہا جیسے اُس کی بیٹی ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کر چکی ہو۔ سعیدہ کی خوداعتمادی جھر جھر جھڑ گئی۔ وہ دبے پاؤں کھسک گئی۔ اور دلہن کے کمرے میں پناہ لی۔

لیکن وہاں تو ہر طرف آئینے ہی آئینے بکھرے پڑے تھے۔ کوئی چھوٹا، کوئی بڑا۔ کوئی چوکور، کوئی گول۔ اس کی آنکھیں سوالیہ نشان بن کر ایک آئینے میں کھب گئیں۔

کیا وُہ واقعی اِتنی بڑی ہو گئی تھی ؟ یہ سوال اس کے ہر رگ و پے میں گنبد کی صدا کی طرح گُونج رہا تھا۔ آئینے میں عکس کے پکّے پکّے نقوش نے اثبات میں سر ہلایا۔ اُس نے آئینہ بے دلی سے پھینک دیا اور ڈھیلی سی ہو کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

" باجی آپ کیوں رونق سے اُٹھ کر اندر آ گئیں ؟ " دُلہن نے رسمی طور پر پوچھا۔ باجی؟ باجی؟؟ باجی؟؟؟ اس کے دماغ میں کئی چکّر چل گئے۔ شادی' ہونے والی لڑکی کے مُنہ سے باجی کا لفظ سُن کر اُسے ایکدم ایسا محسوس ہُوا جیسے اس کا چہرہ جُھریوں سے پَٹ رہا ہے۔ باہر سے ڈھولک کی آواز نے اس کے دِل پر گھونسے مارنے شروع کر دیے۔

"بس یوں ہی۔" وہ اپنی مرضی کے خلاف بولی اور نفرت بھری نظروں سے اپنے صحت مند جسم کو جھنجوڑ ڈالا۔

دن گزرتے گئے۔ سعیدہ کی ارمان بھری اُمنگوں میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ وُہ مایوسی اور اِنتظار سے آسمان کو تکتی رہی۔ تارے ٹوٹتے رہے۔ لیکن اس کے ابا کے خاندانی وقار پر کوئی اثر انداز نہ ہو سکا۔ آہستہ آہستہ آسمان پر بادل چھا گئے۔ تارے ٹُوٹنے بند ہو گئے۔ امّی کی فکر گہری ہونے لگی۔ وُہ پیر وارث شاہ کے مزار پر ابا سے چوری تیل بھجوانے لگیں۔ نماز کے بعد ان کی دُعائیں لمبی ہونے لگیں۔ کسی شادی والے گھر جاتیں تو دُلہن کے دوپٹے کا تار یا قمیص کا دھاگا چپکے سے نِکال لاتیں۔ اور رات کو سوتی ہُوئی سعیدہ کے سرہانے جلا کر دُعائیں مانگا کرتیں۔

سعیدہ کواڑ سے لگی کھڑی تھی۔ ابا کا کوئی کوئی فقرہ سُنائی دیتا تھا۔" افریقہ چلا گیا تھا . . . . . پندرہ سال بعد واپس آیا ہے . . . . . دُور سے اپنی برادری ہے . . . . . اُس کا چھوٹا لڑکا ہے . . . . پڑھا لکھا تو نہیں کاروبار کرتا ہے . . . . . سب بات طے ہو چکی ہے۔"

" اے مجھے دکھایا تو ہوتا لڑکا۔" امّی بولیں۔

"چلو چھوڑو اب دیکھنا دکھانا۔" ابا بولے "میں نے دیکھا ہے۔ بس ذرا چھوٹے قد کا ہے۔ لیکن ان معمولی باتوں کی وجہ سے سیّد رشتہ تو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ پہلے ہی لڑکی کی عمر کافی ہو گئی ہے۔ اور وقت گزر گیا تو ممکن ہے کہیں بھی شادی نہ ہو سکے۔ اور پھر اپنی سیّد برادری کا لڑکا ہے۔ خاندانی وقار بھی تو قائم رہے گا۔"

پھر صندوقوں کی نچلی تہوں سے نوح کے وقت کے کپڑے نکال کر انھیں دھوپ لگوائی گئی۔ صحن میں گوٹہ کرن اور لپیے کی چمک ناچنے لگی۔ گھر کے بھاری برتن صدیوں بعد کھنکنے لگے۔ سفیدیاں پھریں۔ چاندنیاں بچھیں۔ برتن قلعی ہوئے۔ اور ایک شام ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ سعیدہ کمرے میں بند ہو گئی۔ جیسے گاہک کو دینے سے پہلے دکاندار بکی ہوئی چیز لفافے میں ڈال کر پیسے گننے لگتا ہے۔

برات کی آمد سے پہلے مردانے میں بیٹھے ہوئے بوڑھوں نے ابا کو پھلا ڈالا۔

"بھئی شاباش ہے تمھاری۔ اکتیس سال لڑکی کو بٹھائے رکھا لیکن غیر برادری کو نہ دی۔"

"سیّدوں کی لاج رکھ لی تم نے۔" کوئی لاج والا بولا۔

"سیّدوں کی نسل اللہ نے چاہا تو خالص ہی رہے گی۔" بزرگ بدتمیز بھی تو ہوتے ہیں نا۔ اور ابا کی مونچھیں کانوں تک چڑھ گئیں۔

"نہ رو بچی۔" وہ وداعگی کے وقت سعیدہ کو گلے لگا کر بولے۔ "شکر کرتا ہوں میں نے خاندان کے وقار پہ حرف نہیں آنے دیا نسل میں خیانت نہیں کی میں نے۔"

"کتنے اچھے ہیں میرے ابا۔" سعیدہ کی ہچکیاں سوچ رہی تھیں۔

نئے گھر میں سعیدہ کو سب آرام میسّر تھے۔ خود اس کا شوہر بھی اس کے آرام کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ لیکن سعیدہ کو پتہ نہ چلتا کہ وہ شوہر کو دیکھ کر ہنسے یا روئے۔ بالکل بونا سا لڑکا نما آدمی، داڑھی کی کالک پونچھ ڈالو تو جانو جیسے سکول کا بچّہ ہو۔ سعیدہ کے کندھوں سے بھی بالشت بھر نیچا ہی ہو گا۔ دُبلا۔ پتلا۔ لاغر۔ بچپن میں غالباً کسی بیماری

کی وجہ سے نشو و نما رُک گئی تھی۔ سعیدہ نے اس کے ساتھ باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ لوگ میاں بیوی کی بجائے ماں بیٹا سمجھتے تھے دونوں کو۔

اماں آبا ویسے تو بڑے جہاندیدہ تھے۔ اُٹھتے بیٹھتے اپنے تجربے کا ڈھنڈورا پیٹتے۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ سعیدہ شادی کے بعد اِتنی تبدیل کیوں ہو گئی ہے۔ عام لڑکیاں تو شادی کے بعد پٹاخہ بن جاتی ہیں۔ ایک عالم سے ٹکر لینے کو تیار، اُنگلیوں میں بجلیاں ناچیں، قہقہے عرش سے ٹکرائیں۔ اور زبانیں سڑاپ سڑاپ بھاگیں۔ لیکن سعیدہ تو جیسے سب کچھ ہی بھول گئی۔ وُہ چارپائی پر سیدھی لیٹی لمبے لمبے سانس لیتی رہتی۔ بھرے بھرے بازو تھکاوٹ سے بوجھل رہتے۔ اور صحت مند جسم ایسے ٹوٹتا جیسے خُون کے قطرے آپس میں لڑ رہے ہوں۔

"بچاری کو اولاد کا غم کھاتا ہوگا۔ تین سال ہو گئے، اللہ نے رحمت نہیں کی۔ میں تو جانوں کسی نے کچھ کر دیا ہے۔" اماں قیاس لگاتیں۔ اور پھر تعویذوں کی تلاش میں شہر بھر کے مزاروں پر گھوم جائیں۔

اس کا شوہر بھی اس سے نالاں رہتا تھا۔ سارا دن کاروبار کرنے کے بعد شام کو گھر واپس آتا تو سعیدہ خاموشی سے اُسے کھانا وغیرہ کھلاتی۔ اور جو اس نے کوئی بات پُوچھ لی تو "ہوں، ھاں" میں جواب دے دیا۔ اور وُہ حیران ہوتا رہتا کہ اِتنی صحت مند لڑکی کی زبان اتنی سُست کیسے ہو سکتی ہے۔

لیکن نوکروں کو اس کی زبان کا تجربہ تھا۔ وُہ ہر وقت پناہ ڈھونڈتے رہتے۔ ماما تو سارا دن جل تُو جلال تُو پڑھتی رہتی۔ اس کی اُنگلی ہلی اور مالکن برس پڑی۔ کئی کئی پشتیں جھڑکیوں کی لپیٹ میں آجاتیں۔ "نہ جانے مالک کو کیا پڑی جو ایسی بدمزاج سے شادی کر لی۔" وُہ خانساماں کو جا کر کہتی اور خانساماں کانوں پر ہاتھ رکھ کر توبہ توبہ پکار اُٹھتا۔

"بس پوچھو ہی نہ تم۔ دن پُورے کیے جاؤ۔ اس کی بدمزاجی تو اللہ کو بھی نہ چھوڑے چُھری جبراً جو رسے رکھوں تو سارا شہر سر پہ اُٹھا لیتی ہے کہ مر دوے ہاتھ ٹوٹے ہیں۔

دیگچہ کھڑکے تو اُسے برتنوں کی چھاجت (حفاظت) کی فکر پڑ جاتی ہے۔ اور جو سالن میں نمک مرچ بھرا اور پتلے ہو جاوے تو ہیٹ اُٹھا کہ ٹخ ٹخ فرش پر دے مارے ہے۔ سچ جانو کتنے ہی بھانڈے توڑ چکی ہے۔ بڑی بڑی کھبصورت پلیٹیں فرش پر دے ماریں۔ اور ساتھ میں مجھے ہر وقت کہے تو نیچ ذات ہے۔ دِل میں تو آئے کہ جواب کڑا کے کا دوں۔ پر ہے بھی تو پوری دیو۔ میں تو ڈروں کسی روز گھونسا مار بیٹھے گی تو دس روز پٹی میں گزریں گے۔" اور وُہ گھنٹوں بیٹھے مالکن میں کیڑے ڈالتے رہتے۔

خانساماں جھوٹے برتن سمیٹ رہا تھا۔ "ارے خانساماں۔ اِدھر تو مرحرامی۔" مالکن کی للکار فضا کو چیر گئی۔ قمیص، قمیص؟ خانساماں کی نظریں اُوپر نیچے، دائیں بائیں قمیص ڈھونڈنے لگیں۔ تاک پر۔ چوکی کے نیچے۔ دسترخوان میں۔

"ارے آئے گا بھی یا نہیں۔" مالکن جھنجھلا کر بولی اور وُہ قمیص کے بغیر ہی لپکا۔ مالکن آرام کرسی پر آدھی لیٹی تھی۔ وُہ پیچھے کی طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔

"نامراد کیوں مارنے پر تُلا ہے تو سب کو۔ پتہ نہیں کُتوں کا گوشت لے آتا ہے۔ جب سے کھایا ہے پیٹ میں ہٹیں اُٹھ رہی ہیں۔ حرامی کب عقل آئے گی تجھے۔ ہمیں کنجر سمجھا ہے جو شرابوں سے اسے ہضم کریں گے۔ یہ کنجر پن اپنے باپ کے گھر جا کر کرنا۔" وہ برس پڑی۔

"بی بی مجھے تو چھٹی دے دو۔" وُہ بلبلا اُٹھا "میں خود بڑا دکھی ہوں یہاں۔ ایسی نوکری سے فاقے بھلے۔"

سعیدہ ایک دم بھوکی شیرنی کی طرح پلٹی۔ جیسے نوچ ڈالے گی اس کو۔۔۔۔۔ لیکن جیسے ہی اس کی نظر خانساماں پر پڑی۔ الفاظ اس کے منہ میں اٹکے رہ گئے۔ وُہ سامنے کھڑا تھا۔ ایک نیکر پہنے ہوئے۔ لحیم و شحیم۔ چوڑی چھاتی۔ اُبھرا ہوا بالوں بھرا سینہ۔ جس میں پسینے کے چمکتے ہوئے موتی۔ گول گول شانے۔ بھرے بھرے بازو۔ مضبوط کلائیاں۔۔۔۔۔۔ وُہ بُت بنی رہ گئی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے خاوند کا

جسم اس کے ذہن میں اُبھرا۔ اور پھر ان بھرے بھرے بازؤوں کے پیچھے گم ہوگیا۔
اس کا ذہن ماؤف سا ہوگیا۔ نامعلوم کیسے ایک ہلکی سی آواز اس کے مُنہ سے نکلی :
"اِس مہینے میں دو دن باقی ہیں۔ بیگم کو تمھارا احساب کر دیں گے۔" اور خانساماں
دِل ہی دِل میں نجات ملنے کی اُمید پر خوش ہوتا چلا گیا۔

سعیدہ پھر کُرسی میں لیٹ گئی اور کافی دیر تک بے حِس و حرکت پڑی رہی،
پھر اُٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ اور پردہ ہٹا کر خلا کی وسعتوں میں خالی خولی نظروں
سے گھورتی رہی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اُکتا کر اس نے محض شغلاً کلائی کی گھڑی سے
وقت دیکھا۔ اور ویکلی کا تازہ پرچہ میز سے اُٹھا کر مسہری میں نیم دراز ہو کر تصویریں
دیکھنے لگی۔ کلاک نے ٹن ٹن بجایا۔ وہ چونکی۔ اُسے ویکلی سامنے رکھے ایک گھنٹہ سے
زائد گزر چکا تھا لیکن وہ اتنی دیر ایک ہی صفحہ سامنے رکھے بیٹھی رہی تھی۔ اِس احساس
سے کھسیانی سی ہو کر اس نے ویکلی کو پٹخ دیا۔ بے کاری سے تنگ آنے کے انداز میں
ایک آدھا انگڑائی لی۔ اور شیشے کا ڈبہ کھول کر وہ سویٹر نکالا جو وہ بُن رہی تھی۔ اور
سلائیاں درست کر کے اسے مکمّل کرنے لگی۔ کافی دیر بُننے کے بعد جب اُس نے سویٹر
دیکھا تو سارا نمونہ گڈمڈ ہو گیا تھا۔ تنگ آ کر اُس نے سویٹر پٹخ دیا اور کرسی میں نیم دراز
ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن وہ جلد ہی اُکتا گئی۔ دو ایک دفعہ ہاتھ اُٹھا کر کلائی سے
وقت دیکھا۔ گو اس کی نظروں نے گھڑی کو دیکھا مگر دماغ نے ہندسے پڑھنے کی کوشش
نہ کی۔ پھر محض شغلِ بے کاری کے طور پر اُس نے ریڈیو کا سوئچ کھول دیا۔ کوئی مرد بھاری
آواز میں پکّا گانا گا رہا تھا۔ وہ عام طور پر پکّے گانے نہیں سُنتی تھی۔ لیکن آج اُسے
یہ گانا بھلا سا لگا۔ اور وہ بٹن پر ہاتھ رکھے سُننے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ماما کا چہرہ دروازے
میں جھانکنے لگا۔ وہ سخت حیران ہو کر مالکن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سعیدہ محویت سے
چونکی تو اُسے احساس ہوا کہ اس نے ریڈیو پوری آواز پر کھولا ہوا تھا۔ اور اس کے
شور سے ساری کوٹھی گونج رہی تھی۔ جھنجھلا کر اُس نے ریڈیو بند کر دیا۔ اور باہر لان میں

جا کر آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔

شام کو سعیدہ کا خاوند گھر آیا تو وہ بستر میں سو چکی تھی اور ملازمہ نے بتایا کہ اُس کی طبیعت اچھی نہیں۔

دُوسرے دن وہ اپنی خوابگاہ سے باہر نہ نکلی۔ اس کا خاوند کام پر چلا گیا —— تھوڑی دیر بعد جب خانساماں اس سے کھانے کے متعلق ہدایات لینے گیا تو سعیدہ نے اُسے اندر بُلا لیا۔ چند لمحے بعد بجائے اس کے کہ خانساماں باہر آتا دروازہ اندر سے بند ہو گیا ——

کافی دیر بعد جب خانساماں چھاتی پھلائے مسکراتا ہُوا اندر سے نکلا تو سعیدہ کے آبا کا خاندانی وقار اس کے قدموں تلے چیخ رہا تھا۔

(۱۹۵۸ء)

عورت

ایک تو بُوڑھا ـــــ دُوسرے حاجی ـــــ اور وہ بھی گاؤں کا اکلوتا۔
جو ان چھوکروں کی زندگی عذاب میں تھی۔

حاجی صاحب نے حج کیا۔ اللہ نے ان پر رحمت کی ـــــ مگر وہ اس حج کو اس بُری طرح چپکے، جیسے رحمت سے ایک نقطہ چپک کر اُسے زحمت بنا دیتا ہے۔
صُبح شام مکّے مدینے کا ذِکر کرتے۔ اس گھڑی کو کوستے جب وہاں سے چلے تھے۔ اور اُن لوگوں کو کوستے جن کے پاس واپس آتے تھے ـــــ اپنے لیے تو وہ بلاشُبہ رحمت تھے۔ مگر ہمارے چھوٹے سے گروپ کے لیے تو زحمت بن گئے۔

وجہ یہ تھی کہ وہ اصلاح کے مُوڈ میں آ گئے تھے ـــــ اور وُہ بھی بالکل اسلامی روایت کے مُطابق۔ کہ ہر بُوڑھا ساٹھ سال پُورے کرتے ہی ان لڑکوں کی اِصلاح پر

ٹل جاتا ہے۔ جو پندرہ سے پچیس برس کے پھیر میں ہوں۔ ستاروں کا لکھا یوں ہوا کہ حاجی صاحب اِس روایت کی پہلی شرط پوری کرتے تھے (حج اس کے علاوہ تھا) اور ہم لوگ دُوسری۔ چنانچہ جیسے ہی وُہ ہم میں سے کسی کو کسی جگہ کسی بھی انداز میں دیکھ پاتے۔ ڈانٹنا شروع کر دیتے۔ اور اگر کہیں پُورا گروپ نظر آجاتا تو ان کی دانست میں اسلام خطرے میں آجاتا۔

صدیوں سے باطن کا حال اللہ میاں پر چھوڑ کر ہم لوگ ظاہری اصلاحات میں اُلجھے رہتے ہیں۔ چنانچہ حاجی صاحب نے اس اصلاح کا پہلا سبق اسوۂ حسنہ پڑھانا چاہا۔ اصل فلسفے کا تو ہمیں علم نہ تھا۔ مگر جب کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ کر انھوں نے ایک گھنٹہ تک ہم سب کو بزورِ شمشیر دوبارہ مشرف بہ اسلام کرنا چاہا۔ تو ہم سمجھے کہ داڑھی، پٹے دار لمبے بال۔ ڈھیلی ڈھالی پگڑی۔ ٹخنوں سے اُونچی شلوار۔ بغیر کالر کے قمیص اور سُرمے والی آنکھ کا مجموعی نام اسوۂ حسنہ ہے ——— سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں بڑا ہی ڈر لگا۔ جنت تو ناممکن ہو ہی گئی مگر یہ زندگی بھی محال نظر آنے لگی۔ حاجی صاحب نے پہلے تو لیکچر جھاڑا۔ پھر ہم سے سچے مُسلمان بن جانے کا عہد لیا۔ (جو ہم نے تمام مُسلمانوں کی طرح یہ سوچتے ہُوئے فوراً دے دیا کہ خالی عہد دینے میں کیا حرج ہے) اُسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کے لیے ایک ہفتہ کی مہلت دی اور نماز قضا ہونے کا شکوہ کرتے چلے گئے۔

کامے نے ایک چپٹی سی چپت شفیع کے ننگے منڈے ہُوئے سر پر جمائی۔ اور بولا:

"مومنو! رکھو سر پر پٹے۔"

پھجے نے بھی آگے بڑھ کر شفیع کے سر پر چمکتی ہُوئی کالی جلد کو چُوما۔ اور پھر سینے سے لگا کر ایسے آہ و فغاں کرنے لگا جیسے کوئی جوان موت ہو گئی ہو۔

مگر شفیع نے اس کے پیٹ میں گدگدی کی۔ اور پھجا کھلکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔

کامے نے ہنستے ہُوئے پھجے کو دبوچ لیا۔ اس کے کندھے پر سوار ہُوا اور

بازو ہوا میں لہرا کر پکارا۔ "حاجی مومن !!"

"مُردہ باد۔" سب نے پھیپھڑے کھول کر نعرہ لگایا۔

پھر ہم سب کنوئیں کے پیپل کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ گئے اور حاجی صاحب کا نام لے لے کر بڑی بڑی پھڑکدار گالیاں تصنیف کیں۔

حاجی صاحب سے ہمیں شکایت یہ تھی کہ انھوں نے ہمیں اُن چیزوں سے منع کیا تھا جو ان دنوں ہمارے خاص شوق تھے۔ ہم چاروں پانچوں اُس دور میں تھے جہاں کسی کی مسیں بھوٹ رہی تھیں۔ کوئی بازوؤں کے پٹھوں کو گنبد بنانے پر تُلا تھا۔ کوئی پھوٹتی سرسوں دیکھ کر شام کے دُھندلکے میں بے اختیار ماہیا الاپنے لگتا ——— ہم جیبوں میں کنگھیاں رکھتے۔ حجام کا شیشہ ہو۔ ریت سے مانجھی ہوئی گاگر ہو یا ساکن تالاب۔ ہر چمکیلی چیز میں اپنا چہرہ دیکھنے کو دل چاہتا کہ اپنے مُتے نتے انگریزی طرز کے بال ماتھے پر سنواریں۔ سوائے شفیع کے جو سر پہ اُسترا پھروا کر گھنٹوں آم کی گٹھلی رگڑا کرتا۔ اور پھر ہلکا پھلکا سا اُڑتا ہوا چلنے لگتا ——— دھوتی تو ہم ہمیشہ سے باندھتے تھے۔ مگر اب چلتے چلتے جسم گھما کر پیچھے دیکھتے کہ نچلا کنارا ایڑی سے چھوتا ہے۔ یا نہیں ——— گلے میں لال ٹپکے باندھتے اور گریبان کے اوپر والے بٹن کھلے رہتے ——— پھر جب سب مل کر کھلے کھیتوں میں ماہیا گاتے تو اُفق کے پھیلاؤ میں پریاں سرگوشیاں کرتی معلوم ہوتیں۔

پھجا حاجی صاحب پر بہت خفا تھا۔ وُہ سب سے کم عمر تھا۔ اور اُس کے چہرے پر ابھی مہاسے نہیں نکلنے شروع ہوتے تھے۔ بلکہ نرم نرم ریشمیں بال کان کے پاس قلموں سے نیچے کو پھیلتے پھیلتے رُخساروں پر ہلکی ہلکی سنہری لیپ رہے تھے۔ اور اُوپر والے ہونٹ پر تھوڑا تھوڑا دھواں جما نظر آتا تھا۔ اس کی آواز پھٹ رہی تھی۔ وُہ چوتھے پانچویں روز شریف حجام کی دُکان پر جاتا۔ پانی میں انگلیاں تر کر کے چہرے پر رگڑتا رہتا۔ پھر جب شریف اُسترا لگا کر نرم بال بلائی کی طرح اُتارتا۔ تو پھجا سرور سے آنکھیں

بند کر لیتا۔ اور سارا دن گھومتے پھرتے رُخساروں اور ٹھوڑی پر اپنا ہاتھ چلاتا رہتا۔ مگر اب کے جو شریف حجام کی دکان پر اُس نے اپنے چکنے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ تو اُنگلیاں دباتے ہُوئے اُس نے بے اختیار حاجی صاحب کو گالی دے دی۔ اور بولا۔

"اِتنے سالوں کے اِنتظار کے بعد تو یہ وقت آیا ہے کہ یہ مزے لیں۔ اور یہ کہتا ہے کہ داڑھی رکھ لو۔"

مُہلت کا ہفتہ گزُر گیا۔ اور باقی کتنے ہفتے ہم نے ایسے گزار دِیے کہ جہاں حاجی صاحب نظر آئے۔ ہم لپک کر ساتھ والی گلی کی بغل میں۔ گلی نہ ہُوئی تو اُچک کر قریب ترین درخت پر۔ اور وُہ بھی نہ ہُوا۔ تو جو بھی دروازہ ملا۔ اُس میں ایسے گھُسے جیسے گولا باری میں سپاہی خندقوں میں جاتے ہیں۔ جان بھی بچ جاتی۔ اور کسی ماسی کو سلام کرنے کا ثواب بھی مِل جاتا۔ چند ہی دنوں میں ہم نے یہ ثواب اِتنا کمایا کہ حاجی صاحب ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ کا ثواب غیر ضرُوری سمجھنے لگے۔

اب ہمارے گروپ اور حاجی صاحب کے درمیان باقاعدہ سرد جنگ کا آغاز ہو چُکا تھا۔ جنگ کا صحیح اندازہ ہونے کے لیے طرفین کے کوائف سے واقفیت بھی لازمی ہے۔ اِس لیے اپنے تعارف کے طور پر عرض کر دوں کہ ہمارا چار پانچ افراد کا گروپ گاؤں کے بگڑے ہُوئے لونڈوں کی روایت آگے چلانے والا تھا۔ پھجے نے پانچویں جماعت میں سال کے شرُوع میں سکول سے بھاگنا شرُوع کیا تھا اور سال کے آخر تک پُورا بھاگ چُکا تھا۔ اس وقت سے آج تک زندگی کے مطالعے میں مصروف ہے ـــــــ میں اور کاما آٹھویں میں فیل ہونے کے بعد اس کے ساتھ شامل ہو گئے تھے ـــــــ اور شفیع کو اکھاڑے کی گیلی مٹی ایسی بھائی کہ دُنیا کے باقی کام دھرے رہ گئے۔ ہم کھیتوں میں واجبی سا کام کرتے۔ یا کبھی مویشیوں کے لیے پٹھے لے آتے۔ باقی وقت اکٹھے گھُومتے رہتے۔ کبھی کنوئیں کے پیپل کی چھاؤں تلے۔ کبھی پیر چنے شاہ کے مزار پر سائیں کے پاس۔ کبھی یونین کونسل کے دفتر

ہیں۔ اور کبھی لوگوں کے گڈوں میں گھومتے رہتے۔ ہمارے گروپ کا لیڈر شفیع تھا۔ ایک تو عمر میں بڑا ہونے کی وجہ سے اور دوسرے زراعت کے انسپکٹر صاحب سے واقفیت کی وجہ سے بھی۔ کیونکہ ان کے گھر ریکارڈ بجانے والی مشین تھی۔ اور ہم سب وہاں جا کر گانے سنا کرتے تھے۔ یہ پروگرام شفیع کی دستگیری کے بغیر نہ چل سکتا تھا۔

گاؤں کی رائے عامہ نے ابھی ہمیں لاعلاج نہیں مانا تھا۔ مگر ہمارا ذکر کرتے وقت اللہ کی مرضی اور والدین کے بُرے مقدر والے فلسفہ کا حوالہ ضرور دیا جاتا۔ حالانکہ کسی معترض کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا کہ اپنے والدین کی عمر کو پہنچنے پر ہم ان سے بہتر نہ ہوں گے ——— مستقبل کا حال کسے معلوم ——— بس اس ایک نقطہ پر ہمارا گاؤں کے بزرگوں سے اختلاف تھا۔ باقی تو کوئی خاص بات نہ تھی۔

حاجی صاحب سے سرد جنگ ٹھن گئی۔ تو وہ ہر وقت ہمیں سدھارنے اور اس طرح اپنی عاقبت سنوارنے کی فکر میں تھے۔ مگر ہمیں اُن سے اتنی چڑ ہو گئی تھی کہ ہم ان کو جنت بھجوانے میں کوئی مدد نہ دینا چاہتے تھے۔ چاہے اس عدم تعاون کی سزا میں ہمیں خود جہنم آباد کرنا پڑے۔ مقابلہ کڑا تھا۔ چند دن اپنے اپنے انداز میں زور آزمائی ہوئی اور جب حاجی صاحب نے تنگ آ کر اسوۂ حسنہ کی پیشکش واپس لے لی تو ہم پہلا راؤنڈ جیت گئے۔

مگر دوسرے راؤنڈ میں اُن کا حملہ ایسا سخت تھا کہ ہم مات کھا گئے۔ انھوں نے ڈاکٹروں والی ترکیب کی کہ چند جراثیم مارنے کے لیے سارے پانی میں ہی لال دوائی ڈال دو۔ چنانچہ جو لال دوائی اُنھوں نے تجویز کی۔ وہ یہ تھی کہ گاؤں کے سب لڑکوں کو مولوی صاحب قرأت سکھایا کریں۔

"بھئی دیکھو نا!" حاجی صاحب بڑی فخریہ سی عاجزی سے کہتے "اگر ہم لوگ کلام اللہ کا تلفظ ہی درست کر لیں۔ تو چاہے اور کچھ بھی نہ کریں۔ جنت کے حق دار ہو جائیں گے۔"

پھر وہ اس موضوع پر کتنی حدیثیں سُنا ڈالتے۔ اور ہم حیران ہوتے رہتے کہ حج پر جانے سے پہلے تو ان کو ایک حدیث بھی نہ آتی تھی۔ اور نا معلوم اب زندگی کے ہر مسئلے پر فرداً فرداً سینکڑوں حدیثیں کہاں سے سیکھ لیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ حج پر جاکر دُوسرے بڑے امتحانوں کی طرح لوگ حدیثوں کا بھی امتحان دیتے ہیں۔ اور حاجی صاحب کی بڑی کاریگری ہے کہ دو تین ماہ کے عرصہ میں اتنا لمبا اور مشکل کورس نہ صرف پاس کر آتے ہیں بلکہ ابھی تک کروڑوں حدیثیں زبانی یاد ہیں۔

بہرحال ہوا یُوں کہ کچھ عرصہ بعد گاؤں میں باقاعدہ سکول چالو ہو گیا۔ جہاں صبح کے وقت مولوی صاحب لڑکوں کو باقاعدہ قرأت سکھایا کرتے تھے۔ حاجی صاحب خود بھی وہاں آتے۔ ان کے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی ہوتی۔ جو لڑکا "ق" اور "ح" کو حلق سے ادا نہ کر سکتا۔ وہ اُسے مارتے۔ اس کے علاوہ انھوں نے گاؤں میں جبری بھرتی کی ایک تحریک شروع کی۔ جس میں لڑکوں کی بجائے اُن کے باپ پکڑے۔ جن کے دیہاتی جوتے کے بے دریغ استعمال نے بچّوں کو سکول کا راستہ دکھا دیا۔ گاؤں کی فضا میں یہ لال دوائی اتنی مؤثر ثابت ہوئی کہ ہمارے کھلنڈرے پن کے جراثیم بھی مر گئے۔ اور ہم سب سوائے پھجے کے سکول میں جاکر باقاعدہ قرأت سیکھنے لگے۔

پھجّا البتہ بڑا ٹنگڑا باغی نکلا۔ اور اس پر سب حربے بے سُود ثابت ہوئے۔ باپ نے جوتے مارے۔ حاجی صاحب نے حدیثوں سے مارا۔ گاؤں کے لڑکوں سے پٹائی کروائی۔ ہم عمر بچّوں سے سوشل بائیکاٹ کروایا۔ ماں کو اسلام کا واسطہ دے کر دو دو وقت بھوکا رکھا۔ دُکانداروں سے کہا کہ اُسے کوئی مٹھائی نہ دیں۔ مگر پھجّا ہر ایک کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا۔ اور حاجی صاحب کی ذاتی شان ان کے عقائد اور نصیحتوں کے متعلق ایسی ایسی باتیں کُھلے بندوں کہہ دیتا کہ سب لوگ اسے کافر کہنے لگے۔ اور اگر میں وُہ سب باتیں اِس تحریر میں بتا دوں تو لوگ مجھے بھی سنگسار کر دیں گے۔ آپ جانتے ہیں۔ مُسلمان لوگ عملی طور پر اُٹھتے بیٹھتے اسلام کے احکام کی خلاف ورزی کرتے رہتے

ہیں۔ لیکن اگر کوئی زبان سے اسلام کو بُرا کہے تو اسے قتل کرنے پر تُل جاتے ہیں ____
اِس لیے میں بھلا پھجے کی کہی ہوئی باتوں پر کیوں قتل ہو جاؤں۔ بس آپ سمجھ جائیں کہ اُس نے کیا کہا ہوگا۔ کیونکہ اُسے بڑی غلیظ گالیاں دینے کی عادت تھی۔

پھجّا اب بھی ہمارے گروپ میں باقاعدہ شامل تھا۔ ہم کنوئیں پر اکٹھے نہاتے۔ شفیع کے ساتھ اکھاڑے پر اکٹھے جاتے۔ شریف حجام کی دُکان پر پھجّا جب بھی چہرے پر استرا لگوانے جاتا ہم ساتھ ہوتے۔ مگر جب ہم قرآت کے سبق کے لیے جاتے تو وہ ہمارا ساتھی نہ بنتا۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ہم مکتب کو چلے۔ تو وُہ بھی ہنستا ہوا ساتھ ہو لیا۔ مگر جیسے ہی اس گلی میں پہنچتے وُہ بگٹٹ بھاگ جاتا۔ ایک دفعہ ہم نے مذاق میں اُسے پکڑلیا کہ زبردستی مکتب لے جائیں گے۔ مگر اس نے سچ مچ غصّہ میں آکر ہم سے اِتنی لڑائی کی کہ میرا کان چھل گیا۔ شفیع جیسے پہلوان کے گھٹنے پر چوٹ آگئی۔ کامے کی اُنگلی کا ناخن ٹوٹ گیا۔ اور خود پھجے کو کئی خراشیں آئیں۔ اس کے بعد ہم اُسے وہاں تو نہیں لے گئے۔ مگر وُہ کئی دن ناراض رہا۔ اور بعد ازاں مکتب کے وقت سے پہلے ہمارے قریب نہ پھٹکتا۔

پھجےّ کا باپ اس کی وجہ سے بہت تنگ تھا۔ گاؤں کے سارے لوگ اُس پر اعتراضات کرتے کہ وُہ اپنے گھر میں اللہ اور رسولؐ کا نام نہیں چلا سکتا۔ اور بیٹے کے لچھنوں کی وجہ سے اسلام کی توہین کر رہا ہے۔ پھجےّ کا باپ اِس وجہ سے بھی شرمندہ ہوتا کہ بات کرنے والے اپنے بیٹے کے قرآت سیکھنے کا ذِکر اس فخریہ انداز میں کرتے گویا ان کے پاس مومن ہونے کا سرٹیفکیٹ ہے۔ ایک دن ایسے ہی کسی آدمی کی بات سے چڑ کر اُس نے پھجےّ کو بازار میں پکڑ کر اتنا مارا تھا کہ اُس کے جسم پر نیل پڑ گئے۔ حاجی صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ دُوسرے لوگ پھجےّ کو بچاتے تھے۔ مگر حاجی صاحب ان کو روکتے اور کہتے "نفس کی اصلاح کے لیے ہر قسم کی سختی جائز ہے۔"
ہم اپنے کندھوں پر پھجے کو اٹھا کر گھر لے گئے۔ تو اس کی ماں نے رو رو کر پُرانے

لحاف سے رُوئی نکالی اور اس پر ہلدی اور میٹھا تیل لگا کر پھجّے کی چوٹوں پر جمایا۔ اور ساتھ حاجی صاحب کو بُرا بھلا کہتی گئی۔ پٹی باندھنے میں ایک دفعہ اس کا ہاتھ سخت پڑا تو پھجّا چلّایا۔

"اے ماں۔ میں مر گیا۔"

تو ماں نے جھنجھلا کر ایک دو ہتڑ اس کے سر پر مارا اور چیخ کر بولی "مرتا بھی تو نہیں ــــ تجھے موت لے ــــ کیوں نہیں مولوی صاحب کے پاس جا کر پڑھتا تو؟؟"

مولوی اور پڑھنے کا نام سُن کر پھجّے کی سِسکیاں غائب ہو گئیں۔ اور وہ ایسے غزور سے بیٹھ گیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اور اسے اس مار پیٹ کی کوئی پرواہ نہیں ــــ اور ہوا بھی یہی ــــ چوٹیں ٹھیک ہونے پر پھجّا کھیتوں میں کلیلیں بھرتا رہا۔ مگر قرأت پڑھنے نہیں گیا۔

ایک دن مکتب میں ہمیں حاجی صاحب نے بتایا کہ انھوں نے ایک اور حاجی دوست سے جو شہر میں رہتا ہے۔ کچھ ریکارڈ لیے ہیں۔ یہ ریکارڈ عرب شریف سے آئے تھے۔ اور اُن میں عرب کے بڑے بڑے علماء کی تلاوت بھری تھی۔ اس شام مغرب کی نماز کے بعد انسپکٹر زراعت صاحب کے ہاں مشین پر بجائے جائیں گے۔

ہم نے شرارت یہ کی کہ پھجّے سے جا کر یہ کہا کہ آج شام انسپکٹر صاحب کے گھر مشین پر ریکارڈ بجائے جائیں گے۔ جس میں ہیر وارث شاہ۔ عبدالستار کی یوسف زلیخا اور بھنگڑے کے گیت ہوں گے۔

پھجّے نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اور مُسکراتا ہوا سر جھٹک کر بولا "ضرور چلیں گے بادشاہو ہم بھی۔"

شام کو انسپکٹر صاحب کے گھر کے سامنے کھلی گلی میں چھڑکاؤ ہوا۔ نرم نرم گیلی مٹی کی سوندھی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ پھر ایک دری بچھائی گئی۔ جو ہم لڑکوں کے لیے تھی۔ دری کے ایک کنارے پر دو تین چارپائیاں بچھائی گئی تھیں۔ جن میں سب سے پہلی پر

کھیس بچھا تھا۔ دری کے دُوسرے کنارے پر چند کُرسیاں رکھی گئیں۔ جن میں کسی کی ٹیک اور کسی کی سیٹ لکڑی کی تھی۔ کسی کا بازو ٹوٹا ہوا تھا۔ اور کسی کی سُرخ ٹانگ میں سفید دیار کا جوڑ لگا تھا۔ ایک کُرسی پر میلی سی گدی بچھی تھی ——— یہ حاجی صاحب کے لیے تھی۔

یہ سارا کام مکتب کے بچّوں نے کیا۔ اور پھجے نے بڑی گرمجوشی سے حصّہ لیا کیونکہ اُسے کسی نے نہیں بتایا تھا کہ ریکارڈ کس قسم کے ہیں۔ اور وُہ سمجھتا رہا کہ وُہ ہیر وارث شاہ سُنے گا۔

شام کو جب سب لوگ آکر بیٹھ گئے اور حقّے گڑگڑانے لگے تو انسپکٹر صاحب نے باجا کھولا۔ سبز رنگ کے گول چکر کو برش سے صاف کیا۔ اس پر ریکارڈ جمایا۔ اس کو صاف کیا۔ باجے میں چابی بھری۔ جب سوئیوں کی ڈبیا کھولنے لگے تو ہم پھجّے کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

اِنسپکٹر صاحب نے سُوئی گھُومتے ہُوئے توے پر رکھی۔ تو ایک لمبی سرسراہٹ اُبھری۔ اور پھر یا پایاب ندّی کے پھسلتے ہُوئے پانی کی سی نرمی کے ساتھ قاری کی آواز فضا میں لہرائی۔

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم

وقفہ پڑا تو حاجی صاحب جھُوم کر بولے:

"سُبحان اللہ!!"

قرأت جاری رہی۔ تو پھجّے نے حیرت سے ہم لوگوں کو دیکھا۔ ہم سب سر نیچے ڈال کر اُبلتی ہُوئی ہنسی کو دبانے کے لیے ہلکورے لینے لگے۔ پھجّا ہماری ہنسی سے سب کچھ سمجھ گیا۔ ایک موٹی سی گالی اُگلتے ہُوئے اُس نے اُٹھنا چاہا۔ مگر ہم سب تیار تھے۔ اور اُسے وہیں جکڑ لیا۔ وُہ ہمیں گالیاں دیتا ہُوا چھُڑانے کی کوشش کرتا رہا۔ اور ہم اپنے چہرے گھُٹنوں میں دبائے اس کو روکے رہے۔

"اَبے ادب سے بیٹھو ملعونو۔" حاجی صاحب گرجے۔

"کون ہے شور کرنے والا؟" مولوی صاحب تلاوت والے ماحول میں ڈانٹنے کا حق اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔

ہم سب دبک گئے۔ مگر چچے پر گرفت ڈھیلی نہ کی۔ اور وہ کچھ دیر بعد ٹھنڈا ہو کر بیٹھ گیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد زیرِ لب ہم سب کو باری باری گالیاں دیتا رہا۔

چند ریکارڈوں کے بعد انسپکٹر صاحب نے نیا ریکارڈ لگایا تو سب چونک اُٹھے ــــــ اس دفعہ مرد کی بجائے عورت کی آواز تھی۔ اور وہ بڑی خوش الحانی سے تلاوت کر رہی تھی۔ اِنسپکٹر صاحب گتّے کے ڈبے میں پڑے ہُوئے ریکارڈ اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ اور پھر ڈبّہ بند کرتے ہُوئے بولے:

"باقی سبھی ریکارڈ اسی عورت کے ہیں۔"

اگلا ریکارڈ لگایا تو مولوی صاحب بولے "سبحان اللہ۔ یہ تو سُورۂ رحمٰن ہے۔"

انسپکٹر صاحب نے کہا کہ یہ سورہ تین چار ریکارڈوں پر مسلسل ہے۔

"پھر تو مزے آجائیں گے۔" حاجی صاحب کرسی میں پہلو بدلتے ہُوئے بولے "ایک کے بعد دُوسرا لگاتے جاؤ جی!!"

اور پھر واقعی مزے آ گئے ــــــ اس عورت کی آواز بڑی رسیلی تھی۔ تلفّظ میں بہت نکھار تھا۔ اور آواز کا اُتار چڑھاؤ بہت متناسب تھا۔ سُورۂ رحمٰن میں اِس آیت کا تکرار ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝

جب وہ بار بار اِس آیت کو دُہراتی تو بہت بھلی لگتی۔ کافی دیر تک ہم لوگ تلاوت سُنتے رہے۔ اور پھر رات گئے گھروں کو واپس آئے ــــــ راستے میں کئی لڑکے اپنے اپنے مکتب کے سبق بلند آواز میں تلاوت کرنے لگے۔

ہمارا مکتب ہفتے میں دو دن ہوتا تھا۔ اگلے دن باری تھی۔ میں گھر سے دیر میں

نکلا۔ اور راستے میں بیلوں کی لڑائی دیکھنے رُک گیا۔ اس لیے جب وہاں پہنچا تو چھٹی ہو چکی تھی۔ اور مولوی صاحب باہر نکل کر جوتا جھاڑ رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر میں گلی کے کونے میں چھپ گیا اور جب وہ چلے گئے تو میں مکتب کی طرف گیا کہ شاید وہاں شفیع یا کاما موجود ہو۔

مگر وہاں ایک عجیب ماجرا دیکھنے میں آیا

سارا مکتب خالی تھا۔ ایک کونے میں بھتیجا سر پر رومال باندھے دو زانو بیٹھا تھا۔ اور قرآت کا پہلا سبق بلند آواز میں بڑی تندہی سے پڑھ رہا تھا۔

میں حیرت سے کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

بھتیجے نے مجھے دیکھا۔ مگر اپنے سبق میں مصروف رہا۔

میں تھوڑی دیر تک تو تماشہ کرتا رہا۔ پھر قریب جا کر زور سے ایک دھپ اس کی کمر میں لگائی۔

"ارے بھتیجے! اب تجھے تلاوت سے کیا کام؟؟؟"

بھتیجا خاموش رہا۔ مگر جب میں نے ٹھوکا دے کر دوبارہ پوچھا۔ تو اس کی آنکھیں شرمیلے انداز میں میری طرف اٹھیں۔ پھر ہولے ہولے بند ہوگئیں۔ وہ اپنے تازہ منڈے ہوئے رخسار پہ ہتھیلی چلانے لگا۔ اور بڑے ہی سرور بھرے لہجے میں گنگنایا:

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝

(۱۹۶۳ء)

مصروفیت

شیشے میں جھومتا ہوا عکس ایک دم ٹھٹک سا گیا۔ بالوں میں تیرتا ہوا برش پھنس کر رہ گیا۔ بھنویں ناچیں۔ کان پھیلے اور ساتھ ہی کار کی آخری غرّاہٹ چیخ کر ختم ہو گئی۔ پڑوسیوں کے ہاں کار رُکے تو بے تعلقی کیسی۔ ایک پتّہ توڑو تو بھی اِردگرد کی دس ڈالیاں کانپ جاتی ہیں۔ پڑوسن تو پھر جاندار ٹھہری۔ چنانچہ ڈریسنگ ٹیبل دامن پھیلائے دعوتِ استعمال دیتی ہی رہی اور پڑوسن لپک کر برآمدے کی جعفری سے جا چمٹی۔ ویسے بیچ میں ایک ہی سڑک تھی لیکن پڑوسن کے لیے وہ بھی اُفق پار بن گئی۔ ایک تو کم بخت جعفری کے سوراخ ہی تنگ ہیں اور پھر ستم یہ کہ ڈوڈینا کی باڑ کی شاخیں بھی بار بار ہل کر نظارہ روک دیتی ہیں۔ پڑوسن نے دل ہی دل میں مالی کی سات پشتوں پر ہل چلا دیا۔ کم بخت مارے کو جب دیکھو حُقّہ سینے سے چمٹائے پھرتا رہتا ہے۔ اور اِتنا نہیں کر سکتا کہ باڑ کو سلیقے سے ہموار

ہی کر دے تاکہ ٹھیک سے پتہ تو چل جائے کہ کار سے اُترنے والی ادھیڑ عمر عورت نے سلیٹی ساڑھی کے ساتھ جوتی کیسی پہنی ہے۔ اُس نے پُتلیاں گھمائیں۔ دیدے پھاڑنے کنکھیاں آزمائیں۔ آنکھیں چندھیائیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ عورت تو اپنے بوڑھے مُسافر ساتھی کے ساتھ ہمسایوں کے گھر میں چلی گئی۔ لیکن پڑوسن کا ذہن تشویش کی بھول بُھلیوں میں جھٹکے کھانے لگے۔ مہمانوں کی شخصیات۔ ان کا وطن۔ پڑوسیوں سے ان کا رشتہ۔ اور آمد کی غرض و غایت کے متعلق اُس کا دماغ نہ جانے کتنا گہرا غوطہ لگاتا اگر برش بالوں سے پھسلتا ہُوا گردن میں چُبھ کر یاد نہ دلا دیتا کہ پڑوسیوں کے مہمانوں کے علاوہ اور دُنیا بھی بستی ہے۔ چونک کر وُہ دھیرے دھیرے واپس جو آئی تو خوشبو کے بھبکے نے لپک کر اطلاع دی کہ وُہ جلدی میں تیل کی شیشی ہی فرش پر گرا گئی تھی۔

پڑوسی کے مہمان دیکھ کر ہمسائی کے ذہن میں کون؟ اور کیوں؟ کی جو گانٹھیں پڑ گئی تھیں۔ اُنھیں کھولنے میں بھنگن کا لا محدود علم بھی ناکام رہا۔ جمعرات کو دیئے ہُوئے سالن کی رنگت سے گھر کے اخراجات کا اندازہ لگانے والی بھنگن بھی بجز اس کے کچھ نہ بتا سکی کہ پڑوسن کے مہمان اس کی بہو کے والدین ہیں۔ پون گھنٹہ تک اُن کی آمد کی غرض و غایت کے بارہ میں باتیں ہوتی رہیں۔ ماضی کے تہ خانوں میں دیوانہ وار چکّر لگائے گئے۔ ذہن کے ہر کونے کو کھنگالا گیا۔ ہمسایہ خاندان کے متعلق گزشتہ کئی ماہ کے مشاہدات کو از سرِ نو اُلٹ پلٹ کر دیکھا گیا۔ ان کی گفتگو میں کبھی کبھار سُنی ہُوئی آوازوں اور فقروں کا تجزیہ کیا گیا۔ لیکن نتیجہ صفر ہی رہا۔

مِثل مشہور ہے کہ جہاں دلیل پھسل جائے تجربہ تھام لیتا ہے۔ چنانچہ پڑوسن کے سفید بالوں نے بالآخر ایک راستہ ڈھونڈ ہی نکالا اور مُلازم لڑکی کو بلا کر پھنستی ہُوئی تیز آواز میں بولی۔

"اری جا کر پڑوسیوں کے ہاں سے ریڈیو کا رسالہ تو مانگ لا۔ کہنا ابھی واپس دے دیں گے۔ ہمارا اخبار والا ابھی لایا نہیں۔"

اور پھر اس کا کندھا پکڑ کر رازدارانہ انداز میں بولی" اور کسی بہانے ٹھہر کر سُننا تو سہی کیا باتیں کر رہے ہیں؟"

بتی رسّی کو کیا باٹنا۔ مُلازمہ پہلے ہی تربیت یافتہ تھی۔ ہدایت دس ملی تھی کام بیس کیا۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد قدم ناپتی واپس آئی اور اپنے مشن کی اہمیت کا پُورا احساس لیے ہر حرف تولتی ہوئی بولی:

"بی بی —— بی بی —— توبہ میری —— وہ عورت تو ہچکیاں لے لے رو رہی ہے۔"

"کون؟؟؟ کون رو رہی ہے؟" ہمسائی کی مُنتظر آنکھیں حیرت سے اُبل پڑیں۔ اِطلاع کا سب سے ضروری حِصہ سُنانے کے بعد ملازمہ ذرا دم لینے کو رُکی تو وُہ برس پڑی" اری مُردار مُنہ سلا آئی ہے۔ بولتی کیوں نہیں۔ کون رو رہی ہے؟"

بھنگن بھی اوڑھنی سمیٹتی جھاڑو کھسکا کر آگے کو سرک آئی۔

"وہ جو آئی ہے —— اور وُہ مرد چُپ چاپ پریشان سا بیٹھا تھا۔"

"پر وُہ باتیں کیا کر رہے تھے؟" بھنگن نے ہمسائی کی طرف دیکھ کر پُوچھا گویا سوال کی منظوری چاہتی ہے۔

"کچھ بھی نہیں بی بی۔ میں تو ڈیوڑھی میں رُکی بھی۔ لیکن ان میں سے کوئی نہیں بولا۔ بس میں نے رسالہ مانگا اور بُوا نسیمہ اندر جا کر اُٹھا لائی۔"

پڑوسن کا چہرہ لٹک گیا۔ نگوڑی ڈبکی بھی لگائی تو دلدل میں۔ پھر بھی اطلاع غیر مفید نہ تھی۔ نسوانی دماغ تو رائی کے دانے میں دُنیا دیکھ لیتا ہے۔ پڑوسن کیسے چوکتی۔

"کوئی جھگڑا ہو گیا ہو گا؟" اس نے قیاس لگایا۔

بھنگن کا سر پہلے ہی سے تیار تھا۔ جھٹ سے ہل کر تائید کر گیا۔

اس بُنیادی فیصلے پر پہنچنے کے بعد باقاعدہ تفتیش شروع ہوئی اور مُخبر سے حاضرین کے چہروں کی رنگت اور حرکات و سکنات سے لے کر کمرے میں چیزوں کی ترتیب تک کے

بارہ میں مفصّل جرح کی گئی۔ لیکن کوئی ایسا سنگِ میل نظر نہ آیا جو اس بنیادی فیصلے سے آگے لے جا سکتا۔ یہ تفتیش نہ جانے کب تک جاری رہتی اگر بھنگن کو جھاڑو کی اچانک کھنک سے یاد نہ آجاتا کہ جس گھر میں وہ تین ناغے کر چکی ہے۔ وہاں پہنچنا آج بہت ضروری تھا۔ ورنہ گھر چھوٹا ہی سمجھو۔

اس کے فرض شناسانہ فرار کے بعد پڑوسن نے جلد جلد ایک دھلی ہوئی چادر کو پانی میں شرابور کیا اور سیڑھی بہ سیڑھی پھدکتی چھت پر جا پہنچی۔ پڑوسی کی منڈیر کے پاس کھڑے ہو کر چادر کو نچوڑا اور سوکھنے کے لیے پھیلانے لگی۔ اب اگر اس طرف کا کونہ ذرا سا درست کرنے میں چادر پڑوسیوں کے کوٹھے کی طرف گرنے لگے اور اسے روکنے کے لیے پڑوسن کے نصف سے زیادہ جسم کو اِدھر جھانکنا پڑے تو اس میں اس کا کیا قصور۔ اپنی گائے کو کون نہیں سنبھالتا۔ اور پھر کام کرتے آنکھیں تو بند ہو نہیں جاتیں۔ کولھو کا بیل بھی دائیں بائیں دیکھ ہی لیتا ہے۔ چنانچہ ہمسائی نے چادر کو پھیلانے اور پھر صحیح طور پر جمانے میں جو ایک گھنٹہ صرف کیا۔ اس میں پڑوسیوں کے مکان کا حتی الامکان جائزہ لے ڈالا۔ ویسے بھی نسوانی دستور العمل کے مطابق کام کے دوران میں اِرد گرد نگاہ دوڑانا ہرگز قابلِ اعتراض نہیں۔ نظر کوئی کُتا بلّی تو ہے نہیں کہ گلے میں پٹہ ڈال کر روک لو۔ جدھر چاہتی دوڑ جاتی ہے۔ جتنی دُور چاہتی ہے دیکھ لیتی ہے۔ فاصلے کی مار تو کان کھاتے ہیں۔ جنھیں پڑوسن نے سزا دیے پر جمایا لیکن پڑوسیوں کی باتیں سمجھ میں نہ آسکیں لیکن بہو کا سامنے والے کمرے میں دیوار کی طرف منہ کیے لیٹا ہونا۔ بہو کی والدہ کا صحن میں بیٹھے ہوئے رو رو کر باتیں کرنا اور بہو کے والد کا پریشانی سے صحن میں چکّر لگانا۔ ایسی واضح نشانیاں تھیں۔ جن کی خاموش فصاحت نسوانی سمجھ کے لیے الفاظ سے کہیں زیادہ گراں قدر ہے۔ اسی خاموش فصاحت کے زیرِ اثر پڑوسن نے ذہن میں جو ٹوٹے پھوٹے اندازے لگائے تھے۔ وہ ایک دم مربوط شکل اختیار کر گئے۔ جب ہوا کے ایک جھونکے نے اس کے کانوں میں بہو کی والدہ کے ہچکیوں میں پروتے ہوئے الفاظ پہنچائے کہ:

"میں نے تو اپنی لڑکی کو ہیروں کی طرح پالا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ہائے اللہ میری سب سے لاڈلی کا یہ حشر۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اپنے دُھوپ زدہ چہرے سے پسینہ پُونچھتی جب پڑوسن نیچے اُتری تو اس کے دماغ کے اس کونے میں جو ہمسایوں کے لیے وقف تھا ایک وزن دار کہانی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ جو یقیناً ذہنی بدہضمی کا باعث بنتا اگر وہ اُسے بر وقت اُگلنے کے لیے سہیلی کے گھر نہ پہنچ جاتی جو قریب ہی رہتی تھی۔

"توبہ میری توبہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ کسی کو روگ نہ لگائے۔" داخل ہوتے ہوتے اس نے نہایت موزوں تمہید چھیڑی۔

سہیلی کا ہاتھ استری سمیت منجمد ہو گیا۔" ہائے بہن خیر تو ہے۔ آتے ہی آتے نہ سلام نہ دُعا۔ اور استغفار پڑھنے لگیں ——— میاں جی تو خیر سے ہیں۔"

"اے میاں جی کو کیا ہونا ہے" پڑوسن غیر متعلق موضوع پر جھنجھلا گئی۔ اور کرسی گھسیٹتے ہوئے بولی" لیکن سوچتی ہوں کہ لوگ آج کل کتنے گھنّے ہیں۔ یہ ہمارے سامنے والے راؤ صاحب کے ہاں اتنا بڑا واقعہ ہو گیا لیکن آج تک ہوا بھی باہر نہ نکالی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں کہتی ہوں آج کل کسی کا کیا اعتبار کریں۔"

سہیلی کے چہرے پر حیرت تجسّس اور تشویش اتنی مقدار میں چھڑکے گئے جتنے کہ ایک چہرے پر جگہ پا سکتے ہیں۔

"پر ہُوا کیا؟"

"بُوا مجھے تو عادت ہی نہیں ہے اِدھر اُدھر کنسوہ لینے کی۔ لیکن راؤ صاحب کی بیوی نے بھی تو کبھی ذکر نہیں کیا۔"

"ہائے کچھ بتا بھی چکو۔" سہیلی بھی تو عورت تھی نا۔

پڑوسن بم پھینکنے والے سپاہی کی طرح مُستعد ہو کر دھیمی آواز میں بولی" راؤ صاحب کی بہو کو طلاق مِل رہی ہے۔"

اس ایک فقرے کا اثر بم سے بھی زیادہ ہوا۔ سہیلی کا شرقاً غرباً پھیلا ہوا جسم ایک چٹان کی طرح آگے کو ڈھک آیا۔ سر اور کندھوں والے خطّے میں نہ جانے کہاں سے گردن نمودار ہو گئی تھی جو حیرت اور تجسّس سے اُوپر ہی اُوپر اُٹھ رہی تھی۔ ہلنے میں استری کی تار کو جھٹکا جو لگا تو ایک ننّھا سا شرارہ پلنگ میں ناچا لیکن جہاں بجلی ہو گی۔ شرارے بھی ناچیں گے۔ کون ہر وقت احتیاط کرتا پھرے۔

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" دُوسرا سوال قدرتی طور پر یہی ہونا چاہیے تھا۔

"اے لو بھلا کانوں پر اِعتبار نہ کرتی۔ خُود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بہو کی والدہ رد رو کر سمدھن کی منّت کر رہی تھی کہ میری لاڈلی بچّی کا یہ حشر نہ کرو۔ خود بہو کی حالت ۔ ۔ ۔ دیکھنے کے قابل تھی۔ جس چارپائی پر لیٹی تھی اللہ قسم اس کے نیچے تو یوں سمجھو کہ آنسوؤں سے چھڑکاؤ ہی ہو گیا تھا۔ باپ اِدھر اُدھر بے کُلا سا ٹہل رہا تھا۔ میری مانو تو حق مہر کے بارہ میں سوچتا ہو گا۔ شاید راؤ صاحب نے دینے سے انکار کیا ہو گا۔"

سہیلی کو یقین تو فوراً آ گیا کیونکہ عورتوں میں ایسی بات پر فوراً الیقین نہ کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔ لیکن نِسوانی طرزِ گفتگو میں اندرونی طور پر پختہ یقین عموماً ظاہرہ غیر یقینی کی صورت اِختیار کر لیتا ہے۔

"لیکن جھگڑا کسی اور بات پر بھی ہو سکتا ہے۔"

"لو اور سُنو" پڑوسن کی خُود اعتمادی چوٹ کھا گئی۔ تڑپ کر پہلو بدل بیٹھی "میری نظریں جھوٹی ہوں گی۔ کان نگوڑے چھدے ہوں گے جو غلط دیکھا اور غلط سنا۔ اری بُوا وہاں تو معاملہ چل چلاؤ ہے۔ دیکھ لینا جو شام سے پہلے بہو میکے میں نہ بیٹھی ہو۔ تو میرا سر مُنڈا کر گدھے پر سوار کرا دینا۔ آئے دن تو وہاں جوتم بیزار رہتی ہے۔ ۔ ۔ ۔"

"اچھا!! تو کیا لڑائی بھی رہتی تھی؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم نے پہلے تو کبھی ذکر نہیں کیا۔" نئے انکشاف نے سہیلی کی دلچسپی میں مزید اضافہ کر دیا۔

"اے میں بھلا چوری چوری سُنتی تو نہیں ہوں کہ مجھے علم ہوتا —— نہ بُوا مجھے

تو یہ عادت ہی نہیں۔ لیکن تم ہی انصاف کرو۔ جب نوبت طلاق تک پہنچی ہے تو جھگڑا بھی تو رہتا ہی ہوگا۔ بغیر دھوئیں آگ نہیں جلتی۔"

خالص نسوانی دلیل سہیلی کے خالص نسوانی دماغ میں جاکر فوراً اٹک گئی۔ وہ دل ہی دل میں قائل ہوگئی۔ گو منہ سے کچھ نہ بولی۔

"سچ جانو پچھلی اتوار میں نے ویسے ہی اُوپر سے جھانکا تو ماں بیٹا دالان میں بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور بہو برآمدے کے پرلے کونے میں الگ تھلگ چُپ چاپ بیٹھی تھی۔ اب مجھے ٹوہ لینے کی تو عادت ہی نہیں۔ ہمیں کیا پڑی ہے کہ وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔ پر میرا ماتھا وہیں ٹھنکا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ پورے دو گھنٹے تک تو ویسے ہی بیٹھے رہے۔ بعد کی مجھے خبر نہیں — اور ہاں خوب یاد آیا۔ میں نے اس روز بھی تمہیں بتایا تھا کہ راؤ صاحب اُونچے اُونچے غصّے میں بول رہے تھے۔"

بیٹھی بیٹھی بُو جو ہوا میں آہستہ آہستہ اُبھری تو دونوں نے چونک کر میز کی طرف دیکھا۔ استری نے اپنے اس طرح نظر انداز کیے جانے پر انتقاماً کپڑا جلا دیا تھا۔ دونوں نے پہلے چیخ ماری۔ پھر تار بٹن سے باہر کھینچی اور پھر دو تین چیخیں ماریں۔ اظہارِ افسوس میں کپڑے کی ساری تواریخ دُہرائی گئی اور جب افسوس ختم ہوا تو سہیلی پڑوسن کی بات پر مکمل ایمان لے آئی تھی۔

اس کے بعد دو گھنٹے تک ان دونوں میں جو گفتگو ہوئی۔ اُس میں اس طلاق کی ممکنہ وجوہات سے لے کر اس کے اثرات پر بالتفصیل روشنی ڈالی گئی۔ اور باتوں ہی باتوں میں راؤ صاحب کے لڑکے کی دوبارہ شادی کرنے کی صورت میں پاس پڑوس کی ہر لڑکی کے چُنے جانے کے امکانات کا مفصّل تبصرہ کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ بہو کے والدین کی کمزوری پر بھی اظہارِ افسوس کیا گیا کہ وہ اتنی خاموشی سے طلاق لینے پر راضی ہوگئے۔ اور پھر اس خاموشی کی تہہ میں کتنی ایسی قباحتوں کی موجودگی کے متعلق قیاس آرائی

کی گئی جن کا پتہ لگ جانے کی صورت میں بہو کسی کو شکل دکھانے کے قابل نہ رہتی۔ اور گھر کی عزت خاک میں مل جاتی۔ آخر میں کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر اللہ میاں سے خلوص سے دعا کی گئی کہ وہ ہر مسلمان کو ایسی مصیبتوں سے بچائے اور بعد ازاں مجلس اس ریزولیوشن پر برخاست ہوئی کہ ہمسائی شام کے وقت رائو صاحب کے ہاں جا کر تازہ ترین صورتِ حالات کا پتہ لگائے۔

شام کو جب پڑوسن رائو صاحب کے ہاں پہنچی تو کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے اس نے شاہ رگ پکڑنا چاہی۔ "میں نے کہا بہو کی اماں آئی ہے۔ چل کر خیر سلا ہی پوچھ آؤں۔"

"ویسے تو خیر سلا ہی ہے۔" رائو صاحب کی بیوی بولیں "لیکن اللہ کسی کو ایسا دکھ بھی نہ لگائے۔"

پڑوسن کے دل میں تو لڈو پھوٹ پڑے لیکن بظاہر متوحش بن کر بولی "کیوں خیر ہے؟ کیا ہوا؟"

"ہوتا کیا بہن" بہو کی والدہ یہ کبھی برداشت نہ کر سکتی تھی کہ اس کا دکھ کوئی اور بیان کرے "پلی پلائی جوان بیٹی کو بیٹھے بٹھائے دق ہو گئی۔ ان کی بہو سے دو سال چھوٹی ہے۔ بس ہنستی کھیلتی رہی کبھی وہم بھی نہ تھا (آنکھوں سے آنسو گرنے لگے) کہ اپنی لاڈو کو اپنے ہاتھوں سے مٹی دوں گی۔"

"ہائے بہن اللہ سے خیر مانگو۔ کیوں بری فال منہ سے نکالتی ہو۔ اللہ صحت دے گا۔" پڑوسن نے اپنی مایوسی کے باوجود تسلی دے دی۔

"کیا پتہ بہن۔ اچھی بھلی تھی۔ چھاتی میں درد ہوا۔ میں نے کہا ہوا لگ گئی ہو گی۔ لیکن رات خون کی قے کر دی۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا تیسرے درجے کی دق ہے۔ کل صبح ایک بھیبھڑا دبا دیا ہے۔ کون جانے کیا ہے۔ میں نے کہا۔ سسرال سے اس کو لے آؤں ذرا تیمارداری کرتی رہے گی۔"

پڑوسن نے نہایت فراخدلی سے اس تجویز کو سراہا اور بعد ازاں تین چار ایسے

قصے سُنا ڈالے جن میں کتنی جوان لڑکیوں کو اس قسم کی دِق ہونے کا ذکر تھا اور چند ہی دنوں میں بھلی چنگی ہو گئی تھیں۔

جب موضوع کچھ بدل گیا تو پڑوسن راؤ صاحب کی بیوی کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولی "بہن اچھا ہی ہوا جو مجھے اصل بات کا پتہ چل گیا کہنا تو نہیں چاہیے، دُوسرے کی غیبت اچھی نہیں ہوتی لیکن پتہ نہیں لوگوں کو اُلٹی سیدھی ہانکنے میں کیا مزا ملتا ہے۔"

راؤ صاحب کی بیوی نے کسی متوقع حملے کے پیشِ نظر فوراً اپنے اوسان مجتمع کر لیے اور اصل بات دریافت کی۔

"توبہ میری۔ یقین تو مجھے اس وقت بھی نہ آیا تھا۔ لیکن اب تو خیر بات ہی دُوسری ہے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ خدانخواستہ آپ کا بہو سے کوئی جھگڑا ہو گیا تھا۔ . . . . . اور . . . . ہائے اللہ میں کیسے کہوں . . . . . . بس مطلب یہ تھا کہ . . . . . یوں سمجھو . . . گویا نوبت فیصلہ کرانے تک جا پہنچی ہے۔"

"کون نصیبوں جلی میرے گھر میں آگ لگانے آئی ہے۔ بکرا کہ چوٹی نہ کاٹ دوں مُردار کی . . . ." اس کے بعد دونوں سمدھنوں نے مِل کر اس فرضی دُشمن کے بخیے اُدھیڑ دیے اور پڑوسن اس کوشش میں برابر کی شریک تھی۔ جب آگ ذرا تھمی تو دونوں نے اصرار کیا کہ پڑوسن اس ناشدنی کا نام بتائے جس نے ایسی بے بُنیاد بات کی۔ پڑوسن نے شرافت اور اعتماد کے نام پر لاکھ انکار کیا بالآخر مجبور ہو کر انتہائی دھیمی آواز میں اپنی سہیلی کا نام بتا دیا اور ساتھ ہی بولی "سچ جانو مجھے تو بالکل یقین نہیں آیا میں بھی کہوں نہ تو کبھی آپس میں لڑائی نہ جھگڑا نہ ان بن۔ ساس بہو کا اِتنا سلوک کہ ہم لوگ تعریف کر کر نہ تھکیں۔ بھلا ایسی صُورت کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن وُہ تو مانتی ہی نہ تھی۔"

اور جب راؤ صاحب کی بیوی نے ہاتھ نچا نچا کر اعلان کیا کہ وُہ آج ہی اس مردار سے پُوچھے گی کہ وُہ دُوسروں کے گھروں میں آگ کیوں لگاتی ہے اور اپنے خصموں کو کیوں نہیں روتی۔ تو پڑوسن اُٹھتے اُٹھتے بولی۔

"ضرور پوچھو بُوا۔ میں تو اس کے مُنہ پر بھی کہنے کو تیار ہوں۔ لیکن میری مانو تو میرا نام نہ لینا۔ وہ تو تمھاری بات تھی تو میں نے تمھیں بتا دیا۔ کسی اور کی ہوتی تو میری بلا سے۔ بس تم میرا نام نہ لینا۔ نہیں تو آئندہ تمھاری بات میرے سامنے نہ کرے گی۔ بلکہ اِدھر اُدھر کرتی رہے گی ـــــ کیا فائدہ بدمزگی کا۔ آخر وہ بھی تو ہمسائی ہے۔ مِل جُل کر رہنا ہی پڑتا ہے۔ . . . . . . میں چلوں ـــــ ہائے اللہ صبح سے بال بھی درست نہیں کر سکی ـــــ کیا کروں مصروفیت ہی اِتنی ہوتی ہے۔"

(۱۹۵۲ء)

"مسعود مفتی صاحب کے افسانوں کا مجموعہ "رگِ سنگ" اُردو افسانہ نگاری میں ایک
نیا باب کھولتا ہے۔ اوّل تو ان کی منفرد نظر اور فکر کے مخصوص پہلو کا تعین ان کے
سابقہ مجموعے "محدّب شیشہ" سے ہو چکا ہے۔ وہ زندگی کی اہم قدروں کو ایک مفکّر
کی نظر سے دیکھنے والے اور ان کو افسانہ کی تنگ نائے میں نہایت خوبی سے رکھ
دینے والے مانے جا چکے ہیں اور اسی سلسلے میں وہ اپنی مثال آپ بھی ہیں.....
کچھ افسانے "محدّب شیشہ" کے افسانوں کی طرح دائمی قدروں کی ترجمانی کرتے ہیں
یا ان اصولوں پر جن کو زیادہ تر لوگوں نے اٹل مان لیا ہے تنقید کرتے ہیں.....
انفرادیت کا یہ احساس جو ٹکے بندھے عام اصولوں کے خلاف بغاوت پر
آمادہ کرتا ہے "محدّب شیشہ" کے افسانوں میں بھی بنیادی ہے۔"

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

مصنّف کی تصانیف

قومی ادب

چہرے مشرقی پاکستان کے آخری لمحوں کی داستان۔ آدم جی انعام یافتہ

لمحے ۱۹۷۱ء کے مشرقی پاکستان کے پُرآشوب دنوں کی ڈائری۔ رونگٹے کھڑے کرنے والے واقعات۔

ریزے حقیقت پر مبنی افسانے۔ ۱۹۷۱ء کے حالات اور جنگی قیدیوں کے کیمپوں کی بھرپور عکاسی۔

دیگر ادب

کھلونے (ناولٹ) بیمار معاشرے میں رزم خیر و شر۔

محدب شیشے (افسانے) جابر اقتدار میں فرد کے المیے۔

سرِ راہے مزاحیہ افسانے اور مضامین۔

⊗

رگِ سنگ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے پس منظر میں لکھے ہوئے افسانے۔ چھ تمبر ادبی انعام یافتہ